میں ایک جاسوس تھا
طارق اسماعیل ساگر

میں ایک جاسوس تھا

طارق اسمٰعیل ساگر

7th Sky
PUBLISCTIONS
Al-Hamd Market, Ghazani Street,
40-Urdu Bazar Lahore. Ph: 042-8405100

جملہ حقوق بحق ناشر دائمی محفوظ ہیں

اس کہانی کے تمام کردار، مقامات، واقعات فرضی اور مصنف کی ذہنی اختراع ہیں
کوئی بھی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لیے مصنف ماوارہ بری الذمہ ہیں۔

نام کتاب	...	میں ایک جاسوس تھا
مصنف	-	طارق اسمٰعیل ساگر
ناشر	—	مسعود مفتی۔ یاسر
مطبع	—	زاہد نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	.....	ستمبر 2005ء

کسی بھی صورت میں استعمال کی
اجازت ضروری ہے۔
ناشر، جملہ حقوق کا حق محفوظ ہے۔

☆.....ملنے کے پتے.....☆

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور موبائل: 0300-4125230

خزینۂ علم وادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور فون: 7314169

مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور فون: 7230350

کتاب گھر
کمیٹی چوک راولپنڈی فون: 5552929

اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک راولپنڈی فون: 5531610

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار، کراچی فون: 2633151

رحمٰن بک ہاؤس
اردو بازار، کراچی فون: 7766751

اِنتساب

مادرِ وطن
کے ان گمنام سرفروشوں کی نذر
——— جنہوں نے اپنا آج ہمارے
کل پر قربان کیا۔

عنوانات

پیش لفظ	
ان دیکھی راہیں	13
پونم	45
دھوپ اور چھاؤں	59
سوامی جی	87
وشنویا ترا	113
آشرم کے اسرار	129
تلوار کی دھار	147
ٹھنڈی چھایا	171
بابوجی	187
سجاتا	225
ٹوٹی کہاں کمند	271
ساز شکستہ کی آواز	313

اَن دیکھی راہیں

سرشام ہی ہم سرحدی علاقے میں پہنچ گئے تھے اور اب ایک جیپ گھاس کے کچے پکے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر اچھلتی کودتی مجھے اس سرحدی چوکی کی طرف لے جا رہی تھی جہاں سے میں نے سرحد عبور کرنی تھی۔

جاسوسی تربیت کے سخت ترین مراحل سے گزرنے کے بعد عملی میدان میں یہ میرا پہلا قدم تھا۔

۱ جب ہم لوگ اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر جیپ میں سوار ہو رہے تھے تو میرے انسٹرکٹر میرے ساتھ ہی موجود تھے۔ ٹرین میں سارے راستے انہوں نے بڑے خوبصورت طریقے کے ساتھ مجھے ٹریننگ میں "سرحد پار کرنے سے متعلق" بتائے ہوئے تمام اصول دہرا دیئے تھے لیکن جیسے ہی ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچ کر پہلے سے منتظر جیپ میں سوار ہوئے' وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے بھی تو اپنی ٹریننگ کے مطابق اب بالکل خاموش رہنا تھا کیونکہ "حفاظتی اقدامات" میں پہلا اقدام یہی تھا کہ "جہاں تک ممکن ہو خود کو چھپائے رکھو۔" مجھے انسٹرکٹر کے وہ الفاظ اچھی طرح یاد تھے: "عملی میدان میں بسا اوقات حالات تربیت میں بتلائی گئی باتوں سے بالکل مختلف پیش آتے ہیں اور وہی اصل میں ایک جاسوس کے امتحان کا بہترین وقت ہوتا ہے۔"

جیپ ہمیں لے کر سیدھی کمپنی ہیڈ کوارٹر میں پہنچی تھی جو سرحد سے قریباً" ڈھائی تین میل کے فاصلے پر بنا ہوا تھا۔ اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ ہم نے آدھے گھنٹے میں طے کیا تھا لیکن اس آدھے گھنٹے میں ہی سرحدی علاقے میں فوج کی نقل و حرکت نے مجھے معاملے کی سنگینی نوعیت کا احساس دلا دیا تھا۔ اپنے جیالوں کو حالت جنگ میں دیکھ کر میرے جذبے کو گویا مہمیز لگ گئی تھی۔ سورج ابھی مکمل غروب نہیں ہوا تھا جب ہم ایک مرتبہ پھر سرحدی چوکی کی طرف سفر کر رہے تھے لیکن اس مرتبہ ہمارے ساتھ ایک اور ہستی بھی شامل ہو گئی تھی۔

"اس سے ملو یہ ہے دُلّا ـــــ تمہارا گائیڈ۔" میرے انسٹرکٹر نے کمپنی ہیڈ کوارٹر میں ایک چھریرے سے جسم کے نوجوان سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ جواب میں' میں نے کچھ

نہ کما اور دُلّے کو امید بھی یہی تھی کیونکہ وہ اس "بزنس" میں کافی پرانا تھا اور جانتا تھا کہ اپنے "ساتھی" کے متعلق کوئی بھی اطلاع جاننا قانوناً" جرم ہے اور خود اس کا ساتھی اپنے متعلق کبھی سچ نہیں بولے گا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے اس سے ہاتھ بھی نہ ملایا تھا' بلوا وہ میری انگلیاں ہی نہ گن لے۔ اصل میں انسٹرکٹر صاحب کے سامنے میں کم از کم ایک ہونہار شاگرد کا کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ ایسا ہونہار اور لائق شاگرد جو اپنے استاد کی معمولی معمولی باتوں کا احترام کرتا ہو۔ "اپنے گائیڈ پر شک کرو' ممکن ہے وہ ڈبل ایجنٹ ہو۔" ہر جاسوس کی تربیت حاصل کرنے والے کو سب سے پہلے گائیڈ سے متعلق یہی بات کہی جاتی تھی۔

ooo

دُلّا ہمارے آگے آگے جا رہا تھا' میں اور انسٹرکٹر صاحب پیچھے پیچھے۔ میں نے بھارتی دیہاتیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے اور اپنا حلیہ بالکل "ہونے ہونکوں" جیسا بنا رکھا تھا۔ میرے انسٹرکٹر کے اس وقت کیا جذبات تھے جب وہ اپنے شاگرد کو پہلے مشن پر روانہ کر رہا تھا' اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا تھا۔ پوسٹ تک پیدل چلتے ہوئے وہ مجھے اس علاقے کی تفصیلات بتاتے رہے جہاں سے میں نے سرحد عبور کرنی تھی۔ سرحد عبور کرنے کے بعد آنے والے پہلے گاؤں کا نام' پکی سڑک کہاں ہے؟ ان کی سرحدی چوکی کس طرف ہے؟ عموماً" B.S.F (انڈین بارڈر سیکورٹی فورس) والے کس علاقے پر زیادہ نظر رکھتے ہیں؟ محفوظ راستہ' راستے میں آنے والے ندی نالے' ان کا کل وقوع' آبادی سے متعلق معلومات' گردوارے اور مندر کی نشاندہی' تھانے کا اتا پتا' سمگلروں کے راستے اور دیگر باتیں۔ میرے ذہن میں علاقے سے متعلق تمام جزئیات نقل ہوتی جا رہی تھیں۔ پوسٹ سے کچھ فاصلے پر ہم رک گئے' غالباً" ان لوگوں کو ہماری آمد سے پہلے ہی باخبر کر دیا گیا تھا اور اب ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ میرا منتظر تھا۔

اس سرحدی پوسٹ پر ایک کچے صحن سے بنے ہوئے کمرے میں لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں ایک مرتبہ پھر میں اور میرے انسٹرکٹر صاحب ایک بڑے سارے تھیلے سے رنگ کے نتیجے پر جھکے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا ٹارگٹ سرخ پنسل سے ایک گول دائرے کی شکل میں دکھائی دے رہا تھا۔ جب ایک حوالدار چائے لے کر وہاں آیا تو ہم نقشہ سمیٹ چکے تھے۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ چائے کے ساتھ ہی دُلّا بھی اندر آ گیا تھا۔ ہم تینوں نے اکٹھے ہی چائے پی تھی۔ اس اثنا میں پوسٹ پر مغرب کی اذان ہو گئی اور ہم وہیں ایک خالی قطعہ زمین پر بچھی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنے لگے۔ چونکہ رنجرز کے لئے یہ امر باعث سعادت ہوتا ہے کہ وہ اپنی زیر

نگرانی ایک پاکستانی مجاہد کو سرحد پار کروا رہے ہیں' اس لئے شاید مقامی پوسٹ کے حوالدار صاحب جو ان کے امام تھے' نے خاص طور قرآن پاک کی وہ آیات تلاوت کیں جن میں اللہ کے نیک بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ "وہ ہر وقت اللہ کے دشمنوں سے لڑنے کے لئے کمربستہ رہتے ہیں۔" آیات کی تلاوت اور ان کے جذباتی اور رقت انگیز لہجے کا اثر چار چاند قیامت ڈھا گیا اور جب میں نے سلام پھیرا تو میرے اردگرد تمام مقتدیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم رخصت ہو رہے تھے۔

پوسٹ ہی پر میرے انسٹرکٹر صاحب مجھ سے بغلگیر ہو گئے' کیونکہ انہیں اب یہاں سے واپس چلے جانا تھا۔ "خدا حافظ بیٹے! اللہ نگہبان!" انہوں نے مجھ سے صرف یہی کچھ کہا۔ جب وہ دُلّے سے گلے مل رہے تھے' ان کا صرف ایک فقرہ مجھے سنائی دیا۔۔۔۔ "دُلّے میرے شیر کا خیال رکھنا' خدا حافظ۔۔۔۔!" میری طرف دوبارہ دیکھے بغیر وہ واپسی کے لئے گھوم گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ میری طرف نہیں دیکھیں گے۔ بہرحال ہم دونوں میں ایک جذباتی وابستگی ہو چکی تھی۔ ہم نے چھ مہینے ایک دوسرے کے ساتھ بہترین دوستوں کی طرح گزارے تھے۔ وہ میرے استاد سے زیادہ میرے والد اور اس سے زیادہ دوست تھے۔

ooo

"پکٹ" سے باہر آتے ہوئے ہمیں پکٹ پر موجود جوانوں نے "گن سیلوٹ" کے ساتھ الوداع کہا۔ پھر باقی سب تو وہیں رہ گئے۔ دُلّا اور دو مسلح جوان آگے آگے چل دیئے اور میں ان کے پیچھے پیچھے' میرے کندھے سے ایک کپڑے کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ اب میں مکمل بھارتی دیہاتی نظر آ رہا تھا۔۔

"سرحدی لکیر" پر ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر دونوں محافظ رک گئے۔ انہوں نے تیزی سے پوزیشن لے لی تھی' اس وقت وہ مکمل "رنجرز" نظر آ رہے تھے۔ مستعد' چاق و چوبند' تیار بہ تیار' دونوں نے ایک مرتبہ پھر مجھے "گن سیلوٹ" دیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور دُلّے کی معیت میں سرزمین پاک سے سرزمین ہنود پر پہلا قدم رکھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے پانچ گز کے فاصلے پر چل رہے تھے۔ میرے منہ میں جو گم تھی جسے میں مسلسل چبا رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا یا خدا کی ذات۔ اس وقت تک تو میں وہی کچھ کرتا آیا تھا جو ہمیں سکھایا جاتا ہے لیکن اب وقت اس سے بڑھ کر کچھ کرنے کا آ گیا تھا۔ مجھے

اپنے متعلق ہمیشہ سے یہ خوش فہمی تھی کہ میں پتھر کے اعصاب رکھتا ہوں لیکن ہماری ملاقات میں پہلا قدم رکھتے ہی میرے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی ـــــ مجھے بتایا گیا تھا کہ پہلی مرتبہ سرحد پار کرتے ہوئے ایک جاسوس کو اس کیفیت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے' لیکن وہ وقتی چیز تھی۔ ایسے ہی تھا جیسے کوئی لمحہ آئے اور گزر جائے۔ اب میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں آیت الکرسی اور آیت کریمہ کا ورد شروع کر دیا تھا۔ کسی انجانی طاقت نے میرے جسم میں بجلیاں دوڑا دی تھیں۔ مجھے اپنے عظیم مشن کے سامنے خوف' ڈر' گھبراہٹ سب ہیچ نظر آنے لگے تھے۔ ایک جذبہ تھا جس نے بہت سارے جذبوں کا گلہ گھونٹ کر اپنی حقیقت منوالی تھی ـــــ میں مسلمان ہوں اور ہندو کو تباہ کرنے جا رہا ہوں۔ اس ہندو کو جو میری ماؤں' بہنوں' میرے ملک' میری قوم کو لوٹ لینا چاہتا تھا' مار ڈالنا چاہتا تھا۔ میں بقاء کی جنگ لڑنے جا رہا تھا۔ ایک گھٹیا دشمن کے خلاف۔

○○○

دلاہڑے اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میرے آگے چل رہا تھا۔ دو تین منٹ تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ پلٹ کر دیکھ لیتا' کیونکہ اس کا لڑکپن اور جوانی انہی راستوں کو پھلانگتے گزری تھی لیکن میرا بسرحال یہ پہلا تجربہ تھا اور مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر احتیاط کے ساتھ اٹھانا پڑتا ـــــ رات کے سناٹے میں پیروں کی ہلکی سی چاپ بھی فضا میں دھماکے کی طرح گونجتی ہے اور پھر جیسے کی ایک گولی ـــــ اور چھٹی۔ کیونکہ ایسے حالات جو ان دنوں سرحدوں کے دونوں طرف رونما ہو رہے تھے' ان حالات میں کوئی بھی سرحدی محافظ "ہالٹ" پکارنے کی مہلت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ میں اور دُلّے میں فاصلہ بڑھ جاتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹہ تک ہم دونوں اسی طرح خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر وہ ایک کھیت کے قریب رک گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے وہیں بیٹھنے کو کہا اور خود سن گن لینے آگے چلا گیا۔

اب ہم کسی حد تک محفوظ علاقے میں آ گئے تھے لیکن سب سے خطرناک مرحلہ اب آنے والا تھا۔ ہمیں ایک نہر کو عبور کرنا تھا جس پر اکثر انڈین سیکورٹی والے "ناکہ" لگایا کرتے تھے۔ میں کھیت کے کنارے پر کماد کی فصل میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ شاید دُلّا پہلے یہ اطمینان کرنے گیا تھا کہ جھونپڑی خالی ہے یا اس میں کوئی موجود ہے۔ کوئی تین چار منٹ کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ ہم دونوں قریب ہی ایک گھاس پھونس کی بنی ہوئی جھونپڑی میں آ گئے تھے۔ ایسی جھونپڑیاں عموماً کسان اپنے کھیتوں کے قریب بنا لیا کرتے ہیں۔

جھونپڑی میں بیٹھ کر ہم نے وہاں موجود ایک گھڑے میں سے پانی پیا۔ میں ننگے پاؤں چلنے

ہوئے آیا تھا' جبکہ دُلّے نے فلیٹ بوٹ پہن رکھے تھے۔ اسے ربڑ کے جوتوں کے ساتھ چلنے کا خاصا تجربہ تھا لیکن میں نے دو تین فرلانگ چلنے کے بعد ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اونچے نیچے اور ہموار راستوں پر جوتوں کے ساتھ اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ اس علاقے میں ایک خاص قسم کے چھوٹے چھوٹے کانٹوں والی جھاڑیاں جابجا کھیتوں میں اور خاص طور سے کھیتوں کے کناروں پر لگی ہوئی ہیں۔ چونکہ مجھے ابھی ان کا خاص اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے میرے پاؤں میں بے شمار کانٹے چبھ گئے تھے اور اب ہلکی ہلکی جلن بھی ہونے لگی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے پاؤں دھوئے تو خاصا سکون محسوس ہونے لگا۔

"یہیں ٹھہرو' میں ذرا جائزہ لے آؤں۔" دُلّے نے سرگوشی میں کہا اور مجھے کچھ ہدایتیں دے کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں اپنا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔ ہم لوگ راجستھان کے ایک علاقے گنگا نگر سے سرحد عبور کر رہے تھے۔ گنگا نگر پہلا سرحدی شہر تھا جو میرے ٹارگٹ کے راستے میں آتا تھا۔ دُلّے نے مجھے یہاں چھوڑ کر واپس چلے آنا تھا' جب کہ بعد میں اپنے ٹارگٹ تک مجھے اکیلے ہی سفر کرنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر دل ہی دل میں میں نے اپنے ٹارگٹ کے متعلق اطلاعات اور سفر کے متعلق ضروری احتیاطیں دہرائیں اور وہیں جھونپڑی میں کپڑا بچھا کر خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور کامیابی کی دعا مانگی۔ میں اب بالکل پرسکون تھا۔ مطمئن اور آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار۔ چند ہی منٹ بعد دُلّا آ گیا۔

"چلو جی ـــــ!" اس نے تیز سرگوشی کی اور ہم چل دیئے۔ میں نے اپنے پاس موجود انڈین کرنسی نوٹ پلاسٹک کی تھیلیوں میں پیک کر کے اپنے کپڑوں میں مختلف جگہ چھپا کر رکھے تھے۔ چلتے چلتے ہم نہر کے کنارے پہنچے۔ وہاں اپنے کپڑے اتارے اور انہیں پلاسٹک کے تھیلوں میں اچھی طرح پیک کر کے ایک ڈوری کے ساتھ اپنے اپنے جسم سے باندھ لیا۔ اب ہم دونوں صرف انڈرویئر اور بنیان کے ساتھ نہر عبور کر رہے تھے۔

نہر عبور کرنا پل صراط عبور کرنے سے مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ رات کو پانی میں پیدا ہونے والی معمولی سی آواز بھی دھماکہ پیدا کر دیتی ہے اور دوسرے ہی لمحے سیسے کی گولی ہمارا مقدر بن جاتی' کیونکہ نہر کے مختلف حصوں میں عموماً" انڈین سیکورٹی والے شکار کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم دونوں نے قریباً" "مرہ تیراکی" یعنی سیدھے لیٹ کر تیرتے ہوئے نہر عبور کی تھی۔ اب ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی' یہ نہر کناروں سے پکی تھی اور کنارے بھی خاصے اونچے تھے۔ جہاں کہیں کنارہ نیچا ہوتا یا وہاں سے نہر میں داخلے کا راستہ بند ہوتا وہاں صیاد جال لگائے بیٹھا تھا۔

قریباً" چار مرتبہ ہم نے مختلف جگہ سے نہر کو عبور کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ خدا

خدا کر کے ایک جگہ نہر کے کنارے بڑی بڑی جنگلی گھاس کے سرکنڈے جھکے دکھائی دیئے۔ مجھ سے پہلے دُلّے نے انہیں پکڑ کر جسم کو زور سے اوپر کی طرف جھٹکا دیا۔ میں اس کی جسمانی پھرتی پر حیران رہ گیا۔ اس کے بدن میں تو بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ہی جھٹکے میں وہ اوپر پہنچ چکا تھا۔

وہاں جا کر اس نے اپنا تھیلا کھولا اور اپنی پگڑی کو نیچے لٹکایا۔ جس کی مدد سے میں بھی باہر آ گیا۔ باہر آ کر مجھے علم ہوا کہ اس نے کیوں پہل کی تھی ——— تیز اور نوکیلی گھاس نے اس کے ہاتھ لہولہان کر دیئے تھے۔ اسے علم تھا کہ میں نے ابھی ملک کے لئے بہت سے کام کرنا ہے۔ شاید اسی لئے اس نے مجھے تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کی عظمت کا احساس ہوا۔ پگڑی کا پلو پانی میں بھگو کر میں نے اس کے ہاتھ اچھی طرح صاف کئے اور ایک ہاتھ پر کس کر پٹی باندھ دی۔ جس نے خون کا بہاؤ ختم کر دیا۔ وہ پٹی دُلّے نے تھوڑی دیر کے بعد ہی اتار دی۔

"خواہ مخواہ کسی کا میری طرف متوجہ ہونا ٹھیک نہیں۔" اس نے میری بات کا مختصر سا جواب دیا۔

ہم کھیتوں کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ فصلیں اپنے جوبن پر تھیں۔ کہیں کہیں سے سبزہ روندا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہ جگہیں تھیں جہاں سے انڈین کنوائے گزرتے تھے اور اپنی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کے نشان پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔

ooo

کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتے چلتے بالآخر ہم اس سڑک کے آخری کونے تک جا پہنچے جہاں سے ہمیں گنگا نگر شہر میں داخل ہونا تھا۔ شہر میں داخلے کے لئے بھی ایک بڑی نہر بنی ہوئی ہے اور داخلے کے لئے جہاں بھی نہر پر پل بنا ہوا تھا' وہاں پر ایک ملٹری پوسٹ بھی موجود تھی۔

یہ سرد جنگ کا دور تھا۔

مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کاروں کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آئے روز کوئی نہ کوئی خبر سننے کو مل جاتی تھی اور اب بھارتی جنگی جنون مغربی سرحدوں کا رخ کر رہا تھا۔ راستے میں جہاں جہاں سے ہم گزرے' ہر طرف آرمی کنوائے آتے جاتے دکھائی پڑے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان سے دامن بچا کر اپنا سفر کرتے رہے لیکن اپنے کام کی کوئی بات میں نے نظر انداز نہیں کی تھی ——— میری بے چین نظروں سے کچھ نہ بچ سکا تھا۔

اس جگہ کا نام "تین پلی" تھا جہاں سے ہم شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں سے تین

راستے اس مقام پر آ کر ملتے ہیں جو مختلف دیہاتوں سے اس طرف آتے ہیں۔ "تین پلی" سے تھوڑا پیچھے ہی ہمیں ایک سائیکل رکشہ نظر آ گیا۔ وہ شخص کسی کا دودھ لے کر شہر کی طرف جا رہا تھا۔ دُلّے نے موقعہ غنیمت جانا اور اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا حلیہ چونکہ بالکل دیہاتیوں جیسا تھا' اس لئے ہماری حالت پر کوئی شک نہ کر سکتا' لیکن اب ایک اور مشکل آڑے آ رہی تھی۔ یہاں کی مخصوص زبان پر مجھے عبور حاصل نہیں تھا۔ دلے کی البتہ اور بات تھی۔ "تم فی الحال اپنے آپ کو گونگا ہی سمجھو ———" اس نے رکشہ سائیکل کی طرف بڑھتے ہوئے سرگوشی کی۔

میں نے جواب میں گردن ہلا دی۔ اب ہم دونوں رکشہ سائیکل میں بیٹھ چکے تھے۔

بھارتی دیہاتیوں میں بہت سے دیگر غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاموں کے علاوہ ایک کام کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور وہ ہے "شراب بنانا" ہر دیہات میں غیر قانونی طور پر شراب نکالی جاتی ہے جو شہروں میں سستے داموں فروخت ہوتی ہے کیونکہ حکومت کے منظور شدہ ٹھیکوں سے ان کے ریٹ خاصے کم ہوتے ہیں۔ اس لئے چھوٹا طبقہ عموماً اس "کارِ خیر" کو ترجیح دیتا ہے۔ بھارت کا ہر دوسرا شہری شراب کا رسیا ہے۔ نشہ بازی کا رجحان اتنا عام ہے کہ سڑک کے کنارے جیسے ہمارے ہاں چائے کے سٹال بنے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہاں شراب کے ٹھیکے بنے ہوتے ہیں۔ یہاں سرکاری طور پر جاری شدہ شراب فروخت ہوتی ہے اور ایک مخصوص احاطے کے اندر بیٹھ کر شراب نوشی کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ پنجابی دیہاتی معاشرے میں ایسے غیر قانونی دھندے کرنے والوں کی مدد کرنا باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ دُلّے نے شاید اسی پس منظر میں پلان بنایا تھا۔ دو تین منٹ تک گفتگو کرنے کے بعد ہی وہ رکشہ والے کو اپنے ڈھب پر لے آیا تھا۔ ایک قریبی گاؤں سے اس نے اپنا رشتہ جوڑتے ہوئے وہاں کے پانچ چھ معتبر قسم کے بدمعاشوں کا حوالہ دے کر اس پر اچھا خاصا رعب ڈال دیا تھا۔

"مہاراج جی ہم تو داس ہیں' آپ کے جتنا مال بھی ہو شہر پہنچ جائے گا۔"

عموماً سائیکل رکشہ کو ہی اس غیر قانونی شراب کی منتقلی کے لئے استعمال کیا جاتا اور ایسے لوگ اچھے خاصے پیسے کما لیتے ——— دُلّے نے اسے یہی لالچ دیا تھا کہ وہ اس کے ذریعے کام کروائے گا۔

ooo

"تین پلی" پر ہم بھی پہلے سے لگی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سائیکل رکشہ والے نے ہمیں دودھ کا مالک بتایا تھا اور وہاں موجود گورکھا فوجیوں نے سوائے دُلّے کے نام اور گاؤں کے نام کے

اور کچھ نہیں پوچھا تھا۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب ہم لوگ گنگا نگر شہر میں داخل ہو رہے تھے۔

بھارتی شہری زندگی کا پہلا نمونہ ہی اتنا کراہت انگیز تھا کہ میں نے پاکستان بننے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ بھارتی مخلوط معاشرہ بڑی تیزی کے ساتھ پستی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ عام دیہات جو کبھی عزت و غیرت کا سمبل ہوتے تھے' وہاں بے حیائی پوری طرح رواج پا چکی ہے۔ عورت اور مرد کے غیر اخلاقی تعلقات اور اس کے بدترین نتائج اپنے عروج پر ہیں۔ شہروں میں بھی جگہ جگہ ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مسلمانوں کے جاتے ہی ہندو سکھ معاشرہ اپنی اصلیت پر آ گیا ہے۔ جب ایک سرحدی اور معمولی شہر کا یہ حال ہے تو آگے بڑے شہروں کا کیا حال ہو گا' اس کا اندازہ مجھے بخوبی ہو گیا تھا۔ رکشہ والے نے ہمیں شہر کے عین درمیان لاری اڈے کے نزدیک اتارا تھا۔ ہمارے لاکھ ضد کرنے کے باوجود اس نے ہم سے کرایہ نہیں لیا تھا۔ وہ تو ہمیں چائے پلانے پر بھی تلا ہوا تھا لیکن یہ زیادتی تھی۔ میں نے اور دُلّے نے اسے زبردستی اپنے ساتھ ناشتہ کروایا اور اگلی صبح ملاقات کا وعدہ کر کے اس سے الگ ہو گئے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے گنگا نگر کے لاری اڈے کا رخ کیا۔ اس اثناء میں' میں نے گونگا بنے رہنے میں ہی خیریت جانی تھی۔ ان لوگوں کے گفتگو کرنے کا مخصوص لہجہ ذہن نشین کر رہا تھا۔ جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ میں یہاں اجنبی اور الگ الگ نظر نہیں آؤں گا میں نے زبان بند رکھی۔

مجھے لدھیانے جانا تھا۔ قسطوں میں سفر کرنا ہی محفوظ ترین تھا۔ ہم ایک بس میں بیٹھے اور ابوہر کی طرف چل دیئے۔

گنگا نگر سے لدھیانہ تک کا سفر ایسے ہی تھا جیسے کسی نے لاہور سے فیصل آباد جانا ہو تو ملتان جائے اور وہاں سے فیصل آباد پہنچے۔ ابوہر کے بسوں کے اڈے پر جیسے ہی بس رکی' میں نے دروازے پر نظریں دوڑائیں۔ وہاں دو سفید کپڑوں میں ملبوس انڈین انٹیلی جنس کے آدمی ہر اترنے والے کو اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ یہی پاکستان کا جاسوس ہے۔

"ہم الگ الگ اتریں گے!" میں نے دُلّے کے کان میں سرگوشی کی۔

وہ میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر اگلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بس میں خاصا رش تھا جس کی وجہ سے ہر کسی کو اترنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں نے دُلّے کے اترنے کا انتظار کیا' جب وہ اتر گیا تو میں بھی دھکم پیل کرتا پچھلے دروازے سے نیچے اتر گیا۔ نیچے اترتے

وقت میں نے جان بوجھ کر ایک اوجھڑ عمر کے سکھ کو کہنی ماری تھی۔

"اندھا ہے کیا؟" ——— اس نے میرے پیچھے اترتے ہی مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"شما کرنا مہاراج جی۔" میں نے بھارتی رسم و رواج کے مطابق بڑی عاجزی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے اس عمل سے کم از کم میں ان دونوں شکاری کتوں کی نظروں کا سامنا کرنے سے محفوظ ہو گیا جو چاروں طرف جال پھیلائے شاید میرے ہی منتظر تھے۔

دُلّے کے لئے یہ معمول کی بات تھی۔ وہ حالات سے لاپروا لاری سے کچھ فاصلے پر بنے ایک کھوکھے سے بیڑیاں خرید رہا تھا۔ میں بھی اس کے نزدیک پہنچا۔ اس نے مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف' میری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا اور اپنے آپ میں مگن رہا۔ میں بھی اس کے رویے کا مطلب بخوبی جان چکا تھا۔ اس لئے میں نے بھی اس سے پہلے ہی سگریٹ کی ایک ڈبیا خرید کر وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ آہستہ آہستہ اڈے سے باہر کی طرف چل دیا۔

میں بھی کچھ فاصلے سے اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس امر پر ہم دونوں ہی نظر رکھے ہوئے تھے کہ کوئی ہم دونوں میں سے کسی کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد جب دُلّے کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہم محفوظ ہیں تو وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔

اس طرف لوگوں کی آمد و رفت کم ہی تھی پھر بھی میں نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔

"ست سری اکال جی ——— " میں نے اس کے قریب پہنچ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی جواب میں اس خوبی سے وہی عمل دہرایا کہ میں اس کی شاندار ایکٹنگ پر حیران رہ گیا' اور لوگوں کی بات تو چھوڑیئے' خود مجھے بھی اس کا یقین ہونے لگا کہ ہم کافی عرصہ بعد پہلی مرتبہ ملے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہوئے ہم بالآخر ایک ہوٹل کے قریب پہنچ گئے۔ بھارت میں عموماً دو قسم کے ہوٹل پائے جاتے ہیں۔ ایک تو ان لوگوں کے لئے جو ویجیٹرین یعنی سبزیاں کھانے والے ہیں اور دوسرے ان کے جو "میٹ" کھانے والے ہیں۔ مسلمانوں کی گوشت خوری چونکہ مشہور ہے اس لئے ہم لوگ ایسے ہوٹلوں میں جانے کا "رسک" کم ہی لیا کرتے ہیں خواہ وہاں حلال گوشت ہی کیوں نہ فروخت ہو رہا ہو۔

میں نے سرسری نظروں سے جائزہ لیا' ہوٹل کے باہر لکھا تھا۔ "پریم ویشنو ڈھلبہ" ویشنو وہ لوگ ہوتے ہیں جو انڈہ گوشت وغیرہ نہیں کھاتے اور ایسے معمولی درجے کے ہوٹل عموماً "ڈھلبہ" کہلاتے ہیں۔ دُلّے نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ یہاں عموماً غریب لوگ ہی کھانا کھاتے ہیں اور ایسے ڈھابے زیادہ مشتبہ بھی نہیں ہوتے۔

پریم وشنو ڈھابے کے ایک کونے میں رکھی میز پر بیٹھ کر ہم نے آلو سفر کا آرڈر دیا اور جیسے ہی ایک میلے کچیلے کپڑوں والا ہوٹل کا ملازم زنگ آلود تھرمس کی پلیٹوں میں کھانا وہاں رکھ کر گیا' ہم دونوں ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ رات بھر کے پیدل سفر اور تھکاوٹ نے برا حال کر دیا تھا۔ ایک اجنبی ملک' اجنبی ماحول' قدم قدم پر گرفتاری اور موت کا خطرہ۔ میں اپنی حد تک تو یہی کہوں گا میں اپنے ذہن اور جسم کی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی ہمیں ذرا محفوظ ہونے کا احساس ہوا' شدید تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔

"میں آپ سے الگ ہو رہا ہوں' اللہ تعالیٰ آپ کا مشن کامیاب کرے۔" وٹے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آمین" ہم دونوں کے منہ سے اکٹھے ہی نکلا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے راستوں کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا' لاریوں اور بسوں وغیرہ میں سفر کے آداب کے متعلق آگاہی دی اور پنجاب کے مختلف علاقے کے لوگوں کی عادات سے آگاہ کیا۔ گو کہ ان باتوں کا مجھے پہلے سے علم تھا' پھر بھی میں بڑی توجہ کے ساتھ اس کی باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔

"اچھا دوست فی امان اللہ ——" اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

○○○

وٹا وہیں رہ گیا' میں باہر نکل آیا۔

ہمارے الگ ہونے کا یہی طریقہ سب سے بہتر تھا۔ نہ اسے میری منزل کا علم تھا نہ مجھے اس کے ٹھکانے کی خبر۔ اب میں تھا اور خدا کی ذات۔ میرا عزم تھا اور اس کی نصرت۔ پھر ڈھابے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہی میں ذہنی طور پر ہر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ ساری تھکاوٹ نجانے کہاں غائب ہو گئی تھی اور میں اپنے آپ کو بالکل چست اور ہشیار محسوس کر رہا تھا۔

بسوں کا اڈہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا لیکن میں نے سائیکل رکشہ پر ہی جانے کو ترجیح دی۔

سائیکل رکشہ سے میں اڈے کے باہر ہی اتر گیا۔ مجھے لدھیانہ جانا تھا۔ یہاں سے براہ راست لدھیانہ کو بسیں جاتی تھیں لیکن میں نے ان کے ذریعے نجانے کیوں سفر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں موگا جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔ جو ہر سے موگا جانے والی بسوں کی کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ میں دو سواریوں والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جان بوجھ کر میں نے کھڑکی والی سیٹ خالی

چھوڑ دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح وہاں بیٹھنے والی سواری زیادہ توجہ باہر کے مناظر دیکھنے پر صرف کرے گی اور مجھ سے گفتگو کا موقع اسے کم ہی ملے گا۔ ابھی میں اس مرحلے پر نہیں پہنچا تھا کہ بھارتی شہریوں سے فری ہو کر گفتگو کرنے لگوں' کیونکہ لاکھ تربیت یافتہ یا ہشیار بالاک ہونے کے باوجود میں ایک اجنبی تھا۔

ایک پاکستانی جاسوس جس نے ایک بھارتی شہری کا بھیس بدل رکھا تھا —— ! دل ہی دل میں' میں دعا کر رہا تھا کہ خدایا یہاں کوئی میرے مطلب کی سواری ہی بیٹھے۔ میری دعا قبول ہوئی اور میں نے ایک سکھ نوجوان کو دیکھا جس کی عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال تھی اور شکل سے ہی معصوم سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب خالی جگہ دیکھ کر دھپ سے آ بیٹھا۔ اس کے بیٹھنے کے چند منٹ بعد ہی لاری چل دی۔

"کہاں جاؤ گے بھائی ——؟" میں نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"موگے" اس نے میری بجائے دائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"یار بھائی تو مجھے بھی وہیں ہے پر میں پہلی مرتبہ جا رہا ہوں' کیا تم وہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں ——" اس نے ابھی تک میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ پھر نجانے کیسے اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ عورت کا خاوند اس کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ گاہے گاہے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھ بھی رہا ہے۔

اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"کہاں جائیں گے آپ؟"

"رینگل سیٹلہ"

"میں بتا دوں گا آپ کو —— میرے گھر کے نزدیک ہی ہے۔"

"دراصل میرا چچا زاد وہاں مشین آپریٹر ہے' اسی سے ملنے جا رہا ہوں۔" میں نے اپنی دانست میں اس کی کمزور رگ پر ہاتھ رکھا کیونکہ یہاں کی "کلیمر" سے بھرپور فائدہ دیکھ کر میں نے یہاں کے نوجوانوں کے جذبات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ؟" سیٹلہ کے حوالے سے گفتگو کے جواب میں اس کی دلچسپی نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔

"میں تو گنگا گھر رہتا ہوں' وہ لدھیانے رہتا ہے۔"

"میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔"

"دھنواد" (شکریہ) میں نے کہا۔

موگا پہنچنے تک ہم دونوں بڑے اچھے دوست بن چکے تھے۔ اس اثناء میں راستے میں جہاں کہیں بھی بس ٹھہرتی' وہ حسب توفیق کچھ نہ کچھ چھابڑی فروشوں سے خریدتا اور مجھے بھی ساتھ شامل کر لیتا۔ شام کو ہم موگے پہنچ گئے۔ اب اس سے جان چھڑوانے کا مسئلہ درپیش تھا۔

راستے میں' میں نے اس کی مدد سے موگے کا سارا نقشہ حفظ کر لیا تھا۔

"اچھا سردار جی مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے۔ کل آپ بارہ بجے والے شو پر مجھے ریگل سینما کے دروازے پر اپنا منتظر پائیں گے۔ گو ئیل یاروں کا یار ہے' ایک دفعہ تمہارا تعارف کرا دوں گا ساری زندگی تمہیں موگے میں سینما کی ٹکٹ نہیں خریدنی پڑے گی---" اتنا کہہ کر میں نے اسے سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور "ست سری اکال" کہہ کر پھرتی سے لاری اڈے کی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ اب میرا جسم شدت سے آرام کا تقاضا کر رہا تھا۔ مسلسل سفر نے تھکاوٹ ڈالا تھا اور آنکھوں میں جلن کے ساتھ ساتھ سر درد نے بھی برا حال کر دیا تھا۔ اس صورت میں سفر جاری رکھنا خواہ مخواہ بخار کی مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے جیسے تیسے اڈے سے باہر نئی ریلوے لائن عبور کی۔ اب میں موگا کے مین بازار میں داخل ہو رہا تھا۔ یہیں ایک معمولی سے ہوٹل کو میں نے اپنی شب بسری کے لئے منتخب کیا۔

ooo

شام کے قریباً چھ سات بجے میں کرنار ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس ہوٹل کا مالک ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی تھا اور مجھے بعد میں علم ہوا کہ وہ پولیس کا خاص لڑہ بھی تھا۔ موگا ایک قصبہ نما چھوٹا سا شہر ہے' اس کے علاوہ یہاں ایک دو ہوٹل ہی تھے لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ میں سب سے پہلے پہنچا ہی اس ہوٹل میں تھا۔ ہوٹل کے نیچے ایک ہال کمرہ تھا جس کے اوپر تین چار کمرے بنے ہوئے تھے جن کی چھتیں ساتھ کے دوسرے مکانوں سے ملی ہوئی تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے اندرون شہر مکانات ہوتے ہیں۔

"کہاں سے آئے ہیں مہاراج؟" ہال کمرے کے ایک کونے میں شو کیس کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ایک ششتی داڑھی والے سکھ نے مجھ سے پوچھا' جس کا چہرہ شو کیس پر رکھے مطالعے کے اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ شو کیس جس سے وہ کاؤنٹر کا کام بھی لے رہا تھا' اس کے ایک کونے میں اردو اخبار "ہند سماچار" رکھا ہوا تھا۔

مشرقی پنجاب میں لوہڑ عمر کے زیادہ تر سکھ اردو اخبارات ہی پڑھتے ہیں' اس لئے اس وقت میرے ذہن میں کوئی شک پیدا نہ ہوا اور یہی میری غلطی تھی جس کا خمیازہ مجھے بعد میں بھگتنا پڑا۔

"جالندھر سے آئی محلہ مکان نمبر ۳۴" میں نے رٹا رٹایا ایڈریس رجسٹر پر لکھوا دیا۔

"یہاں اپنے دستخط کر دیں---" اس نے دو چار سوالات پوچھنے کے بعد بالآخر رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا۔

"میں تو ان پڑھ ہوں سردار جی۔"

"ٹھیک ہے--- انگوٹھا لگا دو۔ بھئی کیا کریں کاروبار ہی ایسا ہے' کارروائی مکمل نہ ہو تو پولیس تنگ کرتی ہے۔" اس نے سیمپ پیڈ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے انگوٹھا لگا کر ضابطے کی کارروائی مکمل کی۔

"لوئے سٹولے جا سردار جی کو اوپر---" اس نے ایک عجیب و غریب وضع قطع کے ملازم کو آواز دیتے ہوئے حکم دیا۔

کمرہ کیا تھا' کچھ نہ پوچھئے اسے تو کمرہ کہنا ہی کمرے کی توہین تھی اور تو ساری باتیں ایک طرف' دروازہ ہارڈ بورڈ کا تھا جس میں کم از کم دس سوراخ کئے گئے تھے۔ یہ ہوٹل زیادہ تر غلط مقاصد کے لئے استعمال ہوتا تھا اور دروازوں میں سوراخ کر کے ملازمین کو سولت بہم پہنچائی گئی تھی۔

میں ہوٹل کے واحد غسل خانے میں جا غسل نما کر فارغ ہوا تو چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ کھائے۔ دو اسپرین کی گولیاں زہر مار کیں اور گہری نیند سو گیا۔ صبح میری آنکھ فجر کے وقت قریبی گردوارے سے آنے والی آوازوں سے کھلی تھی۔ حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد میں نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا۔ سچ ہے ایسی غیر یقینی حالات میں خدا کی ذات ہی میرا واحد سہارا تھی۔

میرے کمرے کے ساتھ باقی تین چار کمرے ایک قطار کی صورت میں بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک طرف اوپر چھت پر جانے کا راستہ تھا جب کہ دوسرے کونے پر ایک کمرے میں ہوٹل کے ملازمین زمین پر لیٹے رہتے تھے۔ نیچے ہال میں جا کر میں نے شتے کا آرڈر دے کر اوپر آ گیا اور جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا' اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرے بستر پر تازہ اخبار اردو زبان کا "ہند سماچار" رکھا ہوا تھا۔

اردگرد کوئی موجود نہ تھا۔ مجھے یہ تو سمجھ آ گئی کہ یہ جال ہے اور جال میں مجھے پھانسا جا رہا ہے لیکن اپنے پچھلے رویے پر غور کیا تو مجھے شک والی کوئی بات نظر نہ آئی۔ میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی غلطی سے اخبار یہاں رکھ گیا ہے' وہاں کسی کو موجود نہ پا کر اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اخبار اٹھا لیا اور سرسری نظروں سے اس کا جائزہ

بھی لے لیا ـــــ جس وقت ہوٹل کا ملازم اچانک وہاں پہنچا تو میں چارپائی پر اخبار پکڑے بیٹھا تھا۔

"یار یہ کس کا اخبار یہاں پھینک گئے ہو؟" میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر کہا۔

"معاف کرنا صاحب جی دراصل یہ ساتھ والے کمرے میں جو لالہ جی ہیں نا ان کا اخبار تھا۔ غلطی سے پھینک گیا' میں یہی لینے آیا تھا۔"

اپنی دانست میں تو میں نے اسے خود پر شک کرنے کا موقع نہیں دیا تھا لیکن اس کی گہری اور کافی اندر تک جھانکنے والی نظروں کو میں کیسے نظرانداز کر سکتا تھا؟

چھٹی حس نے جیسے ہی خطرے کی نشان دہی کی' میں نے اس کے روانہ ہوتے ہی اپنے مختصر سے سامان کا جائزہ لیا۔ میری کل کائنات ایک پلاسٹک کا اور ایک کپڑے کا تھیلا تھا۔ پھر تو جیسے میں ٹھہر کر رہ گیا' کسی نے واقعی میرے دونوں تھیلوں کی تلاشی لی تھی لیکن اتنی چابکدستی کے ساتھ کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکے۔

دوسرے ہی لمحے میں آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ میرے پاس موجود تمام کرنسی تو پہلے ہی میری جیبوں میں موجود تھی۔ میں نے بڑی پھرتی کے ساتھ جوتے بدلے اور تیار ہو کر بیٹھ رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے سامان میں کوئی ایسی ویسی چیز نہیں تھی جس سے کسی کو شک ہوتا' لیکن ممکنات پر نظر رکھنا ہر جاسوس کا اولین فرض ہے۔ ممکن تھا کہ انہوں نے وہاں کوئی مشتبہ چیز دیکھ لی ہو یا مجھے اردو اخبار پڑھتے کسی نے دیکھ لیا ہو۔ میرا ہاتھ لگنے کے اندر داخل ہوا' میں نے بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے "قتلی" تھامی۔

"یار ذرا یہ سگریٹ تو لانا۔" کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ جیسے ہی وہ نوٹ لینے آگے کو جھکا' ایک ہی وقت میں میرے دائیں ہاتھ کی زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر اور گھٹنا اس کے جسم کے نازک ترین حصے پر لگا۔ میں نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ لگا دیا تھا کیونکہ وہ کسی "اسلوموشن" فلم کی طرح بغیر منہ سے آواز نکالے میرے بستر پر آن گرا۔ میں نے اس کی ٹانگیں بھی اٹھا کر اوپر کر دیں اور وہ بدبودار کمبل جس نے ساری رات میرا خون چوسا تھا اس کو اوڑھا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں بڑی پھرتی سے لیکن بغیر آواز پیدا کئے ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

سیڑھیوں کے خاتمے پر ایک طرف ہال کمرہ تھا جس کے سیڑھیوں سے منسلک حصے کے باہر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور شاید سارا موگا وہیں سے پوریاں خریدنے اور کھانے چلا آیا تھا۔ ایسے رش اور افراتفری کے عالم میں کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑی اور میں خاموشی سے ایک

طرف کھسک گیا۔ بازار کھل رہا تھا اور لوگوں کی آمدورفت بھی ابھی خاصی شروع ہو چکی تھی۔ ابھی میں بمشکل چند روز گز بھی نہ چل پایا تھا جب میں نے پولیس کی ایک تیز رفتار جیپ کو جس کے ساتھ آٹھ دس مسلح سپاہی اور ایک تھانیدار چمٹے ہوئے تھے' کرنار ہوٹل کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ہوٹل کے سامنے میں نے اپنی آنکھوں سے جیپ کو رکتے دیکھا تھا۔ سپاہی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچھے اترے' آگے کا منظر دیکھنے کی بجائے میں ایک نائی کی دکان میں جا گھسا۔

"حشر کر یار اس مصیبت کو۔" میں نے اپنے چہرے پر اگی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"جو حکم سرکار!"

نائی نے "رام رام" کہتے ہوئے میری داڑھی اور مونچھیں صفاچٹ کر ڈالیں' تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک مکمل برہمن کے روپ میں قیمتی پوشاک پہنے اور خاصی قیمتی گرم چادر اوڑھے گلے میں "جنیو" ڈالے میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو چکا تھا' جو کرنار ہوٹل کے باہر پولیس کی بے بسی کا نظارہ کرنے کے لئے اکٹھی ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا بھائی ـــــ؟" میں نے ایک تماشائی سے پوچھا۔

"لالہ جی جاسوس تھا کوئی ـــــ بھاگ گیا سالا ـــــ اتنی پولیس کو جل دے کر بھاگ گیا۔ سب سالے گدھے پولیس میں بھرتی ہو گئے ہیں۔" اس نے عقیدت مندی سے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ہرے لوم ہرے لوم ـــــ" کہتا ہوا میں ایک طرف ہٹ گیا۔

پولیس والوں کو جب وہ "جاسوس" نہ مل سکا تو انہوں نے اپنا غصہ ہوٹل کی چوریوں اور چائے پر نکالا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر اس بیرے کو دھکے مارتے ہوئے جیپ کی طرف لا رہے تھے جسے میں استراحت فرمانے کے لئے اپنے بستر پر چھوڑ آیا تھا۔ میرے لاری اڈے پر پہنچنے سے پہلے ہی میرے فرار کے افسانے اور کارنامے وہاں زبان زد خاص و عام تھے۔

"پاکستانی گھس بیٹھیے" اور "کمانڈو" کی موگا میں موجودگی نے کئی بھارتیوں کے چہروں سے لہو نچوڑ لیا تھا۔ ہر شخص سہما سہما اور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

اڈے پر بھارتی پولیس کے مسلح سپاہی گشت کر رہے تھے' جیسے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ابھی وہ جاسوس واپس آ کر ان کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کر دے گا یا پھر وہ اسے گرفتار کر کے رہیں گے۔ بس کا ٹکٹ خریدنے سے بس میں سوار ہونے تک ہر جگہ اس موضوع پر گفتگو

سے واسطہ پڑا۔ میں دل ہی دل میں ان کی خوفزدگی سے لطف اندوز ہوتا رہا لیکن امکانات کو میں نے نظر انداز نہ کیا۔

ooo

موگے سے میں لدھیانہ جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔ لدھیانہ تک اسی ایک بات کا تذکرہ ہوتا رہا۔ میں نے بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ شام کے وقت بس لدھیانہ پہنچی' میں لاری اڈے جانے کے بجائے جو کہ بادل نخواستہ کے نزدیک بنا ہوا ہے' کچھ پیچھے ہی ٹیلی گراف آفس کے نزدیک بس سے اتر گیا۔

یہاں سے لدھیانہ شہر تک کا فاصلہ میں نے جان بوجھ کر پیدل ہی طے کیا تھا۔ ریلوے کے پل سے گزرتے ہوئے میں نے اردگرد شہر کا نظارہ کر لیا اور راستے میں مختلف لوگوں سے اردگرد کے علاقوں کے بارے بھی پوچھتا جا رہا تھا جو بعد میں میرے کام آ سکتے تھے اور جن کے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہ رات میں نے ہوٹل کے بجائے کسی اور جگہ بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ جگہ تھی ایک آشرم۔

آشرم میں معمولی پیسے دے کر آپ کو رات بھر کے قیام کے لئے ایک چارپائی مل جاتی ہے۔ اگر متعلقہ پنڈت کو جو یہاں کا انچارج ہے آپ نے رام کر لیا تو بھلے دم آخریں تک یہاں قیام کیجئے۔ لدھیانہ شہر کے اس آشرم میں داخل ہوتے ہی میرا واسطہ سب سے پہلے پجاری جی کے ایک چیلے سے پڑا۔

"رام رام جی ——" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"رام رام —— کہاں جائیں گے ——؟" اس نے جواب اور سوال ایک ساتھ داغا۔

"کمرہ چاہیے ——" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے ایک نظر بھرپور سے میرا جائزہ لیا' گو اس وقت تک میرا حلیہ کافی تبدیل ہو چکا تھا' یعنی قیمتی گرم چادر کی جگہ ایک عام جرسی نے لے لی تھی اور معمولی سا مفلر کانوں کے گرد لپٹا تھا لیکن اب بھی میں اچھا بھلا "براہمن" نظر آ رہا تھا۔

"مہاراج جی جگہ تو نہیں ہے۔ دراصل ماتا وشنو کا میلہ شروع ہونے والا ہے اس لئے لدھیانہ میں اردگرد کے دیہاتوں سے کافی لوگ آ رہے ہیں' البتہ کوشش کر کے ایک کمرہ خالی کروایا جا سکتا ہے اگر آپ ——"

"میں اس کا دوہرا کرایہ مکمل کر ——" میں نے اس کا ادھورا فقرہ مکمل کر

میں تو خود ہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ طلب کریں۔ اس طرح ایک طرح سے تحفظ کا احساس رہتا تھا اور سامان کے علاوہ اس شخص کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ایک دیوار میں بنی ہوئی مختلف الماریوں میں سے ایک میں سامان رکھ کر جو ایک کپڑے کے تھیلے اور اس میں ضروریات زندگی کی کچھ چیزوں پر مشتمل تھا' میں نے تالہ لگا دیا اور باہر نکل آیا۔

رات تک میں نے جی بھر کے آوارہ گردی کی۔ میں چاہتا تھا کہ جس شہر میں قیام کر رہا ہوں' اس کے گلی محلوں سے' اس کے مکینوں سے' عمارات سے اور وہاں موجود تفریحی مقامات سے آگہی حاصل کر لوں۔ موگے سے ایک "پاکستانی جاسوس" کا فرار کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ رائے کوٹ' ملاں پور' جگراؤں اور لدھیانہ تک کے تمام ہوٹلوں پر سی۔ آئی۔ ڈی نے کڑی نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ رات ہوٹل میں بسر کرنے سے پرہیز کیا۔

رات کو ایک مقامی سینما میں فلم دیکھتے ہوئے پھر ایک مصیبت نے آن گھیرا۔ جس قطار میں کھڑا ہو کر میں ٹکٹ خرید رہا تھا' وہاں شراب کے نشے میں دھت ایک سکھ نوجوان آ دھمکا اور خواہ مخواہ سب سے الجھنے لگا۔ یہاں ایسے واقعات چونکہ روز مرہ کا معمول تھے اس لئے ان لوگوں کے لئے تو وہ کوئی پریشانی پیدا نہ کر سکا' البتہ میری بات اور تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے حکم دیا کہ اس کے لئے جگہ خالی کر دوں۔ میں نے شرافت سے جگہ چھوڑ دی۔ پھر حکم ہوا دوبارہ قطار میں کھڑے ہو جاؤ' میں پھر کھڑا ہو گیا۔ جب اسے یقین ہو چلا کہ واسطہ کاٹھ کے الو سے ہے تو اس نے دست درازی بھی شروع کر دی۔ میں خاموش اس لئے تھا کہ نوبت پولیس تک نہ پہنچ جائے' دوسری طرف حالت یہ تھی کہ وہ شرابی اپنے کام میں مصروف تھا اور میں لوگوں کے لئے مذاق بنا ہوا تھا۔ وہ سب زوردار قہقہوں سے اسے داد دے رہے تھے۔ جب یہ معاملہ دیکھ کر دو پولیس والے بھی اس طرف آنے لگے تو میرا ماتھا ٹھنکا' میں قطار سے باہر نکل گیا تاکہ چپ چاپ کھسک جاؤں' لیکن اس نے مجھے گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ پولیس کے سپاہی قریب آ گئے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے بادل نخواستہ اس کو دو ہاتھ جما دیئے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا قریبی دیوار سے ٹکرایا اور لوگوں کے قہقہوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

"واہ لالہ جی مہاراج ..... کمال کر دیا۔" مجھے داد ملنے لگی کیونکہ کسی ہندو کے ہاتھوں کسی سکھ کا لدھیانہ میں پٹ جانا یقیناً معجزہ ہی تھا۔

"کیا بات ہے' کیا بات ہے؟" سپاہی وہاں آ دھمکے۔ وہ پانچ دس روپے کا چانس کیوں چھوڑتے۔

"چلو تھانے ——" ان میں سے ایک نے تو اس شرابی سکھ کو بازو سے پکڑ لیا جب کہ

دوسرے نے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے وہاں مزاحمت کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اتنے بھرے مجمع سے بھاگنے کے مواقع کم ہی ملتے ہیں اور چپ چاپ ان کے ساتھ سینما سے باہر کی طرف چل دیا۔ ہم لوگ سینما سے اب کوئی پندرہ بیس گز دور ایک سڑک پر آ گئے تھے جس سے ملحقہ آبادی نظر آ رہی تھی۔ اس اثناء میں دوسرے سپاہی نے اس سکھ سے اپنی "وہاڑی" کھری کر لی تھی جب کہ میرے والا کچھ زیادہ ہی نیک دکھائی دے رہا تھا۔

"چھوڑیئے مہاراج جی ہم کوئی لڑنے جھگڑنے والے لوگ ہیں' یہ تو خواہ مخواہ مجھ سے لڑائی مول لے رہا تھا۔" میں نے دس کا ایک نوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"لوئے رشوت دیتا ہے براہمن کی اولاد ——" اس نے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم تھانے میں ہوں گے' بہتر یہی ہے کہ یہاں ہی معاملہ صاف کر لیا جائے۔ میں سوچنے لگا' یہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کے علاوہ قریب گلی محلوں میں بھی غائب ہوا جا سکتا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر اپنی رفتار خاصی کم کر دی تھی —— دوسرا سپاہی اب ہم سے آٹھ دس گز آگے بڑھ گیا تھا۔

"تمہاری مرضی ——"

کہتے ہوئے میں نے تیزی سے پلٹا کھایا اور میرے بائیں ہاتھ کی کہنی اس تیزی کے ساتھ اس کی پسلیوں میں لگی کہ اس نے تڑپ کر میرا دایاں ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکے' میرے دوسرے بازو نے بھی یہی عمل دہرایا۔ اس کے ساتھ ہی میری اس کی کنپٹی پر لگنے والی زوردار لات نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اذیت کے مارے اس کے حلق سے اونچی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی' جب تک اس کا ساتھی اس کی طرف متوجہ ہوتا' میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو کر قریبی محلے میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔

شام کے قریباً سات بجنے کو تھے اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ قریبی محلے میں گھستے ہی میں نے اپنی رفتار کم کر دی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا دوسری طرف بنی سڑک پر پہنچ گیا جہاں سے ایک سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر "چوڑا بازار" آ گیا۔ یہ بازار ہماری لاہور کی انارکلی اور کراچی کی زیب النساء سٹریٹ جیسا تھا۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دوکان سے جب میں تھوڑی دیر کے بعد نکلا تو ایک معزز اور پڑھے لکھے ہندو کی طرح میں نے سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں بریف کیس پکڑا ہوا تھا۔ آشرم میں سوائے ایک کپڑے کے تھیلے کے جس میں ایک میلے کچیلے کپڑوں کا جوڑا رکھا تھا اور تھا ہی

کیا؟ اپنی چادر تو میں ساتھ ہی لے آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک بازار میں سرگشت کرنے کے بعد کچھ اور چیزیں بھی میرے بریف کیس میں منتقل ہو چکی تھیں اور اب میرے قدم ایک ایسے ہوٹل کی طرف اٹھ رہے تھے جہاں عموماً شرفا کا قیام ہوتا ہے اور ایسے ہوٹلوں پر پولیس شک کرنے کی جرأت کم ہی کرتی ہے۔

ooo

"بیبی ہوم" کے کاؤنٹر پر میرا استقبال ایک خوبصورت لڑکی نے کیا۔ اس نے پہلے سے چھپا ہوا ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا' جس میں تمام اندراج انگریزی میں کئے جاتے تھے۔ میں نے اپنے قیمتی قلم سے بڑی نخوت کے ساتھ اس پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچیں اور کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے بغیر پڑھے اسے رکھ لیا اور ایک مؤدب بیرا میرا بریف کیس اٹھا کر میری راہنمائی کرنے لگا۔

لڑکی کے جھکتے ہوئے آداب کہنے کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نپے تلے قدموں کے ساتھ بیرے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ایک شاندار اور سجے سجائے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ مؤدب ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ "Any More Service Sir" اس نے مڑنے سے پہلے پوچھا اور اس "مزید خدمت" کا مطلب مجھے بخوبی معلوم تھا۔ بھارت میں کسی نوجوان اور پھر ایسے نوجوان سے امید رکھنا جو اس قسم کے اعلیٰ ہوٹلوں میں قیام کرے کہ وہ رات کسی "ساتھی" کے بغیر بسر کرے گا' یقیناً معجزہ ہی تھا۔ اس لئے جواب میں جب اسے دس روپے کا نوٹ ٹپ کرتے ہوئے میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"No Thank You میں ویشنو ہوں۔" کہا۔

تو اس نے حیرانگی کے ساتھ میری طرف دیکھا' پھر واپس مڑ گیا۔ رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے میں ہی منگوایا تھا۔ چونکہ میں "ویشنو" تھا اس لئے میرے لئے کھانے کا مینو بھی بغیر میٹ والے کھانوں کا پیش کیا گیا تھا۔ رات دس بجے تک کا وقت میں نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں گزارا۔ میں زیادہ شرافت کا مظاہرہ کر کے اپنے متعلق کسی کو سوچنے کا موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہر قدم پر احتیاط درکار تھی۔ ابھی مشن شروع نہیں ہوا تھا اور پے در پے مصیبتیں آنے لگی تھیں۔ میں چوکنا اور بیدار تھا۔ قریباً ساڑھے گیارہ بجے تک میں اپنے کمرے میں لیٹا مطالعہ کرتا رہا' پھر صبح کو پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچتا سوچتا سو گیا۔

صبح میں نے تمام دروازوں کے پردے دوبارہ چیک کرنے کے بعد وہیں کمرے میں نماز ادا کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا مانگتا رہا۔

صبح کا ناشتہ میں نے ڈائننگ ہال ہی میں کیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے ٹارگٹ کی طرف جا رہا تھا۔ بلواڑہ ہوائی اڈے کی طرف ہوٹل سے میں عام شہری کے لباس میں ہی باہر نکلا تھا' لیکن ایک ویران سی جگہ اپنے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میں اب ایک دیہاتی کا روپ دھار چکا تھا۔ اپنے اصلی کپڑے میں نے اسٹیشن کے لاکر میں محفوظ کر دیئے تھے اور خود میں ایک سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر لاری اڈے پہنچ گیا تھا۔ لدھیانہ سے ایک بس کے ذریعے میں رائے کوٹ گیا۔ یہاں راستے میں میرا ٹارگٹ تھا۔ بس کی کھڑکی سے میں نے دیکھا' سڑک کے کنارے ہوائی اڈے کے صرف متعلقہ دفاتر تھے۔ اس کا ٹیکنیکل ایریا یہاں سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ دشمن نے اتنے بہترین اور منظم طریقے کے ساتھ اڈے کو کیموفلاج کیا تھا کہ بے اختیار اسے داد دینے کو جی چاہا۔ بہرحال ایک سرسری نظر سے میں نے حالات کا اندازہ لگا لیا۔

ooo

بس آگے نکل گئی۔ میں نے رائے کوٹ ٹھہرنا ہی مناسب نہ سمجھا اور جگراؤں اور ملاں پور ہوتا ہوا واپس لدھیانہ آ گیا۔ مجھے ہوائی اڈے کے اندر داخل ہونا تھا اور اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے' یہی سب سے اہم اور ضروری مسئلہ تھا۔ لدھیانہ میں قریباً" چار پانچ بجے پہنچا--- ایک معمولی سے ہوٹل میں کچھ کھانا کھایا اور چھ بجے ایک سینما ہال میں جا گھسا۔ یہاں ایک خاصی مزاحیہ فلم چل رہی تھی لیکن میرا خیال پردہ سکرین کی طرف کہاں تھا' میں تو اور ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے میں نے اپنے کپڑے حاصل کر لئے تھے اور اپنی معزز شکل اختیار کر لی تھی جب کہ دوسرے کپڑے میں نے دوبارہ لاکر میں رکھ دیئے تھے۔ کپڑوں کی تبدیلی کے لئے ایک مقامی تفریح گاہ کے ایک کونے میں مجھے بڑی شاندار جگہ میسر آ گئی تھی۔

سینما میں میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے میری ظاہری وضع قطع سے متاثر ہو کر مجھ سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے غیر ضروری جان کر کوئی خاص لفٹ نہ کروائی--- ہاف ٹائم کے وقت جب اس نے ایک بیرے کو آواز دے کر بوتل لانے کے لئے کہا تو مجھے اس کی زبان سے رائے کوٹ اور ملاں پور کے لوگوں کا مخصوص انداز جھلکتا دکھائی پڑا اور امید کی ایک کرن پیدا ہو گئی۔ "ممکن ہے یہ نوجوان میرے بنائے ہوئے منصوبے میں کہیں فٹ بیٹھ جائے۔" جیسے ہی بیرے نے اسے بوتل کھول کر دینا چاہی' میں نے بیرے کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

"ایک نہیں دو۔" میں نے بیرے سے کہا۔ نوجوان نے حیرانگی کے ساتھ میری طرف دیکھا

تو میں اس سے بات کرنے کا روادار نہیں تھا یا اب اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"شکریہ یار اصل میں ایک الجھن آن پڑی ہے ورنہ میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہوں۔" اسے دوسری بوتل تھماتے ہوئے میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں سر! الجھنیں بھی انسانوں کے لئے بنی ہیں اور اس کا حل بھی انسانوں ہی کے پاس ہے۔ شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔" اس نے میری ظاہری حیثیت سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"کہاں رہتے ہو' کیا شبھ نام ہے تمہارا؟" میں نے اس سے دونوں سوال اکٹھے کر دیئے۔

"رائے کوٹ میں رہتا ہوں اور پرکاش نام ہے میرا۔"

"ویل ڈن" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "میرا نام بھی پرکاش ہی ہے۔ پرکاش بھایہ' بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" میں نے واقعی خوشی کا مظاہرہ کر ڈالا۔ قدرت نے اسے میرے لئے غیبی مدد بنا کر جو نازل کیا تھا۔

فلم کے خاتمے تک ہم دونوں بڑے بہترین دوست بن چکے تھے۔ پرکاش رائے کوٹ کی ایک کھتری فیملی کا لڑکا تھا' لدھیانے میں ملازمت کرتا تھا اور یہاں ایک کرائے کے کمرے میں رہائش رکھتا تھا۔ ابھی تک میں نے ہی اس سے سب کچھ پوچھا تھا' اپنے متعلق سوائے اپنے نام کے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں اسے زبردستی اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آیا۔

"ہیپی ہوم" کے ڈنر نے اسے میرا اور بھی گرویدہ کر دیا۔ اپنے کمرے میں اس کے لئے میں نے ولایتی شراب کے دو بہترین پیگ منگوا لئے تھے۔ "تین سال تک اگر میں نے اسے چھوا بھی تو میں مر جاؤں گا' شاید تم یقین نہ کرو میں کینسر کی پہلی سٹیج سے زندہ واپس پلٹا ہوں۔" میں نے اپنے سلسلے میں معذرت کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"مہاراج جی میرے لئے ایسی خاص ضرورت بھلا کیا تھی؟" اس نے متشکرانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"تم میرے مہمان نہیں پرکاش میرے دوست بھی ہو۔ مجھے ہمیشہ اچھے دوستوں کی تلاش رہتی ہے' میں ایک الجھن میں گرفتار ہوں اسی لئے وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"

"آپ کچھ کہیے تو شاید....." اس نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

دراصل میں ایک خاص مشن پر یہاں آیا ہوں' ہمارے گھر ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکا ایئر فورس میں ملازم ہے' میں نے اس کی شکل ابھی نہیں دیکھی کیونکہ رشتہ گھر والوں نے میری غیر موجودگی میں کیا ہے۔ لڑکے کا نام اور رینک میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ آج کل

"بلواڑہ" ہوائی اڈے پر کام کر رہا ہے۔ میں نے دہلی میں اس کے متعلق ایک پریشان کن خبر سنی ہے جس کی تحقیقات کرنے آیا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس کی لاعلمی میں ہو جائے۔ اگر اسے پتہ چل گیا اور لڑکا بھی ٹھیک ہی نکلا تو خواہ مخواہ ایک اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔" میں نے بالآخر اپنے منصوبے کے مطابق ایک کہانی گھڑلی تھی۔

"ارے بس اتنی سی بات' میرا کزن وہاں کام کرتا ہے۔ رائے کوٹ کے کئی لڑکے وہاں ملازم ہیں ان کے ذریعے....."

"یہی تو سارا مسئلہ ہے میں صرف ایک قابل اعتماد آدمی چاہتا ہوں جو مجھے اڈے پر لے جائے اور اسے دور ہی سے دکھادے' باقی میں جانوں اور میرا کام۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اس فکر کو بالکل ذہن سے نکال دیں' کل آپ کا کام ہو جائے گا۔" اس نے بڑی محبت اور جوش سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"بہت شکریہ پرکاش میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

میں نے ہوٹل انتظامیہ کو اپنے کمرے میں ایک فالتو بیڈ لگانے کا آرڈر دے دیا تھا اور وہ رات پرکاش نے "نہ نہ" کرنے کے باوجود میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے وہیں بسر کی۔ اب ہم دونوں پکے دوست بن چکے تھے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ دنیا میں اتنے عظیم اور نیک انسان بھی پائے جاتے ہیں!

صبح پرکاش ناشتہ کرتے ہی چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی واپسی ہوئی' وہ کام سے چھٹی لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی رائے کوٹ روانہ ہو گئے۔ پرکاش کے گھر والوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نجانے اس نے میرے متعلق کیا کیا انہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ میرے آگے بچھے جا رہے تھے۔ ہر دوسرا پہلے سے بڑھ چڑھ کر میری خدمت کر رہا تھا۔ ہندو معاشرے میں پردہ نام کی کسی چیز کا تصور نہیں پایا جاتا۔ جلد ہی ہم سب آپس میں گھل مل گئے۔

شام تک میں اور پرکاش رائے کوٹ میں گھومتے رہے۔ اس اثناء میں' میں نے اردگرد کے علاقے میں قائم شدہ تنصیبات کا بخوبی جائزہ لے لیا تھا۔ پرکاش کے والد کی ایک کھٹارہ سی موٹر سائیکل تھی جس پر ہم رائے کوٹ کے اردگرد دیہاتی علاقے میں گھومتے رہے۔ موٹر سائیکل میں خود چلا رہا تھا اور جان بوجھ کر ایسے راستوں پر سفر کر رہا تھا جہاں موبائیل ریڈار سسٹم یا اینٹی کرافٹ گنز کی موجودگی کے امکانات زیادہ تھے۔ پہلے ہی مرحلے پر قدرت نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے اس انعام پر جو پرکاش کی صورت میں مجھ تک پہنچا تھا' میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پچھلے دو تین روز کی کلفت کلی طور پر ختم ہو گئی۔

دشمن کی اس علاقے میں نقل و حرکت میری نظروں کے راستے میرے ذہن میں محفوظ ہو چکی تھی اور اب کسی بھی وقت کاغذ پر منتقل ہو کر میرے ملک تک پہنچ سکتی تھی۔ دن بھر ہم نے جی بھر کر آوارہ گردی کی' شام کو اس کا کزن سالگ رام ڈیوٹی ختم کر کے گھر آ گیا۔ وہ ہوائی اڈے کی ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ پرکاش نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ میرا تعارف اس سے کروایا۔ اس کا غائبانہ تعارف مجھے پہلے ہی اچھی طرح حاصل تھا اور اس کی ہی نہیں بلکہ بھارتی نوجوانوں کی سب سے بڑی کمزوری میرے بریف کیس میں موجود تھی—— ولایتی شراب کی بوتل کی ایک جھلک نے اسے میرا تابعدار بنا دیا اور یہ جھلک میں نے ایک خاص طریقے سے اچانک بریف کیس کھولتے ہوئے اسے دکھائی تھی۔

"مہاراج جی شیش ورما نام کے دو تین آفیسر ہیں' آپ کچھ ان کے متعلق بتایئے۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"یار تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ اگر یہ اس سے واقف ہوتے تو خود ہی نہ چلے جاتے۔" پرکاش نے جو اس سے خاصا بے تکلف تھا' اسے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج جی میں باری باری سب سے کسی بہانے آپ کو ملا دوں گا' اپنے سبھی یار ہیں۔" اس نے ایک مخصوص انداز سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"شکریہ بھیا' تم نے تو میرے سر سے اچھا بھلا بوجھ اتار دیا ہے۔"

رات کو دونوں جی بھر کر شراب نوشی کرتے رہے' میرے متعلق گھڑا گھڑایا بہانہ پہلے ہی موجود تھا' اس لئے کسی نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔

رات میں نے رائے کوٹ میں پرکاش کے گھر پر بسر کی۔ اگلے روز سالگ رام تو صبح صبح اٹھ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا' ہمیں بعد میں آنے کے لئے کہہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ بھی اس کے پیچھے جا رہے تھے۔ گارڈ روم میں ہماری ملاقات سالگ رام سے کروائی گئی۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ ورکشاپ میں لے گیا۔ سالگ رام کی اپنے آفیسر انچارج سے گاڑھی چھنتی تھی' اس لئے کسی نے اس کی بات کا نوٹس نہ لیا۔ ہر جگہ اس نے میرا تعارف اپنے کزن کی حیثیت سے کروایا جو دہلی سے آیا تھا' جسے ہوائی اڈہ اور جنگی جہاز دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔

ہر کوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق مجھے اور پرکاش کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ قریباً" دو گھنٹے تک ہم ہوائی اڈے پر موجود رہے۔ اس اثناء میں' میں نے وہاں کی تمام جزئیات اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھیں۔ سارا ہوائی اڈہ میرے سامنے تھا۔ وہاں موجود ایک ایک چیز میری نظر میں تھی۔ ان کو دکھانے کے لئے دونوں شیش ورما سے متعلق میں نے تحقیق میں خاصی سرگرمی دکھائی تھی

اور ان لوگوں کو اپنے سچے ہونے کا یقین دلایا تھا۔

"اچھا یار بڑی مہربانی تمہاری' تیرے شیش ورما سے پھر کبھی مل لیں گے۔" میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"لو کے پرسوں تک کے لئے رام رام ——" اس نے مجھ سے بھی زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پرکاش کے ساتھ میں واپس آگیا۔ راستے کوٹ سے میں نے لدھیانہ اپنے ہوٹل کو فون کر دیا تھا کہ میں رات کو نہیں آؤں گا۔ ایڈوانس بکنگ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی مطمئن تھے۔ دو دن بعد اتوار تھا۔ اس روز سالگ رام کی بھی چھٹی تھی۔ میں اور پرکاش تو واپس لدھیانہ چلے آئے۔ سالگ رام کو میں نے اتوار کی بڑی زبردست دعوت دی تھی۔ وہ میرا "شکار" تھا جس پر مجھے ابھی محنت کرنا تھی اور جس سے بہت سارے کام نکلنے کی توقع تھی۔ قدرت کے اس انعام کو میں کسی بھی صورت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

لدھیانہ ہم شام کو پہنچے' دونوں سیدھے ہوٹل ہی گئے تھے' جہاں چائے پی کر تازہ دم ہو کر ہم شہر میں گھومنے چلے گئے۔ میں نے پرکاش کو چونکہ اپنے لمبے چوڑے بزنس کے متعلق ایک کہانی سنا رکھی تھی اور اسے یہی بتایا تھا کہ اب میری معروفیات صرف بزنس تک ہی محدود رہیں گی اور تین چار روز تک میں لدھیانہ سے اپنے بزنس کے معاملات طے کرنے کے بعد دہلی چلا جاؤں گا' اس لئے اس نے مجھ سے اگلے روز یعنی ہفتہ کے پروگرام کا نہیں پوچھا تھا۔

رات گئے میں ہوٹل پہنچا تو ایک "خوبصورت الجھن" میری منتظر تھی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر ایک شرمیلی دستک سنائی دی۔

"یس کم ان" میں نے ہشیار ہوتے ہوئے کہا کیونکہ ایسے ہوٹلوں میں اجازت کے بغیر کوئی دروازہ بھی نہیں کھٹکھٹایا کرتا۔ دروازہ کھلا اور ایک حوا زادی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اپنے جلو میں خوشبوؤں اور دعوت کا ایک طوفان لئے اندر داخل ہوئی۔

"شاکیجے روم نمبر ایک سو تیس ——" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر جگر پاش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں اب سنبھل چکا تھا' وہ نئی صورتیں تھیں یا تو وہ کوئی کال گرل تھی یا پھر سی۔ آئی۔ ڈی کی مخبر' کیونکہ ایسے ہوٹلوں میں پولیس یا انٹیلی جنس والے براہ راست مداخلت کم ہی کیا کرتے ہیں۔ زیادہ تر کام ایسی لڑکیوں ہی سے لئے جاتے ہیں۔ کچھ بھی تھا مجھے بہرحال اپنے رویے سے کسی شک کا اظہار نہیں کرنا تھا۔

"کمرے کا نمبر اس کے باہر لکھا ہے۔" میں نے بظاہر لاپرواہی کے انداز میں آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"او —— مجھے کیا بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گے؟" اس نے ادائے خاص سے میری طرف جھکتے ہوئے کہا اور میرا جواب سنے بغیر میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ابھی اس بات کا فیصلہ تو ہوا نہیں کہ آپ میری مہمان ہیں یا کسی اور کی۔" میں نے کہا۔

"مہاراج جی اب میں آ گئی ہوں تو اپنا مہمان ہی سمجھئے۔" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پرس بھی قریبی میز پر پھینک دیا۔

"آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"خواتین سے ایسے تو بات نہیں کی جاتی۔" اس نے اٹھ کر میرے قریب آنا چاہا۔

جان پہچان خاصی مشکل تھی۔ میرا حتمی رویہ بھی الجھن کا باعث بن سکتا تھا۔ میں بھارتی معاشرے کا نئے دور کا نوجوان تھا۔ مجھے بہرحال اپنے آپ کو اس ماحول میں رنگنا تھا ورنہ کچھ بھی ممکن تھا لیکن میرے مقصد اور مشن کی عظمت میرے راستے میں حائل تھی۔

"دیوی جی کرج کے لئے تو مجھے شما کیجئے' میں نے ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔ کاش آپ سے پہلے ——" میں نے خود آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج جی میں کسی کے وعدے کو خراب کیوں کروں لیکن ——"

"ہاں ہاں تمہاری شب تو بہرحال ہے۔" میں نے دس دس کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"تھینک یو ویری مچ۔" (آپ کے آنے کا شکریہ) میں نے بڑے احترام سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس کے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ooo

صبح اٹھ کر میں نے دوبارہ ہوائی اڈے کا رخ کیا۔ میرا مشن ابھی نامکمل تھا اور جس نوعیت کی اطلاعات مجھے درکار تھیں ان کے لئے مجھے اکیلے ہی جانا تھا۔ ہفتہ کی صبح ایک مرتبہ پھر میں ایک دیہاتی گھسیارے کے لباس میں ہوائی اڈے کی طرف جا رہا تھا۔ بس سے میں اڈے سے قریباً دو میل پیچھے ہی اتر گیا تھا۔ یہ فاصلہ میں نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ اس وقت میرا حلیہ اور شکل ایسی تھی کہ پرکاش بھی غور سے دیکھنے پر ہی پہچان سکتا تھا۔ میرے سر پر لمبی بالوں کی وگ اور بڑھی ہوئی شیو' ہاتھ میں پکڑی چارہ کاٹنے کی درانتی اور کھرپے کے ساتھ کندھے پر رکھی بیلی

پھیلی سی چادر اور تن پر میلے کپڑوں کی وجہ سے دیکھنے والا پہلی نظر ہی میں مجھے کوئی گھسیارا سمجھ کر نظر انداز کر سکتا تھا۔ بس کے سفر کے دوران میں آخری سیٹ پر ایک کونے میں جہاں اکثر کوئی بدقسمت سواری ہی بیٹھا کرتی ہے' سمٹ گیا—— اس کے باوجود سارے راستے مجھے بس میں سوار ہونے اور اترنے والوں کی غصیلی نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو میری شکل ہی اچھوتوں والی تھی' پھر اچھوت بھی نچلے درجے کا بھلا کوئی برہمن میرا بس میں سوار ہونا کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

بس کا کنڈیکٹر مجھے تمام راستہ گالیوں سے نوازتا آیا تھا—— یہ بات اپنے بزرگوں سے سنی تھی کہ ہندو بنیا جاتی کے لوگوں کو انسانیت کے زمرے میں شمار نہیں کرتے لیکن انسانوں سے انسانوں کا اتنا کرب ناک سلوک کہاں دیکھنے میں آتا ہے؟ ہندو معاشرے کے اس مکروہ ترین روپ کو دیکھنے کے بعد ان کے خلاف میری دلی نفرت دوچند ہو گئی۔

پنجاب کے اکثر علاقوں میں کچھ لوگ کھیتوں کے کنارے لگی گھاس کاٹ کر اسے قریبی منڈیوں میں یا پھر تانگے والوں کے ہاتھ فروخت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ میں اس وقت ایسے ہی لوگوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔

ہوائی اڈے کے گارڈ روم کے سامنے سے جو سڑک کے کنارے کچھ فاصلے پر بنا ہوا تھا' گزر کر میں کچھ آگے نکل آیا۔ میری بے چین نظریں گارڈ روم کے اردگرد پھیلے "انڈین ایریا" کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ ہوائی اڈے کے اردگرد ویسے تو چاروں طرف اینٹی کرافٹ گنیں نصب تھیں لیکن ایک جگہ خصوصی طور پر کچھ نئے قسم کا اسلحہ دیکھ کر میں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک یونٹ کے نزدیک کچھ فاصلے پر بنے کھیتوں کے کنارے لگی گھاس کاٹنا شروع کر دی۔ گھاس کاٹنے کا عمل صرف میرے ہاتھ انجام دے رہے تھے' میرا ذہن اور آنکھیں مکمل یکسوئی کے ساتھ اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔

وہ سرد جنگ کا دور تھا۔ آکاش وانی اپنے پروگراموں میں اکثر شور مچاتی رہتی تھی کہ پاکستانی جاسوس بھارت میں خاص طور پر مشرقی پنجاب' راجستھان اور جموں کشمیر کے علاقے میں گھس آئے ہیں' ان کی فلاں فلاں پہچان ہوتی ہے' کسی پر بھی شک گزرے تو قریبی پولیس اسٹیشن پر اطلاع کیجئے وغیرہ وغیرہ۔ اب صورت حال کچھ ایسی بنی تھی کہ ان تمام علاقوں میں خاص طور پر سرحدی اضلاع اور "دفاع" سے متعلق علاقوں میں لوگ خواہ مخواہ چوکنے ہو گئے تھے۔ آئے روز کسی نہ کسی فقیر یا ملنگ کی شامت آئی رہتی۔ پہلے تو انہیں پکڑتے ہی دھلائی مارنا شروع کر دیتے اور پولیس اسٹیشن جانے کی نوبت عموماً اس وقت آیا کرتی جب وہ اس بے گناہ کا مار مار کر

بھرکس نکال دیتے تھے۔

ہوائی اڈے کے اردگرد واقع دیہاتوں میں یہ دوا کچھ زیادہ ہی پھیل چکی تھی' گاڑی میں کسی اجنبی چہرے کو دیکھ کر اس پر جرح شروع کر دی جاتی۔ جب تک اس کا کوئی شناسا نہ نکل آئے اس کی جان نہ چھٹتی تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی حادثہ گزرا۔

میں اردگرد کے ماحول سے لاتعلق اپنے کام میں مگن تھا۔ وہاں موجود کسی فوجی جوان کو تو مجھ پر شک نہ گزرا۔ قریبی گاؤں کے دو سکھ جو سیکورٹی کے آدمی تھے' اس طرف آ نکلے اور مجھے ان کی آمد کا احساس اس وقت ہوا جب وہ میرے سر پر موجود تھے۔

فرار کی تمام راہیں پہلے ہی مسدود تھیں۔ چاروں طرف فوج ہی فوج—— سڑک پر ہوائی اڈے کے ملازمین کی آمدورفت جاری تھی اور میرے سر پر سیکورٹی کے دو افراد مسلط تھے۔

"کون ہو تم——؟"

"کیا کر رہے ہو——؟"

دونوں نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج جی مسکین آدمی ہوں' گھاس کاٹ رہا تھا۔" میں نے اپنی دانست میں انہیں مکمل جواب دے دیا۔

اس اثناء میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تھیلا میرے ہاتھ میں پکڑا تھا' جبکہ درانتی وہیں کٹی ہوئی گھاس کے پاس رکھی تھی۔

میرے ہاتھ میں تھیلے میں سوائے ایک کھرپی اور چادر کے اور کچھ نہیں تھا' لیکن ان دنوں جہاں آکاش وانی بھارتی عوام کو وارننگ دے رہی تھی وہاں بھارتی اخبارات نے بھی پاکستانی جاسوسوں کے متعلق عجیب عجیب افواہیں لوگوں میں پھیلا رکھی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم بات یہی بتائی جاتی تھی کہ جاسوسوں کے پاس تھیلوں یا ان کے کپڑوں میں خطرناک بم ضرور چھپے ہوئے ہوتے ہیں' ان سے ہوشیار رہیے۔

دونوں شاید مقامی سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی تھے جن کی ڈیوٹی ہوائی اڈے کے اردگرد دیہاتوں میں لگی تھی کہ مشتبہ لوگوں پر نظر رکھیں۔ مجھے مشتبہ سمجھ کر وہ چلے آئے تھے لیکن براہ راست ہاتھ ڈالنے کو تیار نظر نہیں آتے تھے۔ بھارتی ریڈیو اور اخبارات کا پروپیگنڈہ میرے کام آ گیا۔

"کہاں رہتے ہو؟" ایک نے پولیس کے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

"نگونڈی مہاراج جی۔"

"چل بھاگ جا یہاں گھاس کاٹنے کی اجازت نہیں۔" دوسرے نے مجھے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے آگے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسی مرضی آپ کی مہاراج جی۔" میں نے نیچ جاتی کے لوگوں کی طرح ہاتھ باندھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"ٹھہرو ـــــ" اچانک پیچھے سے آواز سنائی دی۔

ایک لمحے کے لئے تو مجھے دل سینے سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے امید تھی جب دوسری سمت پلٹوں گا تو ان کے ہاتھوں میں پکڑے پستول میرے استقبال کو موجود ہوں گے' لیکن خیریت گزری۔ انہوں نے شاید کوئی اور منصوبہ سوچ رکھا تھا۔

"یہاں بس نہیں رکتی' پیچھے بیٹھ جاؤ۔ وہ سامنے سٹاپ ہے وہاں سے سوار ہونا۔" اس نے اپنی سائیکل کے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیتے ہوئے تھوڑے فاصلے پر واقع گارڈ روم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس طرح غالباً ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ کوئی خطرہ مول لئے بغیر مجھے گارڈ روم پر ایئرفورس پولیس کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

یہاں سے اچانک بھاگنا زبردست بے وقوفی ہوتی۔ میں نے بادل نخواستہ ہتھیار ڈالتے ہوئے ہامی بھر لی۔ اس طرح کم از کم گارڈ روم تک مجھے کوئی ایسا موقعہ مل سکتا تھا جس سے میں فائدہ اٹھا لیتا۔

"دھنواد مہاراج جی۔" کہتے ہوئے میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دوسرا سی۔ آئی۔ ڈی والا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اپنی دہشت میں انہوں نے مجھ پر قابو پا لیا تھا۔ عام حالات میں' میں ایسے دس گدھوں کو ڈاج کر سکتا تھا لیکن ایسی صورت حال میں کوئی خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھا۔

"معجزہ کسے کہتے ہیں؟" اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا ـــــ لدھیانے کی طرف سے رائے کوٹ کو جانے والی بس آ رہی تھی' جب ہم بمشکل سڑک کے قریب پہنچے ہی تھے' میں نے اللہ کا نام لیا اور اسے رکنے کا اشارہ کر دیا۔ بس ڈرائیور نے بریک لگا دی۔ غالباً اس نے تین سواریوں کا لالچ کیا تھا' جیسے ہی بس رکی میں لپک کر اس میں سوار ہوا۔ یہ عمل کچھ اتنا اچانک اور تیزی کے ساتھ ہوا کہ دونوں سی۔ آئی۔ ڈی والے بھونچائے رہ گئے اور انہیں ہوش اس وقت آیا جب بس نے رفتار پکڑ لی۔ مجھے حسب توقع سب سے پچھلی سیٹ پر ہی جگہ ملی تھی۔ میں نے چلتی بس کے پچھلے شیشے سے نظریں باہر دوڑائیں' دونوں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی سائیکلیں پھینک کر "گارڈ روم" کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔

یہ بڑا "حساس ایریا" تھا۔ سیکورٹی کا جال چاروں طرف بچھا ہوا تھا ـــــ اگر وہ دونوں گارڈ

روم پر رپورٹ کر دیتے تو وائرلیس پر اگلی کسی بھی پوسٹ پر اطلاع پہنچنا چند سیکنڈ کی بات تھی' اس کے بعد میرا اس لاری میں موجود رہتے ہوئے بچ نکلنا ناممکن تھا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا ـــــ!

مجھے چند سیکنڈ کے اندر ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا' پھر میں فوراً ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ کنڈیکٹر میری طرف آ رہا تھا۔

"کہاں جائے گا؟" اس نے کراہت آمیز نظروں سے مجھے گھورا۔ غالباً مجھے بس پر سوار کر کے وہ پچھتا رہا تھا۔

"رائے کوٹ لالہ جی۔"

"نکال دو روپے۔"

"ایک روپیہ لے لیں لالہ جی' غریب آدمی ہوں۔" میں نے کھکھیاتے ہوئے کہا۔

"ابے تیرے غریب کی ایسی تیسی۔" اس نے مجھے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

بس اسی اثناء میں وہاں سے پانچ چار میل کے فاصلے پر مومن پور کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے حسب سابق بریک پر پاؤں رکھا اور کنڈیکٹر نے مجھے دھکا دیتے ہوئے نیچے گرا دیا۔ میں بمشکل سنبھل پایا' غصے کے مارے میرا خون کھول اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حیثیت کا احساس ہو گیا۔

میں بھارت کا ایک نیچ اچھوت تھا جس کے لئے ہندو معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔ سب کچھ میری توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ میں فوراً سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچا۔ بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے' جب میں نے جیپ کو انتہائی تیز رفتاری سے اس بس کے تعاقب میں جاتے دیکھا۔ میں بڑی پھرتی سے بڑے سے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ دونوں میں سے ایک گدھا بھی جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا ـــــ اور پچھلی نشست پر ایئرفورس پولیس کے مسلح جوانوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔

جیپ کے گزرتے ہی ایک بس آتی دکھائی دی اور چند منٹ کے بعد ہی میں لدھیانہ کی طرف واپس عازم سفر تھا۔ اس مصیبت کے ٹل جانے پر دل ہی دل میں شکر بجا لایا۔ ہلواڑہ سے کافی دور ایک سٹاپ پر میں اتر گیا۔ یہاں سے ایک ٹمپو کے ذریعے میں ایک دوسرے علاقے کی طرف جا نکلا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن میرے لئے بہت بڑا اور مضبوط قلعہ ـــــ!

اب کم از کم میری حالت اس قابل ضرور تھی کہ بھارتی سیکولر معاشرے میں مجھے بس کی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت مل جاتی۔ شام کو تھکا ہارا لدھیانہ پہنچا' اپنے مخصوص مقام پر کپڑے بدل

کر سیدھا پرکاش کے پاس چلا گیا۔ رات کو ہم دونوں اکٹھے ہوٹل پہنچے' پرکاش میرا بہترین Cover تھا اور ایسے غیر یقینی حالات میں جب کہ قدم قدم پر خطرات منہ کھولے کھڑے تھے' اس کی مدد حاصل کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے پرکاش سے بڑے گہرے تعلقات استوار کر لئے تھے اور چند دنوں کی دوستی میں ہی وہ مرحلہ آ گیا تھا جب پرکاش میری غیر موجودگی کو محسوس کرنے لگتا۔

○○○

میرے ذہن نے پرکاش سے متعلق ایک شاندار منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب میں اسی پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ دل ہی دل میں کئی مرتبہ میں نے اس منصوبے کا جائزہ لیا' اس کی تمام جزئیات پر نظر ڈالی اور اللہ پر ڈوری پھینک کر مطمئن ہو بیٹھا۔ اپنے منصوبے پر کام کا آغاز تو میں نے اس سے ملاقات کے ساتھ ہی کر دیا تھا لیکن اصل مرحلہ اب آیا تھا۔ میں نے شام سے ہی ایسی رونی صورت بنا رکھی تھی اور اس کی باتوں کے جواب میں اس طرح "ہوں' ہاں" کر رہا تھا کہ اس کا شک میں مبتلا ہونا ضروری ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کمرے میں رات کا کھانا کھاتے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں بس یونہی....." میں نے خواہ مخواہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یونہی' سیدھی طرح بات بتاؤ ورنہ....." اس نے چمچ پلیٹ میں رکھ دیا اور کھانے سے الگ ہو بیٹھا۔

"یار کچھ نہیں تم کھانا تو کھاؤ۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' جب تک بات نہیں بتاؤ گے نہیں کھاؤں گا۔" اس نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا یار کھانا شروع کرو بتاتا ہوں' تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور بتاؤں گا کسے۔" میں نے غمناک لہجے کی اتنی شاندار ایکٹنگ کی کہ خود کو داد دینے کو جی چاہا۔

میری گفتگو کے انداز نے غالباً پرکاش کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلا دیا تھا جو وہ چپ ہو رہا۔ کھانا ختم ہونے تک ہم نے کوئی گفتگو نہ کی۔ کھانا بھی دونوں نے بڑی بددلی سے کھایا تھا۔

"پرکاش میری زندگی کا ایک حصہ سفر کی نذر ہو چکا ہے' سینکڑوں لوگ ملے اچھے بھی برے بھی لیکن نجانے تم میں کیا بات نظر آئی ہے کہ....." میں نے کافی بناتے ہوئے گفتگو کے لئے تمہید باندھی۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد پرکاش مجھ پر مرمٹنے کے لئے تیار تھا۔ میری دردناک داستان نے اسے دوران گفتگو ایک مرتبہ رلا بھی دیا تھا۔

"میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھی' باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے بے پناہ ظلم ڈھائے' آج تک اس لئے گھر سے بندھا رہا کہ ایک سگی بہن بھی تھی' پچھلے ماہ وہ بھی مر گئی۔ اس نے اصل میں مرتے وقت مجھ سے وچن لیا تھا کہ میں کبھی شراب نہیں پیوں گا اب میرا باپ کے گھر میں کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔" اس کہانی کا پرکاش کے لئے سب سے بہترین حصہ میری دانست میں وہ تھا جہاں اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ "میں نے چوری چھپے پچیس تیس ہزار روپیہ اس برے وقت کے لئے جمع کر رکھا تھا اور اب میں چاہتا ہوں کہ کسی فیملی کا رکن بن کر لدھیانہ میں کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کر دوں اور میری نظر انتخاب اس پر ٹھہری ہے۔"

برے بھلے لوگ ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔ میں آج بھی جب ماضی پر نظریں دوڑاتا ہوں' پرکاش کے رویے میں مجھے لالچ کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس نے مجھے اس لئے نہیں اپنایا تھا کہ مجھ جیسا "دھنوان دھرم ویر" مل جانے سے اس کی کایا پلٹ جائے گی۔ کسی حد تک ممکن ہے اس فیصلے کے پیچھے یہ جذبہ بھی کارفرما ہو لیکن انسانی ہمدردی کے جراثیم اس میں کچھ زیادہ ہی پائے جاتے تھے۔

"پرکاش میرا اور بھائی نہیں ہے۔ بھگوان نے مجھے بھائی دے دیا۔" وہ شدت جذبات سے بے قابو ہو کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

میری خواہش پر وہ رات میرے پاس ہی ٹھہر گیا۔ ابھی رات کے دس ہی بجے تھے جب دروازے پر وہی مانوس دستک سنائی دی۔ پرکاش کو میں نے لیٹے رہنے کو کہا اور خود دروازہ کھول کر باہر آ گیا جہاں کل والی شریمتی جی موجود تھیں۔ اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلے' میں نے انگلی منہ پر رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اسے حیران و پریشان پکڑ کر راہداری کے ایک کونے میں لے گیا۔

"اپنی سالی قسمت ہی ایک دم پھوکٹ ہے۔" میں نے ایک مخصوص طبقے کا لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ہو گیا مہاراج؟" اس نے میرے نزدیک سرکتے ہوئے پوچھا۔

"سالا۔"

"کیا مطلب؟"

"سالے کا مطلب سالا ہی ہوتا ہے اور کیا ہو گا؟ کمبخت عین وقت پر آن مرا۔"

"سب چلے گا۔" اس نے توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"دماغ خراب ہے کیا' ان کے طفیل تو اپنا دال دلیا چل رہا ہے۔ اس سے بھی چھٹی کرواؤ گی کیا؟" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہے میں فوراً بولا۔

"کل تک کے لئے آخری مرتبہ معافی۔" میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

"کل کوئی بہانہ نہیں چلے گا ہاں ـــــ میرا روم نمبر ۱۰۱ ہے' وہاں چلے آؤ نا۔" اس نے جاتے جاتے مجھے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"اچھا اچھا اب رام رام۔" میں نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کی اور اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے چل دیا۔

میرے کمرے کے قریب ایک بے ہودہ اشارہ کر کے وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"کیا بات تھی بھیا؟ کون تھا؟" پرکاش نے پریشانی سے پوچھا۔

"تھی یار ایک بلا' بڑی مشکل سے جان چھڑائی کمبخت جان کو آ گئی تھی۔"

"اوہ" وہ بات سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"ہیپی ہوم" میں وہ میری آخری رات تھی۔

صبح اٹھ کر میں اپنے "والد" سے حساب بے باق کرنے اور اپنا پیسہ نکلوانے کے لئے اپنے شہر کو چل دیا اور پرکاش اپنے کام پر چلا گیا۔ میں نے تین روز کے بعد واپس آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

پونم

تین دن میں نے بھارت کے تین مختلف شہروں میں گزارے اور ان تین دنوں میں' میں نے گھوم پھر کر انڈین افواج کی نقل و حرکت کا بھرپور جائزہ لیا اور پونم چوتھے روز میں ایک نئے عزم کے ساتھ رائے کوٹ کی طرف عازم سفر تھا۔

وہ ہفتے کا روز تھا جب میں رائے کوٹ کے ایک محلے میں پرکاش کے چھوٹے سے گھر کے باہر لگی گھنٹی کا بٹن دبا کر کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ مجھے علم تھا کہ پرکاش اس وقت گھر پر نہیں ہو گا اور رات گئے وہ لدھیانہ سے آئے گا۔ اسے میری آمد کی خبر تو تھی لیکن اتنی جلدی میرے آنے کا علم نہیں تھا۔ میں دانستہ ایسے وقت آیا تھا تاکہ پرکاش کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں کے اپنے بارے قائم کردہ تاثرات کا میں خود اندازہ کر سکوں۔ اس سے پہلے اس کے گھر والوں سے ملاقات ہو تو چکی تھی لیکن سرسری سی۔

ہندو معاشرے میں چونکہ پردہ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی اور مشرق کی روایتی شرم و حیا کا کم از کم شہروں کی حد تک جنازہ نکل چکا ہے' اس لئے کسی بھی گھر میں کسی اجنبی کی آمد پر کوئی نہیں چونکتا۔

دروازے کے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی' میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا لیکن دروازہ کھلنے پر جس صورت سے سامنا ہوا' اسے دیکھ کر اپنا آپ تو کیا ایمان تک ڈگمگاتا محسوس ہونے لگا۔

"جی ـــــ؟" اس نے ایک خاص انداز سے اپنا ایک ہاتھ دروازے پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"پرکاش سے ملنا تھا۔" میرے منہ سے بمشکل ہی نکل پایا۔

"وہ تو نہیں ہیں۔" اس کی جھکی جھکی آنکھیں مختصر سے جواب کے ساتھ اٹھیں اور قیامت ڈھا گئیں۔

"ماتا جی ـــــ؟"

"چاچی؟" وہ تو ہیں! آپ کا شبھ نام؟" گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پرکاش! میرا نام بھی پرکاش ہے۔"

"شما کیجئے میں ابھی آئی۔" وہ اندر جانے کو مڑی اور قیامت کی چال چلتی سامنے لگے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ بمشکل ایک منٹ کے بعد ہی اس کی دوبارہ آمد ہوئی۔

"آیئے!" اس کا ایک ادائے خاص سے جھک کر اشارہ کرنا مجھے پھر تڑپا گیا۔ میں مسحور سا اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ گھر میں پرکاش کی ماں اکیلی ہی موجود تھی۔

"پاؤں لاگوں ماتا جی۔" میں ہندوانہ طریقے کے مطابق جھکتے ہوئے انہیں پرنام کیا۔

"جگ جگ جیو" ماتا جی نے مجھے ایسے پیار سے دیکھا جیسے وہ پہلے سے میری منتظر ہوں۔

"پونم' جل پانی کروا دو میرے بچے کو۔" انہوں نے اسی دشمن ایمان سے کہا جو ابھی تک مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ پونم ہے بیٹا' میری بھانجی ——— سالگ رام کو تو تم جانتے ہی ہو اس کی بہن۔ اور یہ میرا بیٹا ہے پرکاش بھایہ۔" دونوں کے تعارف کا مرحلہ بھی ماتا جی نے طے کروا دیا۔

"بہت آنند ملا ——— آپ سے جانکاری ہوئی۔" میں نے اس کے نمسکار کے جواب میں ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی۔" چاند چہرے کی چراغ آنکھوں نے لہروں پھونکا۔

پرکاش کے پتا ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنی سروس کی کمائی ان کے پاس پرکاش' ایک کھٹارہ سی موٹر سائیکل' چھوٹا سا مکان اور شاندار جیون ساتھی کی شکل میں موجود تھی۔ یہ تو علم نہیں کہ سیاست میں حصہ لینا انہوں نے کب سے شروع کیا تھا لیکن ان کی بیٹھک میں رکھی لاتعداد سرخ جلدوں والی کتابیں ان کے سوشلسٹ ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ رائے کوٹ کی مقامی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بھی تھے اور اپنا زیادہ وقت وہیں دفتر میں ہی گزارا کرتے تھے۔

ساتھ والے مکان میں ان کی سالی رہتی تھی۔ سالگ رام کی ماں جو بیوہ تھی' سالگ رام کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن تھی۔ پونم نے حال ہی میں ایف۔ایس۔سی میں داخلہ لیا تھا اور کالج پڑھنے کے لئے اسے روزانہ لدھیانہ جانا پڑتا تھا۔ رائے کوٹ میں ایک ڈگری کالج ضرور تھا لیکن وہاں سائنس کی کلاسیں نہیں لگتی تھیں۔ یہ دونوں کنبے آپس میں اس قدر مل جل کر رہتے تھے کہ ان کے ایک ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ سالگ رام کی تنخواہ اور اس کے سورگباش والد کی پنشن سے ان کی جیسی تیسی گزر رہی تھی۔ پونم زیادہ وقت اپنی آنٹی کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

مجھے علم نہیں کہ میری امارت کے قصے جو اس کے بھائی اور کزن نے دونوں گھروں کو بڑھا چڑھا کر سنائے ہوں گے۔ انہوں نے انہیں متاثر کیا یا پھر میری "درد بھری داستان" نے۔ ایک بات بہرحال عیاں تھی کہ جب اسے میری اصلیت کا علم ہوا تو میں نے اس کی گہری گہری بادامی آنکھوں میں اپنے لئے وہ جذبات موجزن دیکھے تھے جس کی توقع ایک رعمدل نوجوان لڑکی سے کی جا سکتی ہے۔

مجھے "جل پانی" پونم نے کروایا۔ یہ رعب حسن تھا یا میرا احساس کمتری کہ ابھی تک میں اس سے کھل کر بات نہ کر پایا تھا ——— اسے دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھ سے چھن گئی۔

وہ روایتی ہندو لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کی گفتگو کا مخصوص انداز' نپا تلا لہجہ اپنے دامن میں وہ مخصوص حیاداری اور رکھ رکھاؤ سمیٹے ہوئے تھا جو پنجاب کی روایتی مٹیاروں کے ہاں ملتا ہے۔

محبت میرے سلیبس حیات کا کوئی اختیاری مضمون تو تھا نہیں جسے میں اپنی مرضی سے رکھتا یا چھوڑ دیتا۔ میرے دل و دماغ میں ایک زبردست جنگ شروع ہو گئی' جس کا انجام بہرحال دل کی فتح کی صورت میں نکلا۔ مجھے اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ سانولے رنگ کی اس گہری آنکھوں والی لڑکی نے میرے دل و دماغ پر پہلی نظر میں بڑے گہرے اثرات مرتب کئے تھے اور رات کو پرکاش کی آمد تک اک آگ سی دل میں برابر لگی رہی تو میں نے اپنے شعور کی تمام تر گہرائی کے ساتھ اس بات کو قبول کر لیا کہ میں پونم کی محبت کا اسیر ہو چکا ہوں۔

اس اثناء میں ہمارے درمیان باتوں کے ایک دو دور ہو چکے تھے لیکن میرے مختصر سوالات اور اس کے مختصر جوابات نے شاید اسے بھی اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔

ooo

شام کو پرکاش آیا تو آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی خوشیوں میں مزید اضافہ ان خوبصورت قمیصوں نے بھی کیا تھا جو میں اس کے لئے لایا تھا۔ بابو جی کے لئے بنارسی دھوتی اور کرتے کے علاوہ ماتا جی کے لئے ایک قیمتی قدرے سادہ ساڑھی نے میرا مان خاصا بڑھا دیا۔ پونم سب کی خوشیوں کی اس طرح شرکت کر رہی تھی جیسے وہ بھی ہمیں میں سے ہو۔ میں نے پرکاش کے لئے خرید کیا ہوا لیونڈر سالگ رام کے لئے کہہ کر اسے سونپ دیا' لیکن میری چوری اس نے ہی نہیں پرکاش نے بھی پکڑ لی۔

رات کو باپو جی آئے تو مجھ سے یوں ملے جیسے کوئی اپنے سگے بیٹے سے ملتا ہے۔ میں نے بلوائے والے معاملے کے متعلق بتا دیا تھا" وہ میرے ڈیڈی نے زبردستی کی بلا میرے گلے ڈال دی تھی کہ میں اپنی سوتیلی بہن کے مگیتر کا جغرافیہ معلوم کرتا پھروں۔" میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میرے ماضی سے متعلق مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کریں' میں اب وہ سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہوں اور صرف اپنے حال اور مستقبل کے حوالے سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے پاس موجود ۲۰ ہزار روپے کیش کی صورت میں' میں نے باپو جی کی جھولی میں ڈال کر گویا انہیں لوٹ لیا تھا۔

"باپو جی! اگر آپ نے واقعی مجھے دھرم پتر بنا لیا ہے تو میری ہر چیز پر سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ ہم لدھیانہ میں چھوٹی سی پلاسٹک انڈسٹری لگا کر کام شروع کر دیں گے۔ پرکاش کو اس کام کا خاصا تجربہ ہے' میں اچھا میکینک ہوں اور سارا بھارت گھوم چکا ہوں۔ آپ کا آشیرباد حاصل رہا تو جلد ہم کسی قابل ہو جائیں گے۔" میں نے ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"بیٹا میں کمیونسٹ ہوں' مذہب پر یقین نہیں رکھتا' لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے پچھلے کسی جنم میں ہم سے کوئی اچھا کام ہوا تھا جس کا انعام پرماتما نے ہمیں تمہاری صورت میں دیا ہے۔ آج سے تم ہمارے سگے بیٹے کے سمان ہو' اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔" ان کی جذباتی حالت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔

سب نے مل کر میری آرتی اتاری اور ہم دھرم کے اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔

مکان کا ایک کمرہ جو دوسری منزل پر بنا تھا اور پرکاش کے زیر استعمال رہتا تھا مجھے الاٹ ہو گیا۔ میرا مختصر سا سامان وہیں رکھ دیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب واقعی وہ لوگ مجھے اپنا فیملی ممبر جاننے لگے تھے۔

ooo

رات کو سونے کے لئے لیٹا تو پونم اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے تصورات میں آن براجی۔ میرے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کا یارا مجھ میں نہیں تھا۔ میں پھر اسی کربناک کیفیت سے گزر رہا تھا جس کا شکار صبح بھی کئی گھنٹے رہا تھا۔ میرے سان گمان میں یہ بات بھی نہ آئی تھی کہ جاسوس کی زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آ سکتا ہے جب اسے اپنی تمام تر فطرتی اور محبتی بلائے طاق رکھ کر ایسے فیصلے قبول کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے ایک کومٹ منٹ ضرور کر لی کہ "پونم" کو اپنے فرائض کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دوں گا اور بس ـــــ اس سے زیادہ میرے لئے ممکن نہ تھا۔ اس فیصلے کے بعد

سکھ کی نیند سو گیا۔

صبح میری آنکھ مانجی اور پونم کی گفتگو کرنے کی آوازوں سے کھلی۔ پرکاش نیچے جا چکا تھا' وہ ہو بہو اپنے باپ کی کاپی تھا۔ مذہب سے بیزار اور اسی کیفیت کا شکار جس سے ہر بھارتی نوجوان گزر رہا تھا۔ معاشرتی ارتقا اور اس کو ملنے والے مذہبی تحفظ نے بھارت کی نوجوان نسل کو مذہب سے باغی کر رکھا ہے۔

مجھے سمجھ تو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن آواز کے سوز اور زیر و بم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پونم سوز و ساز کا حسین سنگم تھی۔ میرے کمرے میں سب سے پہلے وہی داخل ہوئی۔

"اٹھنے کا نہیں کیا؟" اس نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر خمکار کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ بڑی دیر ہو گئی۔" میں نے سرہانے رکھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ مندر نہیں جاتے؟"

"جب دیوی خود چل کر آ جائے تو کیوں جاؤں۔" مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرے کہنے کے فقرے سے وہ سٹ کر رہ گئی۔ حیا کی ایک سرخ لکیر نے اس کے گالوں کا احاطہ کر لیا۔

"چائے ابھی پئیں گے آپ یا نہاتے پر؟" اس نے جھینپتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"آپ کو دیکھنے کے بعد سب بھوک پیاس ختم ہو گئی' فی الحال تو آپ سے باتیں کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کو دل نہیں کر رہا۔ آپ کو دیکھ کر تجلے کیا ہو جاتا ہے۔"

"آپ تو ـــــ" وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر چلی گئی۔

میری یہ گفتگو ارادتاً تھی یا غیر ارادی' اس کا اندازہ میں نہ کر سکا۔ بس میرا جی چاہتا تھا میں پونم کو کسی نہ کسی طرح اپنے جذبات سے آگاہ کر دوں۔ اس کا ردعمل کیا ہو گا اس بات سے بالکل بے نیاز ہو کر۔ ہماری ملاقات دوبارہ ناشتے کی میز پر ہوئی۔ سب نے اکٹھے ہی ناشتہ کیا۔ پونم نے رسوئی سنبھال رکھی تھی اور زیادہ تر کھانا پکانا اسی کے ذمے تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اس کی سرگیں آنکھیں دو تین مرتبہ مجھ سے ٹکرائیں اور ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں پر پہلو بدل کر رہ گئے۔

اتوار چھٹی کا دن تھا۔ سانگ رام کو ایمرجنسی ڈیوٹی کی وجہ سے سینما میں بمشکل ایک چھٹی ملتی تھی ـــــ اس سے تو ملاقات نہ ہو سکی۔ باپو جی' پرکاش اور میں رات تک کھیلتے رہے۔

پرکاش نے اپنے دوستوں سے میرا تعارف کروا دیا تھا اور انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں وہیں رہوں گا۔ بابو جی کا چونکہ رائے کوٹ کے سیاسی حلقوں میں ایک مقام تھا' اس لئے سب نے بظاہر میرا خیر مقدم کیا۔ ہر ہندو نوجوان کی طرح پرکاش بھی شراب کو جزو لاینفک جانتا تھا۔ کم از کم چھٹی کے روز نہ پینا تو اس کے لئے دھرم بھرشٹ کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے البتہ معذرت کر لی' وہ ایک مقامی ہوٹل کو چل دیا اور میں اٹھ کر گھر آ گیا۔

دونوں بوڑھیاں محلے میں ہوئی ایک مرتبہ کے انتم سنسکار میں شرکت کرنے جا رہی تھیں' پونم البتہ رسوئی میں موجود تھی۔

"میں باتیں زیادہ کرتا ہوں' آپ برا تو نہیں مانتیں؟" میں نے موقع ملتے ہی دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" اس نے دوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تو بہت سی باتیں کر چکی ہوں کل سے اب تک۔ پھر آپ تو مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا' چنانچہ خاموش ہو گیا۔

دل کی نگری کا دستور بھی نرالا ہے' یہاں داخل ہونے والا پہلا سوار ہی اس کا مالک بن جاتا ہے۔ میری طرح پونم کے ساتھ بھی یہی حادثہ گزرا۔ میرے غائبانہ تعارف اور دو دن کی ملاقات نے ہی ہم دونوں کو ایک ان دیکھے' ان جانے لیکن دنیا کے مضبوط ترین رشتے میں جکڑ دیا۔ میری طرح وہ بھی نظریں نیچے کئے کھڑی تھی۔

سبزی دیر تک ہم دونوں کچھ نہ کہہ پائے' شاید ہم اس کیفیت سے گزرے تھے جہاں لفظ کھو جاتے ہیں اور جذبے زبان کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ایسی زبان جسے دل سے راہ ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی ——— میں بھی اپنے کمرے میں جا کر اپنی دھڑکنوں کا شمار کرنے لگا۔

شام کے وقت پرکاش آ گیا' پھر ماتا جی اور موسی جی بھی آ گئیں۔ سب نے کھانا اکٹھے ہی کھایا تھا۔ رات کو پرکاش' پونم' اس کا چھوٹا بھائی نپٹو اور میں فلم دیکھنے چلے گئے۔ ساری فلم کے دوران ہم دونوں ساتھ ساتھ سیٹ پر گم صم بیٹھے رہے۔ نہ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہوئی نہ مجھے بات کرنے کا حوصلہ پڑا۔ بمشکل ہم نے اس دوران میں پانچ چھ فقروں کا تبادلہ کیا۔

صبح حسب معمول پونم مجھے جگانے آئی۔ اسے علم تھا کہ آج ہم لدھیانے جائیں گے۔ اس نے میرے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ اشنان کرنے کے بعد ہم سب نے ناشتہ اکٹھے ہی کیا۔ رات کو بابو جی کے ساتھ تمام بات چیت طے پا گئی تھی۔ اب ہم نے عملی طور پر کام کا آغاز کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں آج میں اور پرکاش لدھیانہ جا رہے تھے۔ پونم چونکہ جلدی

جاتی تھی وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بھی روانہ ہو گئے۔

لدھیانہ کے ایک پرانے محلے میں پرکاش نے کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے اس علیحدہ حصے کے تینوں کمرے جو خالی تھے' حاصل کر لئے۔ پرکاش پلاسٹک کے جوتے بنانے والی ایک فرم میں سپروائزر تھا۔ اس نے میرے کہنے پر اسی روز نوکری پر "لعنت" بھیج دی۔ ہم نے دو تین مشینیں خریدیں اور وہیں سے کاریگروں کا بندوبست بھی کر لیا۔ پرکاش نے صرف دو چھوٹے چھوٹے لڑکے ملازم رکھے تھے۔ چار روز بعد جب ہم گھر واپس لوٹے تو باقاعدہ اپنا چھوٹا سا کارخانہ قائم کر چکے تھے۔ میں نے ایک کمرے کو سجا کر دفتر کا روپ دے دیا تھا اور باہر ایک خوبصورت بورڈ "پرکاش اینڈ پرکاش پلاسٹک انڈسٹری" کا لٹکا دیا تھا۔ فیکٹری کا اوگھاٹن (افتتاح) میں نے موسی جی اور ماتا جی کے ہاتھوں کروایا۔ سالگ رام چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے شرکت نہ کر سکا لیکن اس نے میرے لئے خاص طور سے شبھ کامنائیں (نیک تمنائیں) بھیجی تھیں اور شدت سے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس سے ملوں۔

بابو جی اور دوسرے سب لوگ کارخانہ قائم ہونے پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ پرکاش کی واقفیت نے کام کیا اور ہمیں شروع ہی میں بڑا تگڑا آرڈر مل گیا۔ ماتا جی اور موسی تو بار بار میری بلائیں لے رہی تھیں۔ میں نے ان کے "سوئے بھاگ" جو جگا دیئے تھے۔ شام کو سب لوگ واپس چلے گئے۔ اس اثناء میں مجھے پونم کے ساتھ گفتگو کا بہت کم موقعہ ملا۔ پرکاش اور میں وہیں رہ گئے۔ صبح کام شروع ہو گیا۔ پرکاش کام میں جتا رہتا۔ قریباً دس دن ہم نے خوب محنت کر کے آرڈر کے مطابق مال تیار کیا' پھر دیوالی کی چھٹیاں آ گئیں اور دیوالی منانے رائے کوٹ چلے آئے' جہاں پونم اپنی آنکھوں میں ہزار دیپ جلائے میری منتظر تھی۔

ooo

رائے کوٹ پہنچتے ہی میں نے سالگ رام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ہم قریباً شام کے وقت پہنچے تھے۔ راستے میں بلواڑہ پر ہی اتر گئے۔ گارڈ روم میں' میں نے خصوصی بندوبست اور انتظامات خاص طور پر نوٹ کئے تھے۔ ہوائی اڈے سے جاسوس کے فرار کے بعد وہ لوگ خاصے چوکنے ہو گئے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ خلاف معمول گارڈ روم پر سیکورٹی والوں نے پرکاش کے اور میرے علیحدہ علیحدہ کوائف لکھے تھے۔ سالگ رام کو بھی وہیں بلا لیا گیا' آتے ہی وہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا اور ہم دونوں کو ساتھ لئے اس جگہ آ گیا جہاں وہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میری بے تاب نظریں اس اثناء میں چاروں اطراف کا جائزہ لیتی رہیں۔ ایک ایک اہم چیز میرے ذہن میں نقش ہوتی جا رہی تھی لیکن اب تک میں اس مخصوص جگہ تک رسائی حاصل نہ کر پایا

تھا جہاں جائے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے پرکاش اور سالگ رام کے ساتھ گھوم پھر کر حالات کا بنظر غائر جائزہ لیا۔ ہم نے چائے بھی ایئر مینوں کے لئے مخصوص کنٹین سے ہی پی تھی۔

کنٹین میں موجود کارپورلز کی باہمی گفتگو اور ہوائی اڈے سے متعلق بحث نے میری معلومات میں خاصا اضافہ کیا۔ بظاہر تو میں ہنس ہنس کر سالگ رام اور پرکاش سے گفتگو کر رہا تھا لیکن میرا ذہن اور میرے کان پوری یکسوئی کے ساتھ وہاں موجود ایئر مینوں کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ یہاں وہ لوگ بھی موجود تھے جو مختلف ہوائی اڈوں سے یہاں ڈیپوٹیشن پر آئے تھے اور وہ اپنے اپنے سابقہ اڈوں پر کئے گئے پاکستانی کمانڈوز اور جاسوسوں سے بچنے کے لئے حفاظتی انتظامات بیان کر رہے تھے۔۔۔۔ اور ہر کوئی اس بات کا دعویٰ دار تھا کہ وہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی۔ میں دل ہی دل میں ان کی خوش فہمی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

شام کو سالگ رام کی ہوائی اڈے کی کنٹین سے خرید کردہ چار عدد رم کی بوتلیں اپنی بغل میں دبائے ہم تینوں اکٹھے ہی واپس آئے تھے۔ سالگ رام کو اگلے روز دیوالی کے لئے بمشکل چھٹی ملی تھی۔ میں نے اور پرکاش نے اس کے آفیسر انچارج سے جو ایک سکھ تھا' بڑی عاجزی سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے دیوالی کے لئے کم از کم گھر جانے دے کیونکہ اس کی منگیتر آئی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کم از کم پانچ چھ مہینے ملاقات کا کوئی چانس نہیں۔ وہ لوگ آسام واپس چلے جائیں گے۔ یہ بہانہ بھی میری ذہنی اختراع تھی۔ جب سالگ رام کو اس کے افسر نے چھٹی کی منظوری کا حکم نامہ دیا تو وہ خوشی کے مارے مجھ سے لپٹ گیا۔

"تم تو یار بڑے کام کی چیز ہو۔" اس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

گھر والوں نے جب سالگ رام کو بھی ہمارے ساتھ دیکھا تو موسی جی اور پونم کی تو خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ سالگ رام اور پرکاش نے اس کارہائے نمایاں کو میرے سر منڈھا تو موسی جی نے مجھے آشیرباد دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا میں ہمیشہ یہی چاہا کہ سالگ رام فوج کی نوکری نہ کرے' لیکن اپنے لکھ کی بات ہے۔ تم ہی بتاؤ بیٹا جنگ لگ گئی تو اس موئی حکومت کو کیا ملے گا۔ نجانے ان کی ہوس کب ختم ہو گی' کتنے ماؤں کے لال مریں گے تو ظالموں کے کلیجے ٹھنڈے ہوں گے۔"

موسی جی کا دکھ سارے بھارت کی ماؤں کا دکھ تھا لیکن المیہ یہ ہے کہ حکومت نے کبھی اسے محسوس ہی نہیں کیا یا اگر کیا تو اپنی ہوس ملک گیری کے آگے اس کی کوئی حیثیت نہ جانی۔ مجھے فوجی ملازمین ہی نہیں سویلین سے بھی گفتگو کا اتفاق ہوتا رہتا تھا اور یہ بات کم از کم پنجاب کی حد تک تو میں نے شدت سے محسوس کی کہ بھارتی عوام اب جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ

پاکستان سے ہرگز لڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن حکومت انہیں لڑانے پر تلی ہوئی تھی اور دن رات اسلحہ کے انبار چھاؤنیوں سے سرحدوں کی طرف منتقل کئے جا رہے تھے۔

میں نے پچھلے تین چار روز سے شیو نہیں کی تھی اس کے پس پردہ بھی ایک خاص مقصد کار فرما تھا۔۔۔۔ ہماری بس جب رائے کوٹ میں داخل ہو رہی تھی تو میں نے ایک مخصوص قسم کے میزائل بردار آرمی کنوائے کو وہاں سے گزرتے دیکھا۔ ایک بے چینی سی تب سے میں محسوس کر رہا تھا۔ ان میزائلوں کی ساخت اور وہ جگہ جہاں انہیں نصب کیا جاتا تھا ان سے متعلق معلومات حاصل کرنا میرے لئے بہت ضروری تھا۔ اب میں اس فکر میں تھا کہ جلد از جلد ان کا پتہ لگاؤں۔ یہاں پہلے سے ہی آرمی کے کچھ یونٹ ڈیپلائے تھے اور شہر میں افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ فوج نے وہاں موبائل ریڈار سسٹم قائم کر رکھا ہے۔

ooo

آج دیوالی کی رات تھی۔ سارا بھارت شراب میں غرق تھا۔ آج کی رات سے فائدہ نہ اٹھانا انتہائی بے وقوفی ہوتی۔ سالگ رام اور پرکاش کو میں نے ٹرخا کر ان سے جان چھڑالی تھی اور انہیں ایک مشترکہ دوست کی محفل بلو نوش میں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ آدھی رات سے پہلے ان کی واپسی ناممکن تھی۔

"ارے آپ کیا دیوالی بھی گھر پر ہی منائیں گے؟" پونم نے پوچھا۔

"بیٹا جی آج تو خیر سے تمہارے بابو جی بھی خوش ہیں۔" ماتا جی نے بابو جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو مٹھائی کے ڈبے پکڑے اندر داخل ہو رہے تھے۔

"پونم بیٹے یہ ڈبہ لے لو اور دوبے جی کے گھر دے آؤ۔" انہوں نے پونم کو ڈبہ تھماتے ہوئے کہا۔

"آپ چلئے نا میرے ساتھ۔" پونم نے مجھ سے کہا۔

"ہاں بیٹا اسے بھی گھما لاؤ۔" موسی جی نے مجھے کہا۔

ان لوگوں کا خیال تھا چونکہ میں پہلی دیوالی گھر سے باہر منا رہا ہوں' اس لئے اداس ہوں۔

"آؤ چلتے ہیں۔" میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

تھوڑی دیر بعد بابو جی کی کھٹارہ سی موٹر سائیکل جسے اب ہم نے خاصی بہتر شکل دے رکھی تھی' مجھے اور پونم کو اڑائے لئے جا رہی تھی۔ دوبے جی کا گھر اتفاق سے اسی سڑک کے نزدیک والی آبادی میں تھا۔ پونم تو اندر چلی گئی' میں اس کے بضد ہونے کے باوجود نہ گیا۔

"جلدی آنا۔" میں نے جاتے جاتے کہا۔

"کیوں؟" اس نے اک ادائے دلربانہ سے مڑتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں بھگا کر لے جانا ہے۔"

"پھر تو ابھی آئی۔" کہہ کر وہ چلی گئی۔

جوں جوں شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دیوالی کی تقریب اپنے عروج پر پہنچ رہی تھیں۔ پانچ چھ منٹ تک میں بچوں کی آتش بازی سے لطف اندوز ہوتا رہا' پھر پونم آ گئی۔

"چلئے شریمان جی' ہم بھی دیکھیں آپ کے تیور۔" اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس مرتبہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہنا۔" میں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"باتیں کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" اس نے میری پیٹھ پر ہلکی سی دھول جماتے ہوئے کہا۔

"اور موضوع بدلنا تم سے۔" میں نے گردن موڑتے ہوئے کہا۔

اپنے فقرے کا خوشگوار ردعمل میں اس کے چہرے پر دیکھ تو نہ سکا لیکن میرے کندھے پر رکھے اس کے خوبصورت ہاتھوں کی لرزش سے محسوس ضرور کر لیا۔

"کہاں کے ارادے ہیں مہاراج؟" اس نے مجھے ایک ویران سڑک پر موڑ کاٹتے دیکھ کر پوچھا۔

"انہونی ہونے والے شور نہیں مچایا کرتے۔" میں نے دور سے نظر آتے آرمی کے بڑے بڑے وہیکلز پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ولہ جی یہ خوب دھونس ہے یعنی گردن بھی کٹوایئے اور مرحبا بھی کہیئے۔"

موٹر سائیکل میں نے روک دی' سامنے ایک خوبصورت سی پہاڑی نظر آ رہی تھی جو پکنک سپاٹ ہی تھی لیکن یہ عجب بات کہ وہاں کوئی نظر نہ آتا تھا' شاید آرمی کے یہاں ڈیرے ڈالنے کے بعد یہاں لوگوں کی آمدورفت ممنوع ہو چکی تھی۔ سردی اپنا جوبن دکھا رہی تھی۔ پونم نے کندھے پر رکھی شال کو مضبوطی کے ساتھ اپنے جسم پر لپیٹ لیا تھا۔ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اسی طرف چل دیئے' جہاں تفریح گاہ کے نزدیک مجھے آرمی کے وہیکلز نظر آ رہے تھے۔ غالباً" وہ لوگ بھی دیوالی کی وجہ سے شغل مے نوشی میں مصروف تھے' شاید اسی لئے ہمیں ان کے اردگرد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک پر لگی لائٹس کہیں کہیں روشن تھیں' زیادہ تر بلب خراب تھے۔

"پونم تمہیں معلوم ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیوں؟ تم نے پوچھا کیوں نہیں؟" میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"پرکاش بابو بسا اوقات مجھے بھی تمہاری کسی حرکت کا مطلب سمجھ نہیں آتا' مجھے تو کبھی کبھی تمہارے ہندو ہونے پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔" میرا دل اچانک اس کے اس فقرے پر دھڑکا۔ پونم نے ایک لمبا سانس لیا اور دوبارہ بولی "تم میں ان لوگوں جیسی بات ہے ہی کیا' میں شراب سے اتنی نفرت کرتی ہوں' جتنی مجھے یم راج (شیطان) سے ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے تم ہندو نوجوان ہو اور شراب نہیں پیتے۔ تم نے ابھی تک مجھے کسی غلط حرکت کے لئے نہیں کہا' جب کہ ہمارے معاشرے میں محبت کا آغاز ہی ایسی گھٹیا حرکتوں سے ہوتا ہے یا تو تم اگلے جنم کے کوئی اوتار ہو جو مانش کے روپ میں پرگٹ ہو کر آ گیا یا پھر....."

"گدھا ہوں جسے خوبصورت لڑکیوں سے ڈیلنگ کرنا نہیں آتی۔" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اس کا فقرہ اچک لیا۔

"بہرحال پرکاش بابو جب کوئی ناری کسی سے پیار کرتی ہے تو اسے اپنا شریر ہی نہیں اپنی آتما بھی سونپ دیتی ہے۔ مجھے نجانے پچھلے کتنے جنموں سے تمہاری تلاش تھی' میرا آئیڈیل ایسا ہی تھا الجھا الجھا' سب سے الگ تھلگ' جس روز پہلی بار میں نے تمہاری دستک پر دروازہ کھولا تھا تو تم ہمارے گھر میں ہی نہیں بلکہ کھلے کواڑوں کے راستے میرے دل میں آن بسے تھے' میری تلاش مکمل ہو گئی۔ میرا دھرم ہے پرکاش بابو کہ تم کبھی میرا وشواش گھات نہیں کرو گے۔"

پونم کا لہجہ بڑا پراعتماد تھا' میں نے اس کی باتوں کا جواب نہ دیا۔ وہ واقعی عجیب و غریب قسم کی لڑکی تھی—— ہم دونوں اب ان وہیکلز کے قریب سے گزر رہے تھے۔

سڑک کے کنارے آرمی نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ یہ سڑک ایک قصبے کو جاتی تھی لیکن آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی—— ہم دونوں سڑک کے کنارے لگے خوبصورت باغ میں ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئے۔

چڑھتے چاند کی رات تھی' سامنے کا منظر بخوبی نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے راستے وہیکلز پر لدے سامان اور وہاں پہاڑی کے ایک طرف نصب ریڈار کے انٹینا کی پیٹ دماغ پر نقش ہو رہے تھے۔ یہ نئی قسم کا اسلحہ تھا۔ مجھے خوشی تھی' میں نے ایک خفیہ ہتھیار کا جو بھارتی فوج کے تصرف میں ہے کھوج لگا لیا تھا لیکن حیرانگی ہو رہی تھی کہ آخر اتنی اہم چیز کو اتنے غیر حفاظتی اور ناقص انتظام کے ساتھ نصب کرنے کی کیا تک ہے؟

پھر میرے دماغ نے اس سلسلے میں راہنمائی کی اور میں انڈین آرمی انٹیلی جنس کی چال سمجھ گیا۔ ایمرجنسی ہونے کی وجہ سے چونکہ تمام آرمی کے نشانات وغیرہ تو ملی سے چھپے ہی ہوتے ہیں' اس کے علاوہ بھی ان حالات میں کمز کو بہت اچھی طرح کیمو فلاج کیا جاتا تھا۔ اگر ان کے

گرد خاص پہرہ بھی لگا دیا جاتا تو اس علاقے میں موجود دشمن انٹیلی جنس کو شک ہونا لازمی تھا۔ شاید اسی لئے انہوں نے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ اگر میں بھی ہتھیاروں کی خاص قسم کی ساخت پر غور نہ کرتا تو اسے انڈیا کی روایتی فوج کی کوئی بٹالین سمجھ کر نظر انداز کر دیتا۔

"تمہیں پا کر میں نے بہت کچھ پا لیا ہے پونم!" مجھ سے خوشی چھپائی نہ جا سکی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں' اب ظاہر ہے آپ فلمی ڈائیلاگ ہی بولیں گے۔" پونم کی ہنسی سے فضاؤں میں سریلی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

ہم واپس موٹر سائیکل کی طرف آ رہے تھے جب اچانک ہمارے پیچھے روشنی کا ایک طوفان سا اٹھا۔ یکدم میں نے پونم کا ہاتھ پکڑ کر کنارے کی طرف کھینچا تو وہ مجھ سے ٹکرا گئی۔ ہم دونوں پر ہی اس ٹکراؤ نے قیامت ڈھا دی تھی' ابھی اس حادثے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک جیپ قریب آ کر ٹھہر گئی۔ جیپ میں ایک سارجنٹ اور دو سپاہی بیٹھے تھے۔ شاید ہمیں مشتبہ جان کر آ گئے تھے۔

"سنئے مہاراج۔" سارجنٹ غالباً ہماری اصلیت جان گیا تھا۔

"سنایئے مہاراج۔" میں نے اسی لہجے میں قدرے شوخی سے جواب دیا۔ میرے دل کی حالت خدا ہی جانتا ہے۔

"اس سے یہاں آپ کی موجودگی اور دیوالی رات کی حسین رات تو ٹھیک ہے' لیکن یہ ماحول پریم کرنے کے لئے سازگار نہیں۔" اس نے پہلے پونم کی طرف اور پھر سامنے لٹری کنوائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لو بھائی ڈیئر آفیسر! چھوٹا سا تو شہر ہے۔ یقین مانئے کوئی گوشہ بھی تو خالی نہیں ملا۔ محبت کے مارے یہاں چلے آئے تھے لیکن کیا معلوم تھا کہ یہاں بھی....." میں نے بڑے سوگوار اور فلمی انداز میں جواب دیا۔

"اس مداخلت کے لئے شاید کیجئے' میرا ٹینٹ حاضر ہے۔" وہ بھی کوئی محبت کا مارا دکھائی دے رہا تھا۔

"دھن دلو آپ کا مہاراج اب تو چلنا ہی چاہیے۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیوالی مبارک" کہتے ہوئے اس نے جیپ دوبارہ سٹارٹ کر دی۔

"دیوالی مبارک" ہم دونوں نے بھی ایک ساتھ ہی کہا۔

"گدھے کا بچہ" میں نے اس کے جاتے ہی کہا۔ "کمبخت نے اسی وقت آنا تھا۔"

"شکر کرو کوئی اچھا آدمی تھا ورنہ دیوالی کسی تھانے میں مناتے۔" پونم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ساتھ ہو تو میں نرک میں بھی جانے کو تیار ہوں۔" میری بات پر پونم بے اختیار ہنس دی اور فضاؤں کا حسن دوچند ہو گیا۔

خاصی دیر تک ہم رائے کوٹ میں مختلف جگہ دیوالی کی رات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سارا شہر شراب کے نشے میں دھت تھا۔ سڑک پر دو تین مرتبہ ہمیں نوجوان لڑکوں نے گھیرا اور فحش فقرے کس کر جانے کی اجازت دی۔ ایک مرتبہ تو میرا خون کھولا لیکن پونم نے مجھ سے وچن لیا تھا کہ میں لڑائی جھگڑا نہیں کروں گا۔ عجب طوفان بدتمیزی چاروں طرف بپا تھا۔ لوگ سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر ہوائیں مار رہے تھے۔ فضا میں چاروں طرف آگ ہی آگ پھیلی نظر آتی تھی۔ بچے بوڑھے جوان سب ہی آگ سے کھیل رہے تھے۔ شہر کے باہر سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم لوگ گھر پہنچے۔

"اگر سارا بھارت پاگل ہو گیا ہے تو کیا میں بھی کنویں میں چھلانگ لگا دوں۔" انہوں نے ماتا جی سے کہا۔

"ہرے رام' ہرے رام آج تو پرماتما کو یاد کر لو۔ ایک دفعہ سارے جیون میں مندر کی شکل نہیں دیکھی۔ پنڈت کا بیٹا اور ایسی ایسی باتیں۔"

ماتا جی اور باؤ جی کی خوشگوار بحث بڑی پرلطف ہوتی تھی۔ "دیکھی تھی ایک مرتبہ جب تمہارے ساتھ بھاگ کر شادی کی تھی اور آج تک بچتا رہا ہوں۔" انہوں نے ہنستے ہنستے کہا۔

"بچوں کے سامنے ہی کوئی شرم کر لیا کرو۔" ماتا جی نے موسی جی کے پیچھے باہر جاتے ہوئے کہا۔ نیٹو اور پونم بھی ان کے ساتھ ہی باہر چلے گئے۔ دیوالی کی رات مندروں میں خاصی پوجا پاٹ ہوتی تھی۔ اب آدھی رات سے پہلے ان کی واپسی ناممکن تھی۔ پرکاش اور سالگ رام بھی تھوڑی دیر بعد آ گئے اور مجھے ساتھ لے کر چلے گئے۔ میں تو تقریباً" گھنٹہ بعد ہی کھسک کر گھر آ گیا کیونکہ ایسی لغویات میں اس سے زیادہ حصہ میں نہیں لے سکتا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور ہوائی اڈے کے اس خاص حصے کے متعلق سوچنے لگا جو ابھی میری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ وہاں پہنچنے کا خطرہ مول لئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا' میں نے پونم کی محبت کو اپنے فرائض کے درمیان دیوار نہیں بننے دیا تھا۔ کام بڑی اچھی رفتار کے ساتھ محفوظ طریقے سے انجام پا رہا تھا اور میں اپنے وطن کے لئے بھارتی انٹیلی

جنس کے بچھائے جال کو توڑ کر اہم اطلاعات حاصل کر رہا تھا۔ یہ اطلاعات میرے وطن بڑی حفاظت اور عجلت کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔

دیوالی کی رات کسی کو سونا قسمت سے ہی نصیب ہوتا ہے کیونکہ ساری رات پٹاخوں کی آوازیں جان کو آئی رہتی ہیں لیکن میری آنکھ صبح جلد ہی کھل گئی۔ چاروں طرف شور برپا تھا۔ اردگرد کے وہ مندر اور گردوارے جہاں سوائے پجاری کے اور کوئی گھسنے کا بھی نہیں لیتا تھا وہاں سے بھی گھنٹوں کے پردے پھاڑ دینے والی بھجوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کے لوگ ساری رات جاگتے رہے تھے اور آتشبازی بھی مسلسل ہو رہی تھی۔

"دیوالی مبارک" صبح پونم نے پرکاش کا اور میرا کمبل اٹھا کر ایک کونے میں پھینکتے ہوئے کہا۔

ooo

دیوالی آئی بھی اور گزر بھی گئی۔

---- پونم کی کوئی بات میرے لئے اور میری کوئی بات بظاہر اس کے لئے پرائی نہیں تھی' ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اس اشنا میں اچھی طرح جان لیا' پہچان لیا تھا---- اکٹھے جینے مرنے کے پیمان باندھ لئے تھے۔ مجھے اس کے کالج اور دوران تعلیم فارغ پیریڈز کا پورا پورا علم ہو چکا تھا۔ پونم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں لدھیانہ میں اسے روزانہ ملا کروں گا۔

دھوپ اور چھاؤں

لدھیانہ پہنچنے کے دوسرے ہی روز ایک پیغام میرا منتظر تھا اور اب میں ایک اہم مشن پر بٹالہ جا رہا تھا۔

بٹالہ سرحدی علاقہ ہے۔ یہاں سے گرفتار ہونے والے غیر ملکیوں کو گورداسپور جیل میں رکھا جاتا تھا جہاں سے وہ لوگ تاریخ پیشی بھگتنے کے لئے بٹالہ آتے تھے۔ ہمیں اپنے ایک اہم ساتھی کو پولیس کی حراست سے آزاد کروانا تھا۔

دشمن ملک کی بھری پری کچہری میں سے اپنے کسی ساتھی کو اغوا کر کے لے جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا جس میں موت کی جیت کے امکانات زیادہ ہی روشن دکھائی دیتے تھے---- اس سلسلے میں اپنے مقامی دوستوں کی مدد حاصل کرنا ضروری تھا۔ میں نے پرکاش کو یہی بہانہ کیا تھا کہ مال کا آرڈر وصول کرنے یو-پی کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ انتہائی معقول بہانہ تھا جس کی آڑ میں مجھے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا تھیں۔

میں اپنے طے کردہ پلان کے مطابق بٹالہ آ گیا۔ یہاں مجھے اپنے ایک دوست سے جو میرے ملک کی انٹیلی جنس کا خاص آدمی تھا' ملاقات کرنا تھی۔

کسی بھی جاسوس کے لئے دوسرے ساتھی جاسوس سے "ملاقات" بڑا جان جوکھوں کا کام ہے' کیونکہ وہ شخص حال ہی میں سرحد پار کر کے آیا ہوتا ہے اور اس بات کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے کہ وہ کہیں دشمن انٹیلی جنس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ اگر دشمن کسی ایسے شخص کو قابو کر لے جو ان کے ملک میں سکونت پذیر اپنے ساتھی کا کوئی پیغام وصول کرنے جا رہا ہے تو وہ ان کے لئے خصوصی تحفہ ہوتا ہے کیونکہ اس شخص کے ذریعے وہ پہلے سے ان کی سوسائٹی کے کافی اندر تک گھس کر محفوظ ہو جانے والے جاسوس تک جا پہنچتے ہیں۔ اول تو انٹیلی جنس کا تفتیش کا طریقہ ہی اتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر گرفتار شدہ شخص ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اپنے ساتھی کا پتہ بتا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا خطرہ ڈبل ایجنٹوں کا بھی ہے جو دنیا کی قریباً" ہر انٹیلی جنس میں پائے جاتے ہیں اور تھوڑے سے انعام کے

لالچ میں اپنے ساتھی کو گرفتار کروا دیتے ہیں۔

میں بجائے اس جگہ جانے کے جہاں مجھے اپنے ساتھی سے ملنا تھا' بٹالہ کے لاری اڈے پر چلا آیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے' صرف اس خاص نشانیوں سے میں نے اسے پہچان کر اس سے پیغام وصول کرنا اور مل کر منصوبہ بندی کرنی تھی۔ قریباً" ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد مجھے بالآخر وہ ایک سرحدی علاقے کی طرف سے آنے والی بس میں سے اترتا نظر آیا۔ کافی محتاط آدمی تھا' خاصا چوکنا نظر آ رہا تھا۔ بس سے اتر کر اس نے بجائے ادھر ادھر اجنبیوں کی طرح دیکھنے کے چپ چاپ اپنی راہ لی۔

بس کے اردگرد فوراً" دو تین سیکورٹی والے اکٹھے ہو گئے تھے لیکن کیا مجال جو اس پر کسی کو ذرہ برابر بھی شک گزرا ہو۔ نووارد درمیانی عمر اور مضبوط جسم کا مالک ایک بوٹے سے قد کا آدمی تھا۔ میں نے بس سے اترتے ہی اس کا تعاقب شروع کر دیا لیکن لاکھ چالاک ہشیار اور میرے ہی ملک کا تربیت یافتہ ہونے کے باوجود اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ قریباً" دس پندرہ منٹ تک میں اسی چکر میں رہا کہ مبادا کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے تو نہیں یا پھر انڈین انٹیلی جنس والے اسے میرے لئے بطور "چارہ" استعمال تو نہیں کر رہے۔ ابھی ہماری ملاقات کے وقت میں دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ نووارد لاری اڈے پر بنے ایک چائے کے سٹال میں جا گھسا۔ اس کی واپسی عین وقت پر ہوئی--- جیسے ہی وہ سٹال سے باہر نکلا' میں طے شدہ منصوبے کے مطابق اس سے ٹکرا گیا۔

"شاکر نا مہاراج جی بٹالہ آ کر عقل ٹھکانے نہیں رہتی دلی والوں کی۔" میں نے معذرت کرتے ہوئے اپنا مخصوص "کوڈ" فقرہ کہا۔

"دلی کی کیا بات ہے جناب' اچھا آپ کیا دلی سے آئے ہیں؟" اس نے بھی میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔

"سگریٹ ہو گا آپ کے پاس؟" میں نے کہا۔

"ماچس نہیں ہے---" وہ بولا۔

"آیئے اور چائے پی لیں۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں نے مخصوص الفاظ ان فقروں میں استعمال کر کے ایک دوسرے کو اپنی شناخت کروا دی تھی۔ میں نے بھی اس کی طرح دیہاتی کپڑے پہن رکھے تھے اور ایک کپڑے کا تھیلا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرتے لاری اڈے کے باہر کچہری کے نزدیک ایک ہوٹل میں بنے چھوٹے سے کیبن میں جا بیٹھے۔

نووارد نے جس کو "جسونت" نام الاٹ ہوا تھا' تمام تفصیلات سے مجھے ایک مرتبہ پھر آگاہ کیا۔ ہم نے یہ کام اپنے بھارتی دوستوں کی مدد سے انجام دینا تھا لیکن وہ بھی اس طرح کہ انہیں اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہو کہ جسے ہم پولیس سے چھیننے جا رہے ہیں وہ شخص کون ہے؟ ان کے نزدیک تو وہ خاص شخص ہمارے ملک کا ایک مانا ہوا سمگلر تھا جس کے بھارتی پولیس کے قبضے میں رہنے سے تمام کاروبار کا بیڑہ غرق ہونے کا خطرہ تھا اور ہمارے بھارتی دوستوں کو مزید "مال" اسی صورت میں مل سکتا تھا جب ہمارا یہ اہم ساتھی رہا ہو کر پاکستان پہنچے گا۔

تمام تفصیلات اچھی طرح طے کرنے کے بعد ہم دونوں اٹھے اور ایک دوسری لاری کے ذریعے ان سمگلر بھارتی دوستوں کے ڈیرے کی طرف چل دیئے۔ ہم لوگ وہاں رات گئے پہنچے تھے۔ ہمارے بھارتی دوست چرن سنگھ نے بڑی فراخدلی سے میرا استقبال کیا۔ میرے ساتھی کو وہ پاکستان کے ایک "نگڑے سمگلر" کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ اسی نگڑے سمگلر کی وجہ سے وہ آج لکھ پتی بنے ہوئے تھے ورنہ وہ تو معمولی سے زمیندار تھے۔ جسونت نے میرا تعارف صوبہ سرحد کے بہت بڑے آڑھتی کے بیٹے کی حیثیت سے کروایا۔ چرن سنگھ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

"کیڑی دے گھر نارائن آ گئے مہاراج۔" اس نے مجھ سے گرمجوشی سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

چرن سنگھ کے ساتھی تین چار مرغ لے آئے' جنہیں میرے پاکستانی ساتھی جسونت نے حلال کیا اور چرن سنگھ نے انہیں پکوانے کے لئے گھر بھیج دیا۔ ہم لوگ تو جھٹکا نہیں کھاتے تھے لیکن وہ حلال ضرور کھا لیتے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق مطلوبہ ساتھی جسے پولیس کی حراست سے آزاد کروانا تھا وہ اگلے روز تاریخ پیشی پر گورداسپور جیل سے بٹالہ آ رہا تھا۔ گورداسپور سے بٹالہ آنے والے ملزمان کو پرائیویٹ بسوں پر لایا جاتا تھا۔ چرن سنگھ نے منصوبے کے مطابق دو آدمی فوراً" روانہ کر دیئے۔ انہیں تمام باتیں تفصیل سے سمجھا کر ان کے حصے کے کام سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں چرن سنگھ کے انتہائی خاص آدمی تھے۔ ہم دونوں کو بھی چرن سنگھ نے رات گئے ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے اس مخصوص علاقے میں پہنچا دیا تھا جہاں سے ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کرنا تھا۔

ہم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے گورداسپور سے بٹالہ آنے والی سڑک کے ایسے حصے کو منتخب کیا تھا جہاں چرن سنگھ کا اپنا ایک مخصوص اڈہ تھا اور وہ قریباً" سارے کا سارا گاؤں اس کے "خاص لوگوں" پر مشتمل تھا۔ یہ گاؤں عموماً" سمگلروں کے گاؤں کے نام سے مشہور تھا

اور یہاں کے مکین سمگلنگ کے علاوہ بھی بہت سے غلط کام کرتے رہتے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ہمارے آدمی کو کسی بھی پرائیویٹ لاری میں وہاں سے نو اور دس بجے کے درمیان گزرنا تھا۔ لاری میں اس کے ہمراہ گارد کے دو سپاہی اور ایک حوالدار موجود تھے' جن کے پاس صرف ایک تھری ناٹ تھری کی رائفل تھی۔

قریباً" آٹھ بجے اس جگہ کی چرن سنگھ نے اپنے پانچ چھ ساتھیوں کے ہمراہ ناکہ بندی کرلی۔ اب ہم لوگ شدت سے اس خاص لاری کے منتظر تھے جس میں ملزمان ہمارے بھارتی دوست کے ہمراہ آرہے تھے۔ ہمارا وہ ساتھی جسے اغوا ہونا تھا' اسے جیل میں اطلاع مل چکی تھی اور وہ بھی اپنی بساط کے مطابق تیاری کے ساتھ آرہا تھا۔

قریباً" ساڑھے نو بجے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سوار نے اطلاع دی کہ ہمارے ساتھی پہنچنے والے ہیں۔ ابھی بمشکل پانچ چھ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک بس وہاں پہنچ کر رک گئی۔ بس میں موجود چرن سنگھ کے دونوں ساتھیوں نے منصوبے کے مطابق کام شروع کر دیا۔ ایک نے ڈرائیور کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اسے بس روکنے کا حکم دیا جب کہ دوسرے نے بڑی پھرتی کے ساتھ پولیس کے سپاہی سے رائفل چھین لی۔

بس کے مسافر یہی سمجھے تھے کہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ نے ان کو لوٹنے کے لئے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ بس کے رکتے ہی چرن سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ہمارے بس میں موجود ساتھی نے انجن بند کر کے چابی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اب ہمیں جو کچھ بھی کرنا تھا' چند منٹ کے اندر کر گزرنا تھا کیونکہ اس سڑک پر لاریوں کی آمدورفت ہر وقت جاری رہتی تھی۔

ہم نے بس میں موجود پندرہ بیس سواریوں کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ ان میں پولیس کے سپاہی اور ہمارے ساتھی بھی شامل تھے جیسے ہی وہ نیچے اترا' اس نے جھٹکا مار کر ہتھکڑی کو حوالدار کی بیلٹ سے نکال لیا۔ چرن سنگھ کے ساتھی اس اثناء میں ان کے سروں پر رائفلیں تانے کھڑے رہے۔ ہمارے ساتھی کے دونوں پاؤں میں بیڑی تھی۔ جسونت قریب ہی کھڑی جیپ کی پچھلی سیٹ پر بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔

اب ہم لوگ دو گروپوں میں بٹ گئے۔ میں' جسونت' اغواکنندہ اور چرن سنگھ جیپ میں سوار ہو گئے جب کہ باقی ساتھی پہلے سے تیار شدہ گھوڑیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بس کے ٹائروں پر فائرنگ کر کے انہیں ناکارہ بنا دیا۔ ہماری جیپ پہلے سے پلان شدہ راستے پر بھاگنے لگی۔ جب تک ہم نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ گھڑسوار وہاں موجود رہے۔ جب ہم خاصے محفوظ

ہو گئے تو انہوں نے بھی اپنی گھوڑیوں کو لگام دی۔

پچھلی سیٹ پر جسونت اپنے کام میں مصروف تھا۔ تین چار منٹ کے اندر اس نے اغواکنندہ کو بیڑیوں اور ہتھکڑی سے نجات دلا دی۔ ہمارے اس عظیم دوست کی انڈین انٹیلی جنس نے بہت بری طرح مار پیٹ کی تھی لیکن اتنی زبردست تفتیش کے بعد وہ بزدل اس سے کوئی کام کی بات نہ اگلوا سکے تھے۔ بری طرح زخمی اور کمزور ہونے کے باوجود اس کے عزم میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور وہ اپنے آپ کو تندرست و توانا ہی ظاہر کر رہا تھا۔

جسونت تالے توڑنے اور انتہائی مخدوش حالات میں بھی سرحد عبور کرنے میں ماہر تھا۔ اسے شاید اسی لئے یہ اہم فریضہ سونپا گیا۔ ہم نے اپنے دوست کو پہننے کے لئے فوراً" نئے کپڑے نکال کر دیئے۔ اب اس مہم کا کمانڈر میں تھا۔ سب کو میرے فیصلے پر عمل کرنا تھا۔ پہلے سے اپنے پاس رکھے کچھ خاص کیپسول میں نے اپنے نئے دوست کو جیپ میں ہی کھلا دیئے تھے۔ اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔

ایک مخصوص مقام پر ہم لوگ جیپ سے اتر گئے۔ چرن سنگھ نے یاری نبھادی تھی' باقی کام اب ہمارا تھا۔

"لو بھئی سجنو رب راکھا۔" اس نے پہلے سے تیار شدہ ایک پرائیویٹ کار کے قریب ہمیں اتار کر جیپ کو دوسرے راستے پر ڈال دیا۔ کار میں چرن سنگھ کا بھائی ہمارا منتظر تھا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے ہی جسونت سنگھ نے ہمارے ساتھی کا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا' میں اس کے مشاق ہاتھوں کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پانچ منٹ کے اندر ہی اپنے پاس موجود سینٹی ریزر اور مختلف قسم کے لوشنوں کے ذریعے ہمارے نئے ساتھی کو' قید اور مسلسل اذیت نے جس کی نہ صرف داڑھی خاصی بڑھا دی تھی بلکہ چہرے سے لہو بھی نچوڑ لیا تھا' ایک تندرست اور صحت مند خون کی سرخی لئے گالوں والے شہری بابو میں تبدیل کر دیا تھا۔ میرا نیا ساتھی میرا ہم عمر تھا۔ جب اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنے چہرے پر نظر ڈالی تو بے اختیار مسکرا دیا۔

"ایسی شکل تو میری اپنے ملک میں بھی نہیں ہو گی' کمال کے فنکار ہو یار کیا سے کیا بنا کر رکھ دیا ہے۔" اس نے جسونت کو داد دیتے ہوئے کہا۔

راستے میں پڑنے والی ندی میں ہم نے پولیس کی چھینی ہوئی رائفل اور جسونت کا پٹارہ جس میں نہ جانے کیا کیا الم غلم اس نے بھر رکھا تھا' پھینک دیا۔ چرن سنگھ کا بھائی ہمیں شام تک مختلف ذیلی سڑکوں پر گھماتا رہا۔ اس اثناء میں ہم نے جی۔ٹی روڈ کے نزدیک پھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی اور کھانا بھی کار ہی میں کھایا تھا۔ رات گئے ہمیں کپور تھلہ کے نزدیک ایک محفوظ مقام پر

پہنچا کر چرن سنگھ کا بھائی بھی رخصت ہو گیا۔ اس نے یہاں ہمیں اپنا دوست ظاہر کیا تھا اور ہمیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی اصلیت سے ان لوگوں کو آگاہ نہ کیا جائے۔

ooo

چرن سنگھ کے جاتے ہی میں نے معاملات پر غور کیا اور وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے صاحب خانہ سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں معذرت کی اور ٹرین کے ذریعے دہلی کی طرف چل دیئے۔ ہم تینوں اس وقت خاصے معزز نظر آ رہے تھے۔ بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ ہم تینوں کوئی اعلیٰ افسر تھے۔ جسونت زیادہ پڑھا لکھا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بہرحال سینئر تھا۔ اسے سارے بھارت کا چپہ چپہ زبانی یاد تھا۔ گاڑیوں کے نام' ان کے اوقات روانگی' راستے اور مشہور شہروں کے ہوٹل وغیرہ۔ جسونت نے ایک قلی کو نذرانہ دے کر فرسٹ کلاس کی تین ٹکٹیں حاصل کر لیں اور تھوڑی دیر بعد ہم تینوں اپنی اپنی سیٹوں پر روانگی کے منتظر بیٹھے تھے۔

قریباً" ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد گاڑی میں حرکت پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ اس نے رفتار پکڑ لی۔ دوران سفر ہم دونوں اپنے ساتھی کو پاکستان پہنچانے کے لئے محفوظ سرحد ڈھونڈتے رہے کیونکہ اس بات کا تو ہمیں بخوبی علم تھا کہ پنجاب سے سرحد عبور کرنا دانستہ خودکشی کرنے والی بات تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہاں فوجوں کی خاصی تعداد موجود تھی پھر اس خبر کے پھیلتے ہی تمام متعلقہ ایجنسیوں نے سرحد کے گرد اپنا جال بن لیا ہو گا اور ان کے چپے چپے پر نظر ہو گی۔

ہمارا ارادہ راجستھان یا سندھ کی طرف سے سرحد عبور کرنے کا تھا' حتمی فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا۔ اس لئے مجھ پر خاصی ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ قریباً" تین چار گھنٹے کی مغزماری کے بعد بالآخر ہم نے راجستھان کی ایک اپنی دانست میں انتہائی محفوظ جگہ کا انتخاب کر لیا تھا اور اب ہم آنے والے حالات کے منتظر تھے۔

دہلی تک ہم میں سے کوئی بھی بمشکل ایک گھنٹے سے زیادہ نہ سونے پایا تھا۔ ہم کپور تھلہ سے چندی گڑھ اور انبالہ ہوتے ہوئے کرنال سے گزر کر دہلی پہنچے تھے۔ یہ لمبا اور خاصا الجھا ہوا راستہ بھی جسونت کی ذہنی اختراع تھی۔ اس طرح ہم مین لائن سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے اور خاصے محفوظ تھے۔ جسونت کے پاس اپنا ذاتی پستول موجود تھا جب کہ میں نے اور ہمارے نئے ساتھی نے آٹومیٹک پستول اپنے سمگلر دوست سے حاصل کیا تھا۔ ہم نے اپنی دانست میں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھایا تھا' لیکن ایک بنیادی غلطی ہم سے یہ ہو گئی کہ ہمارے دہلی جانے کی اطلاع ان لوگوں کو ہو چکی تھی جہاں ہمیں چرن سنگھ کا بھائی چھوڑ کر گیا تھا۔

حادثہ یہ گزرا کہ ہمارے فرار ہوتے ہی وہاں سے پولیس کے ایک ڈی۔ ایس۔ پی کا گزر ہوا

جو معمول کی کارروائی کے مطابق گشت پر تھا۔ بس کے مسافروں نے شور مچایا اور تمام واقعہ کی اطلاع کر دی۔ کچھ لوگ چرن سنگھ کو پہچان گئے تھے۔ انہوں نے حملہ آوروں میں اس کی موجودگی کی نشاندہی بھی کر دی۔ دوسری طرف فرار کرایا جانے والا ملزم کوئی معمولی ملزم نہیں تھا۔ جیسے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے وائرلیس کے ذریعے اس کے مندرجات سے ہیڈکوارٹر کو آگاہ کیا' انڈین پولیس کے ایوانوں میں زلزلہ طاری ہو گیا۔ یک لخت جیسے وہ نیند سے بیدار ہو گئے۔ چند منٹ کے اندر ہی بھارتی خفیہ پولیس کی تمام ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں۔ چرن سنگھ کو گرفتار کرنا یا اس سے کچھ اگلوا لینا خالہ جی کا کھیل نہیں تھا۔ انڈین سیکورٹی افسران نے اسے دو تین گھنٹے کے اندر ہی گرفتار کر لیا لیکن زیادہ توجہ چرن سنگھ پر نہیں بلکہ اس کے ساتھیوں پر دے رہے تھے۔ چرن سنگھ صرف ولیر سمگلر تھا' سیاست دان تو تھا نہیں' پھر سکھوں کی روایتی بے وقوفی بھی آڑے آئی۔ اس نے فرار کے منصوبے میں اپنے پانچ چھ اور ساتھیوں کو بھی شامل کر لیا' جنہیں ہمارے کپور تھلہ تک مرحلہ وار پہنچنے کا علم تھا۔ مزید پیش رفت ہوئی تو انڈین سنٹرل انٹیلی جنس بیورو کے افسران کڑی سے کڑی ملاتے رات گئے کپور تھلہ کے اس گھرانے تک جا پہنچے جہاں چرن سنگھ کا بھائی ہمیں لے کر پہنچا تھا۔

کیس اگر پولیس کے ہاتھوں تک ہوتا تو وہ لوگ گورداسپور کے اردگرد ہی ٹکریں مار مار کر تھک جاتے لیکن معاملہ چونکہ زیادہ ہی سنجیدہ تھا اور انڈین آئی۔ بی نے "را" (خفیہ انٹیلی جنس) کی ہنگامی مدد حاصل کر لی تھی' اسی لئے انہیں اتنی کامیابی ہوئی۔ "را" کے افسران زیادہ تر کے۔ جی۔ بی کے تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے جدید سائینٹیفک جاسوسی نظام اپنائے ہوئے تھے۔

کپور تھلہ کے میزبانوں کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کے مہمان کون تھے؟ ان کے نزدیک تو ہم چرن سنگھ کے مہمان ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام تھے۔ اسی لئے ان کا ایک آدمی ہمیں سٹیشن تک چھوڑ گیا—— اس نے شاید ہمیں ٹکٹ خریدتے دیکھ کر ہماری منزل معلوم کر لی تھی یا پھر "را" کے چالاک افسران نے ٹکٹ کلکٹر یا بلیک ٹکٹ بیچنے والے قلیوں سے ہماری منزل کا پتہ لگا لیا تھا۔ بہرحال یہ اتنا بڑا کارنامہ نہیں تھا' جب وہ کپور تھلہ سٹیشن تک چلے آئے تھے تو ہماری منزل کا پتہ لگانا ان کے لئے کچھ زیادہ دردِ سر کا باعث نہیں بنا ہو گا۔

ooo

ہم علی الصبح دہلی پہنچے تھے۔ ٹرین دہلی سٹیشن سے جب کچھ فاصلے پر ٹھہری تو اچانک ایک طوفان بدتمیزی آ گیا۔ فوج کے درجنوں مسلح جوانوں نے فرسٹ کلاس کے دروازوں پر قبضہ کر

لیا۔ شدید سردی کی وجہ سے مسافروں نے دروازے بند کر رکھے تھے' وہ دروازوں کے باہر ہی لٹک گئے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔

ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ توقعات کے بالکل برعکس اچانک پیش آنے والی صورت حال نے ہمیں ڈگمگا دیا۔ میری طرح یقیناً میرے دونوں ساتھیوں کے دل بھی دہل گئے تھے لیکن یہی ایک جاسوس کے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اب کنٹرول مجھے سنبھالنا تھا' دوسرے ہی لمحے میں تیار تھا۔ جسونت اور نیا ساتھی بھی سنبھل گئے۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جسونت نے جھکتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم نے دل میں بچ نکلنے کی صورت میں دوبارہ ملنے کے لئے ایک "مقام ملاقات" طے کر لیا تھا۔ فوراً ہی ہمارا منصوبہ بھی ترتیب پا گیا۔

"نیو دہلی دے میلے جو" جسونت ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"فی امان اللہ" میں نے اور دوسرے ساتھی نے سرگوشی کی۔

دو ہم سے علیحدہ ہو کر بڑی پھرتی کے ساتھ ڈبے کے اندر ہی اندر چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ ہم دونوں نے اپنی جیبوں میں رکھے پستول تھپتھپائے اور ایک دوسرے کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ پستول ہمارے پہنے ہوئے کوٹوں کی جیبوں میں مخفی ہو گئے تھے اور بوقت ضرورت ہم میں سے کوئی بھی کام لے سکتے تھے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو شہادت سے بھی سرفراز کر سکتے تھے' جو ہمارا آخری حربہ تھا۔

اپنی سیٹیں ہم نے چھوڑ دی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے ڈبے کے پلیٹ فارم کی مخالف سمت کھلنے والے دروازے سے آن لگے۔ سٹیشن نزدیک آ جانے کی وجہ سے ڈبے میں خاصی ہلچل مچی تھی' ہر کوئی اپنی اپنی فکر میں تھا۔ چند منٹ کے لئے لوگوں نے سپاہیوں کے اس طرح اچانک ڈبوں کے دروازے سنبھالنے کا نوٹس ضرور لیا تھا لیکن اب ہر ایک زیادہ فکر اپنی اور اپنے سامان کی تھی۔

سٹیشن کے مشعل نظر آتے ہی ہمارے دلوں کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔ اپنے تصور کی آنکھ سے ہم پلیٹ فارم کو گھیرے میں لیتے دلی پولیس کو دیکھ سکتے تھے۔ منصوبے کے مطابق گاڑی کی رفتار آہستہ ہوتے ہی میں نے دروازے میں لگے شیشے کو نیچے گرا دیا۔ باہری ہینڈل کو پکڑے ایک فوجی لٹکتا نظر آ رہا تھا۔

"گولی چلانے کا ارادہ ہے کیا صاحب؟" میں نے اس کے متوجہ ہوتے ہی کہا۔ "اندر آ جایئے" کہتے ہوئے میں نے دروازہ کھلنے والا بولٹ بھی گرا دیا۔

"نو تھینک یو' ہم ٹھیک ہے۔" کوئی جاٹ نظر آتا تھا' اس نے میرے سوٹ بوٹ سے

مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔ پلیٹ فارم دوسری سمت ہونے کی وجہ سے اس طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ لوگوں نے دوسری سمت کے دروازوں پر سازوسامان سمیت یلغار کی ہوئی تھی۔

میں نے مڑ کر اپنے ساتھی کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ گاڑی کانٹا بدل کر اپنی لائن پر آ رہی تھی اور چند سیکنڈ کے لئے ایک مرحلہ ایسا آتا تھا جب ایک خاص مقام پر ڈبے سے گرائی جانے والی چیز کا علم دوسرے ڈبے والوں کو سوائے ان لوگوں کے جو خاص طور سے اس طرف متوجہ ہوں نہ ہو پاتا۔ ہم اس لمحے کے نزدیک سے نزدیک تر ہو رہے تھے۔ میرے ساتھی نے مجھے اپنے اوپر اوڑھے کمبل کی اوٹ سے اس طرح چھپا لیا تھا کہ اندر سے میں کم از کم دیکھنے پر بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔ میرے ہاتھ کی گرفت اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے پستول پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود پسینے میں نہا گیا تھا اور میں اپنے دل کی بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ اس لمحے کا منتظر تھا۔ میرے اعصاب تن گئے' گردن میں شدید تناؤ محسوس ہو رہا تھا۔

جیسے ہی وہ لمحہ آیا' میرے ہاتھ میں پکڑے پستول کا دستہ پوری قوت کے ساتھ باہر لٹکے فوجی کے سر پر پڑا۔ ڈبے کے پائیدان سے لیٹرین میں اسے منتقل کرتے ہوئے ہمیں بمشکل آدھا منٹ ہی لگا تھا۔ تمام سواریاں پلیٹ فارم کی سمت کھلنے والی کھڑکیوں سے دھڑ نکالے باہر کو لپک رہی تھیں' کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ڈبے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

ٹرین پلیٹ فارم کے نزدیک پہنچ رہی تھی اور ہمیں قطار اندر قطار بھارتی فوج کے جوان جنوبی مخالف سمت میں نظر آ رہے تھے۔ دروازے سے باہر لٹکتے ہوئے میں نے دیکھا' اس سمت میں کسی ڈبے کے پائیدان پر کوئی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔

دو سب بھی چلتا" ڈبوں کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں بڑی پھرتی سے نیچے اترے اور پلیٹ فارم کی مخالف سمت کھڑی ایک مال گاڑی میں چھلانگیں لگاتے داخل ہو گئے' پھر اسی ڈبے کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ بھارتی سیکورٹی والے شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو نظروں میں رکھے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے۔ آگے آگے میں تھا اور پیچھے ہمارا نیا ساتھی۔ اچانک جیسے زمین نے ہمارے پاؤں پکڑ لئے۔ سوت اپنا بھیانک جبڑا کھولے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ زمین پر گھٹنے ٹکائے پوزیشن لئے بھارتی پولیس کا سپاہی ہمارے سامنے تھا۔

"ہالٹ!" اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

"فرنٹ" میرے ساتھی نے جواب دیا۔

دو چلا اور دوسرے ہی لمحے میری زوردار لات اس کے ہاتھ پر پڑی۔ رائفل اس کے ہاتھ

سے نکل کر اچھلی اور میرے ہاتھوں نے اسے تھام لیا' اگلا لمحہ اس پر قیامت ڈھا گیا۔ میں نے پوری قوت سے رائفل کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ رائفل پرے پھینک کر ہم دوبارہ بھاگنے لگے۔ اس اثناء میں کچھ لوگوں نے جو چھپ کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے' شور مچانا شروع کر دیا۔ ان کی چیخ و پکار نے سیکورٹی دستوں کو ہماری طرف متوجہ کر دیا۔ اب ہمیں واضح طور اپنے تعاقب میں آنے والوں کے نعرے اور قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

سٹیشن پر رش چونکہ زیادہ تھا' اسی لئے ابھی تک (اس پلیٹ فارم کے لوگ) جس پر ہم بھاگتے بھاگتے آن پہنچے تھے' صورت حال کو سمجھ نہ پائے تھے۔ پلیٹ فارم کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ہم نے رفتار کم کر لی اور اب بھاگنے بھاگنے کے ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ بچنے کی بظاہر تو کوئی صورت ممکن نہیں تھی لیکن اسے معجزہ ہی جانئے کہ اس پلیٹ فارم پر ایک ٹرین آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ ہم نے اسے تائید غیبی جانا اور چند سیکنڈ کے بعد ہم دونوں اس ٹرین کے ایک خالی ڈبے میں اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کسی حد تک ہم ضرور محفوظ ہو گئے تھے لیکن خطرہ بدستور سر پر منڈلا رہا تھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے ساتھی کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس بھاگ دوڑ میں میرا ساتھ دے سکتا' لیکن اسے اکیلا چھوڑنا بزدلی ہوتی جس کا کم از کم میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بھاگتے ہوئے جملوں اور بہت سی باتیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں' وہاں میں اپنے ساتھی کے متعلق بھی سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کم از کم بھاگنے کی مصیبت سے نجات مل جائے۔ اب تھوڑی دیر کے لئے سانسیں درست کرنے کا موقعہ ملا تو ہم نے اسے غنیمت جانا۔

ابھی بمشکل ہم نے اپنی حالت پر قابو پایا ہی تھا کہ ٹرین کے بریک چیخنے لگے۔ ایک مرتبہ پھر ہمارے دل اچھل کر حلق میں اٹک گئے۔ گاڑی ابھی سٹیشن کی حدود سے نکل کر بمشکل پہلے سگنل کے قریب پہنچنے والی تھی۔ شاید اسے سگنل ڈاؤن نہیں ملا تھا۔ ہم ریلوے سٹیشن کی حدود سے باہر نکل آئے تھے' جیسے ہی گاڑی کے بریک لگنے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ساتھی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اسے دروازے کے نزدیک کر لیا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پراعتماد نظریں اس کے عزم کی غماز تھیں۔ مجھے یوں دکھائی دیا جیسے بھارتی سیکورٹی اپنی طاقت اور انتظامات سمیت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

ٹرین کے رکتے ہی بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم بھی نیچے اتر گئے۔ ہم سٹیشن کی حدود سے باہر تو تھے' لیکن یہاں لوگوں کا آنا جانا ابھی زیادہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ٹرین کے رکنے پر

لوگوں کے مختلف تبصرے سنتے سنتے ہم سٹیشن کی مخالف سمت کو آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے۔ ہم معمول کی رفتار سے چل رہے تھے تاکہ کسی کو ہم پر شبہ نہ ہو سکے۔ ریلوے لائن کے قریب واقع سڑک ہماری جائے پناہ تھی۔ یہاں سے مختلف سواریاں گزر رہی تھیں۔ دہلی کی زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی۔

ابھی ہم سڑک سے کچھ فاصلے پر تھے کہ فوج کے دو ٹرک سٹیشن کی سمت سے آتے دکھائی دیئے۔ دونوں ٹرک اسی طرف آ رہے تھے' ہم ٹھٹھک کر رہ گئے! فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ ہمارے عقب میں سڑک کے نزدیک اور کوئی نہیں تھا اور ہم ٹرین کی مخالف سمت میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی بے وقوف شخص بھی بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہمارا تعلق ٹرین کے مسافروں سے ہے۔ اور تو کچھ نہ سوجھا ہم نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا رخ بدلا اور آہستہ آہستہ بوجھل قدموں کے ساتھ ٹرین کی طرف چل دیئے۔

ٹرک جوں جوں نزدیک آتے جا رہے تھے' ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اچانک میرے ساتھی کو ایک تدبیر سوجھی۔ وہ ریلوے لائن کے نزدیک اگی قدرتی گھاس کے قریب پیشاب کے بہانے بیٹھ گیا اور یہی عمل میں نے بھی دہرایا۔ آنے والوں نے بجائے شارٹ کٹ استعمال کرنے کے ریلوے لائن کے متوازی اپنا سفر جاری رکھا اور گاڑی کے انجن کے قریب پہنچتے ہی دونوں ٹرک رک گئے۔ درجنوں جوان چھلانگیں لگاتے باہر کود پڑے۔ وہ اس طرح گاڑی کی طرف رائفلیں تانے بڑھ رہے تھے جیسے اس پر حملہ کرنے جا رہے ہوں۔

ہم انہیں نظر نہیں آئے تھے یا انہوں نے جان بوجھ کر ہمیں نظر انداز کر دیا تھا؟ اس کا اندازہ تو ہم نہ کر سکے لیکن اپنی طرف سے ان کی غفلت کو میں نے تائید غیبی جانا۔ میں نے اپنے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا اور سڑک کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جب میں قریباً دس بارہ گز دور چلا گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ ٹرین کے مسافروں میں سے یا آنے والے فوجیوں میں سے کوئی ہماری حرکت کا نوٹس نہ لے۔

دھڑکتے دل اور ڈگمگاتے قدموں سے ہم کسی نہ کسی طرح سڑک پر پہنچ ہی گئے۔ میں نے وہاں کسی سواری کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک نزدیکی راستے کا رخ کیا۔ قریب ہی ایک مندر سے گھنٹی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فوجیوں نے بڑے منظم طریقے سے ٹرین کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کے کچھ آفیسر مختلف ڈبوں میں ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور ہم ان کی پہنچ سے دور مندر کے نزدیک اپنی خستہ حالی کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ

ہمارا اندر جانا مناسب ہے یا اسی طرف سفر کرتے رہنا؟

ooo

چند منٹ کے بعد میں اور میرا ساتھی مندر میں داخل ہو چکے تھے۔

ہم نے اپنے جوتے باہر اتارے اور "کتھا" کرنے والوں کی منڈلی کے نزدیک ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو بڑے زور و شور سے پوجا پاٹھ میں مصروف تھے۔ دونوں جان بوجھ کر ایک دوسرے سے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ اس طرح کم از کم ہم میں سے ایک تو محفوظ رہ سکتا تھا۔ پہلے تو آہستہ آہستہ آوازوں میں آوازیں ملاتے رہے' پھر مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو۔

سامنے دروازے سے ایک ہاردوی تھانیدار اور سویلین کپڑوں میں ملبوس تین آدمی مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے ایک دوسرے کو تسلی دی اور آنے والے حالات سے نبٹنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگے۔ مندر میں موجود لوگوں نے ایک نظر تو آنے والوں پر معمول کے مطابق ضرور ڈالی تھی لیکن کسی نے ان کے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

کتنا اپنے جوبن پر تھی——!

شاید تھانیدار یہاں معمول کے مطابق آنے والی "مشقت" میں شامل تھا؟ ہم نے سوچا لیکن تھانیدار اور اس کے ساتھیوں کی بے چین سے چاروں طرف جائزہ لیتی نظریں کسی اور ہی بات کی چغلی کھا رہی تھیں۔ مندر چونکہ ریلوے سٹیشن کے نزدیک موجود تھا اس لئے ہمیں یہ فائدہ ضرور حاصل تھا کہ یہاں مخصوص لوگوں کی ہی آمدورفت نہیں رہتی ہو گی بلکہ اکثر مسافر بھی یہاں پوجا پاٹھ کے لئے آ جاتے ہوں گے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی ہم نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ کم از کم مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اب پاٹھ کرنے والوں میں ایک نمایاں آواز میری بھی تھی۔ دوسری طرف میرے ساتھی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی بڑے جوش و خروش سے خشوع و خضوع کے ساتھ گا رہا تھا——

اوم جے جگدیش ہرے

مندر کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے اپنی جگہ سے خواہ مخواہ ہلنا جلنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ مختلف کونوں میں ڈٹے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھے لیکن سب کے ساتھ پوجا میں بھی شامل تھے۔ تقریباً دس بارہ منٹ تک وہ موجود رہے۔ اس اثناء میں نہ جانے کتنی مرتبہ ہمیں اپنے خشک گلے تر کرنے کے لئے تھوک نگلنا پڑا۔ ان کے رفع ہوتے ہی ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ اس اثناء میں "پرشاد" بھی آ گیا تھا۔ ہم نے گرم گرم "حلوا" کے دو دو

لقمے زہر مار کئے اور مندر کے کھلے گیٹ ماحول کو خیرباد کہہ کر باہر نکل آئے۔

ooo

سورج طلوع ہو چکا تھا اور لوگوں کی آمدورفت خاصی بڑھ چکی تھی۔ دلی کی بھیڑ چلاتی' مار دھاڑ کرتی مخلوق کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہم دونوں پیدل ہی ایک طرف کو چل دیئے۔ مجھے دلی کے متعلق ابھی زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن میں اس کے لئے اجنبی بھی نہیں تھا۔ جسونت کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچنے کے لئے ابھی دو گھنٹے کا وقت ہمارے پاس موجود تھا۔ "مسلسل بھاگ دوڑ اور ذہنی کوفت نے جب مجھے تھکا ڈالا تھا تو جانے میرے ساتھی کا کیا حال ہو گا؟" یہ تو اس کا عزم تھا جو اسے کشاں کشاں میرے ساتھ لئے جا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کے صبر و تحمل کو سراہا۔ اب ہم مسلمانوں کے ایک ہوٹل کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

پہلے تو میرا ارادہ یہیں بیٹھ کر ناشتہ کرنے اور ستانے کا تھا لیکن کوئی انجانی قوت مجھے یہاں جانے سے روک رہی تھی۔ پھر جیسے میں خواب سے بیدار ہو گیا۔ پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ ایڈین سیکورٹی حکام نے کم از کم مسلمانوں کے تو ہر ہوٹل پر نظر رکھی ہو گی۔ جب غور کیا تو ہمیں یہاں بھی کچھ مشتبہ صورتیں دکھائی دیں۔ ہم آگے بڑھ گئے اور چند منٹ کے بعد ہی میں ایک خاصے گنجان آباد علاقے میں ایک درمیانے درجے کے ہندو ہوٹل میں بیٹھا لمبے چوڑے ناشتے کا آرڈر دے رہا تھا۔

ہوٹل پہنچنے تک سردی گرمی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یہاں آنے تو علم ہوا کہ سردی کے مارے یہاں قتلِ عام کی جا رہی تھی وہاں مسلسل مشقت سے ہم دونوں "ہکو" کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ بادل نخواستہ ناشتے کے ساتھ تین چار کیپسول بھی نگلنے پڑے۔

تقریباً ایک گھنٹہ وہاں گزارنے سے میرے ساتھی کی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ مقررہ وقت پر ہم دونوں ایک سینما گھر کا رخ کر رہے تھے جہاں جسونت ہمارا منتظر تھا۔ دلی کے تقریباً سارے ہی سینماؤں میں صبح سویرے شو سے ہی فلم دکھانے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ایک رکشہ کے ذریعے وہاں پہنچے تھے۔ سینما ہال سے کچھ فاصلے پر ہم دونوں اتر گئے۔ اب ایک اور سنسنی خیز مرحلہ آ رہا تھا۔ جاسوس سے جاسوس کے ملاپ کا مرحلہ——!

میں نے اپنے ساتھی کو ہدایات دے کر وہیں کھڑا کیا اور خود بڑے محتاط طریقے سے' چاروں طرف سے چوکنا' سینما ہال کی سمت چل دیا۔ سینما ہال کے دروازے کے سامنے بنی مختلف سگریٹ پان کی دکانوں پر میں نے سرسری نظر ڈالی۔ کوئی مشتبہ صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ایک دکان سے سگریٹ خرید کر سلگایا۔ پان منہ میں رکھا اور ایک کونے میں نظریں جما دیں

جہاں سے جسونت کی آمد متوقع تھی۔ میری نظریں بار بار بے چینی سے گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ملاپ کی گھڑی میں دو تین منٹ باقی تھے۔ اس اثناء میں میرا ساتھی ایک قریبی دکان پر آن کھڑا ہوا تھا اور منہ میں سگریٹ دبائے مجھ پر ہی نظریں جما رکھی تھیں۔ ہم دونوں بے قابو دل کی دھڑکنوں کا شمار کر رہے تھے۔

وقت مقررہ سے قریباً ایک منٹ بعد میں نے جسونت کو سینما ہال سے برآمد ہوتے دیکھا' وہ شاید اندر فلم کے پوسٹر دیکھ رہا تھا۔ پلان کے مطابق اس نے ایک سمت کو چلنا شروع کیا اور آدھ فرلانگ تک جا کر واپس پلٹ آیا۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ وہ ظالموں کی دست برد سے بچ نکلا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔ مخالف سمت سے میں بھی پان چباتا اور سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی اسے "Safe Signal" (حفاظتی اشارہ) مہیا کر دیا تھا۔

ایک دوسرے کے محفوظ ہونے کے یقین نے ہمارا میروں خون بڑھا دیا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی' شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی پیٹھ تھپکا کر ہمت کی داد دی۔ چند سیکنڈ کے بعد جسونت دوسرے ساتھی سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ اس نے چار آدمیوں کا باکس پہلے سے ریزرو کروا لیا تھا۔ باکس میں پہنچتے ہی ہم تینوں باری باری کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ کل سے آج تک رونما ہونے والے واقعات کے متعلق گفتگو کرنا ہم میں سے کسی نے بھی مناسب نہ سمجھا۔ ہمیں خوشی اور اطمینان کے جو چند لمحات میسر آئے تھے' انہیں غنیمت جان کر ہم صرف انڈین انٹیلی جنس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اپنی تکالیف اور آنے والے بدترین حالات کے متعلق سوچ کر ہم ان غنیمت لمحوں کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔

فلم بڑی رومانٹک تھی' چلی تو پونم میرے من مندر میں آن براجی۔

پونم جو عنایت تھی۔۔۔۔! جو فضاؤں میں ہمیشہ سے رچا بسا کبھی نہ ختم ہونے والا خوبصورت گیت تھی۔ وہ دھنک کے خوبصورت رنگوں کا امتزاج تھی۔ اس کی دیئے جلاتی' کٹورا آنکھیں سمندر کے سینے پر تیرنے والے وہ لائٹ ہاؤس تھے جو طوفانوں میں بھٹک جانے والے ماجھیوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ ذرا سکون ملا اور وہ میرے نہاں خانہ دل سے نکل کر سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"کہاں پہنچ گئے مہاراج؟" مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر جسونت نے پوچھا۔ ہم تینوں خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔

"جہنم میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تو اچھا ہوا جلدی واپسی ہو گئی۔" ہمارے نئے ساتھی نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

تینوں حتی الوسع یہی کوشش کر رہے تھے کہ ماحول کو خوشگوار بنائے رکھیں' لیکن ہم تینوں میں سے کسی کو کوئی خوش فہمی بھی نہیں تھی۔ ہمیں علم تھا ایسے حالات میں سرحد پار کرنا کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ سرحدی اضلاع میں ناکہ بندیاں زور پکڑ رہی ہوں گی اور بھارتی سیکورٹی شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہو گی۔

جسونت نے ہی بالآخر پہل کی۔

"میرے خیال میں راجستھان سے کافی موقعہ مل جائے گا۔" وہ بولا۔

"فی الحال اس ذکر کو جانے دو' کل بات ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

فلم کے خاتمے پر ہم اکٹھے ہی باہر آ گئے۔۔۔۔ شام تک کا وقت ہم نے گھوم پھر کے ضائع کیا۔ شام کو میں نے اپنے نئے ساتھی کو جسونت کے حوالے کیا اور اگلے روز ایک مخصوص مقام پر ملاقات کا وعدہ کر کے ان سے الگ ہو گیا۔ میں سیدھا مارکیٹ میں پہنچا' وہاں سے اپنے ہال کے مختلف آرڈرز وصول کئے کیونکہ گھر سے تو میں اسی مشن پر نکلا تھا۔

دہلی ہی کے ٹیلی فون ایکسچینج سے میں نے لدھیانہ فون کیا۔ "پرکاش اینڈ پرکاش انڈسٹری" کے نزدیک ہی ایک فون لگا تھا جہاں میں نے پرکاش سے بات کی اور اسے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ میں اپنے کسی عمل سے ان لوگوں کو اپنے "پراسرار" ہونے کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ میری حتی الوسعی یہی کوشش تھی کہ میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں جو انہیں میرے متعلق سوچنے پر مجبور کر دے۔ پرکاش کو میں یہ کہہ کر آیا تھا کہ میں دہلی سے آرڈر وصول کرنے جا رہا ہوں۔ اب اسے اطلاع دینا بھی ضروری تھا کہ فلاں فلاں جگہ مال روانہ کر دے۔

ooo

رات جسونت اور ہمارے نئے ساتھی نے مجھ سے علیحدہ گزاری۔ اگلے روز مجھے معلوم ہوا جسونت نے نئے ساتھی کو تو ایک سرائے میں قیام کے لئے جگہ دلوا دی تھی جب کہ خود اس نے رات ہوٹل میں بسر کی۔ دوسرے دن علی الصبح ہم لوگ منصوبے کے مطابق اکٹھے ہو گئے۔ ہم تینوں نے بھی عام قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ صرف نئے ساتھی نے بطور احتیاط گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ہماری شدید خواہش تھی کہ پاکستان پہنچنے تک اس کی جسمانی حالت نارمل رہے۔ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے بعد ہم تینوں اسی باغ میں اکٹھے ہو

گئے۔ یہاں ایک محفوظ کونے میں بیٹھ کر قریباً دو گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر جسونت اور میں نے اتفاق رائے سے اپنی دانست کے مطابق سرحد عبور کرنے کے لئے ایک بہترین جگہ منتخب کر لی تھی۔ جسونت اور میرے ساتھی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں دہلی سے واپس پلٹ جاؤں لیکن میں نے انہیں تنہا چھوڑنا گوارہ نہ کیا۔ میں چاہتا تھا اپنی آنکھوں سے انہیں بحفاظت سرحد پار کرتا دیکھ سکوں۔ میرے بضد ہونے پر وہ مجھے سرحدی علاقے تک ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گئے۔

ریلوے ٹائم ٹیبل سے ہم نے معلومات حاصل کیں اور ایک ایسی گاڑی کا علم ہوا جو ہمیں ہمارے مطلوبہ سٹیشن پر شام کے وقت پہنچاتی تھی۔ وہ دن بھی ہم نے دہلی میں گزرا اور دوسرے روز علی الصبح ٹرین کے ذریعے اپنی منزل کو چل دیئے۔ اس مرتبہ ہم تیسرے درجے میں عام بھارتی شہریوں کے روپ میں سفر کر رہے تھے۔ ہم آپس میں کبھی کبھی اس طرح بات کر لیتے تھے جیسے ایک ہی ڈبے میں سفر کرنے والے مسافر ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں۔ سٹیشن پر کوئی خاص سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ غالباً انڈین سیکورٹی کو یہ خیال گزرا تھا کہ ہم دہلی سے کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔

گاڑی شام کے قریباً چھ بجے "ہندو مل کوٹ" پہنچی۔ چھوٹے سے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترتے ہوئے ہم نے سامنے نظر دوڑائی تو ہمیں ریلوے لائن ٹوٹی نظر آئی۔ جہاں ریلوے لائن کا سلسلہ ختم ہوتا تھا جس کے بعد پاکستانی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ سٹیشن سے بالکل ملحقہ بی۔ ایس۔ ایف کی چیک پوسٹ بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں مختلف جگہ انہوں نے نگرانی کے لئے نادر بنا رکھے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک مندر نظر آ رہا تھا جس کی اونچی چھت کے ایک کونے میں بھارتی سیکورٹی فورسز کا ایک سپاہی آنکھوں سے دوربین لگائے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ صرف پاکستانی علاقے ہی پر نظریں رکھے ہوئے نہیں تھا بلکہ اردگرد ہونے والی سرگرمیوں سے بھی باخبر تھا۔

جیسے ہی اس کی دوربین کا رخ پلیٹ فارم کی طرف ہوا نجانے کیوں میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ قریبی دیہات کے رہنے والے لوگ کھیتوں میں چلتے ہوئے گاؤں کی سمت جا رہے تھے۔ طے شدہ پلان کے مطابق ہم لوگ ڈبے سے اترتے ہی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ انہوں نے تو قریبی دیہات کی طرف جانے والی پگڈنڈی کا رخ کیا جب کہ میں مخالف سمت شہر کی جانب چل دیا۔

ریلوے سٹیشن سے پاکستانی سرحد کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ بنتا تھا۔ جسونت اور میرے

ساتھی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا جو انہوں نے اتنے خطرناک علاقے کو سرحد عبور کرنے کے لئے منتخب کیا۔

ان کا خیال تھا کہ بھارتی سیکورٹی کی نظروں میں آنے تک وہ کم از کم آدھا فاصلہ طے کر لیں گے اور آدھا وہ اپنی قوت ارادی کے بل پر بھاگ کر بھی طے کر سکتے تھے۔ میرے ساتھی کا خیال تھا کہ گولی لگنے کی صورت میں بھی وہ کم از کم پاکستانی علاقے میں گریں گے۔ اس طرح اپنے وطن کی خاک تو نصیب ہو گی۔ وہ ایک دفعہ فرار ہونے کے بعد دوبارہ زندہ بھارتی حکومت کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں اس کے جذبے کی داد دیئے بغیر رہ نہ سکا۔ جسونت نے بھی اس کی خواہش اور جذبات کے احترام میں اس علاقے پر اتفاق رائے کیا تھا اور اب وہ دونوں جیالے قدم بہ قدم اپنی سرحد کی طرف گامزن تھے۔

ooo

میں سٹیشن کے ایک گوشے میں پیشاب کرنے کے بہانے بیٹھ گیا۔ میری نظریں ان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ سردیوں کے موسم کی وجہ سے سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ابھی تک اتنی روشنی ضرور باقی تھی جس میں مجھے پاکستانی رینجرز کی پوسٹ پر لہراتا ہوا سبز ہلالی پرچم صاف دکھائی دے رہا تھا۔

رینجرز کی پوسٹ درختوں کے جھنڈ میں گہری ہونے کی وجہ سے گو کہ دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں دل ہی دل میں وہ سب کچھ محسوس کر سکتا تھا جو وہاں موجود تھا۔ خاک وطن کے اتنے نزدیک ہونے کی وجہ سے مجھ پر ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت طاری تھی۔ پاکستانی فضاؤں کی سمت سے آنے والی ہوائیں مجھے ایک گونہ طمانیت کا احساس بخش رہی تھی۔ میرے دل میں موجزن وطن کی محبت کے لئے میرے جذبات دوچند ہو گئے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا میں ان عاصیوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑوں جو میری تقدس مآب دھرتی کی طرف میلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میرے دونوں پیارے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے دیہاتیوں کے ساتھ گاؤں کی سمت جانے والی پگڈنڈی پر رواں دواں تھے۔ آگے آگے جسونت تھا اس کے پیچھے میرا ساتھی۔ جسونت کے دائیں ہاتھ میں دیہاتی طرز کا کپڑے کا تھیلا پکڑا ہوا تھا جس میں ایک ریوالور اور اس کی گولیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے تھیلا کچھ اس طریقے سے پکڑا تھا کہ چند لمحوں کے نوٹس پر بھی وہ ریوالور نکال کر فائرنگ کر سکتا تھا۔

میرے ساتھی نے ایک گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چادر کے اندر تھے اور ایک ہاتھ میں اس نے بھی ریوالور تھام رکھا تھا۔ دونوں ساتھی چلتے چلتے اب اس مقام پر پہنچ

گئے تھے جہاں سے ایک راستہ گاؤں کی سمت جاتا تھا اور دوسرا پاکستانی سرحد کی طرف——

ابھی وہ بمشکل دو تین قدم ہی چل پائے تھے کہ میں نے سٹیشن کے قریب مندر پر بنی چیک پوسٹ پر گشتی کرنے والے محافظ کو چوکنے دیکھا۔ اس نے اپنی دوربین ایک طرف رکھ دی اور گلے میں لٹکی وسل کو منہ میں دبا لیا——وسل کی تیز آواز مجھے وہاں کھڑے بخوبی سنائی دے رہی تھی——

خطرے کا احساس ہوتے ہی سٹیشن سے ملحقہ پل پر اس۔ ایف پوسٹ سے میں نے باری باری باہر نکلتے ہوئے پانچ مسلح سپاہیوں کو دیکھا۔ یہاں ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے تھے' شاید یہی وجہ ہے جو پہلے سے تیار سپاہی یہاں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ سٹیشن سے یہ منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے علاوہ بھی وہاں موجود کافی لوگ محو تماشہ تھے۔ وسل کی آواز سنتے ہی بے اختیار میرا ہاتھ اپنے کپڑوں میں چھپے ریوالور کو ٹٹولنے لگا۔

میں اکیلا ایک معمولی سے ریوالور سے ان لوگوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا' البتہ جان ضرور گنوا سکتا تھا جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ میری حالت کا اندازہ آپ بخوبی فرما سکتے ہیں کہ شدید خواہش کے باوجود میں اپنے ساتھیوں کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ میں بت بنا اپنی جگہ کھڑا' بھاگتے ہوئے بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس کے جوانوں کو دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی میرے ساتھیوں کو تعاقب کا احساس ہوا۔ میں نے جسونت کو رکتے دیکھا——اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے ساتھی کو ایک سمت رہنمائی کی تھی۔ ان سے چند روہ ہی گز کے فاصلے پر ہی پاکستانی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ چند لمحے تو میرے ساتھی نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا' پھر اچانک وہ پاکستانی علاقے کی سمت بھٹکتے ہوئے بھاگنے لگا۔ جسونت اچانک پلٹا' اس نے ایک درخت کی آڑ لے کر اپنے تعاقب میں آنے والوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔

اسے فائرنگ کرتے دیکھ کر بھارتی سپاہی وہیں رک گئے۔ بظاہر" وہ خاصے تربیت یافتہ لوگ تھے کیونکہ چند سیکنڈ میں ہی انہوں نے زمین پر لیٹ کر پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور اب ان کی خودکار رائفلیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔ لیکن بے سود—— کیونکہ جسونت نے ان کے زمین پر گرنے کا انتظار نہیں کیا تھا' وہ بھاگ اٹھا اور بھاگتے ہوئے اس نے ریوالور دوبارہ لوڈ کر لیا تھا—— وہ کبھی کبھی رک کر ایک آدھ فائر کر دیتا تھا۔ اس لمحے میں کسی بھارتی سپاہی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اٹھ کر اس کا تعاقب کر سکے۔

جسونت کے چاروں طرف گولیوں کی بارش ہو رہی تھی لیکن اس کے بھاگنے کا انداز دیکھ کر میں ہی کیا' سٹیشن پر محو تماشہ باقی لوگ بھی عش عش کر اٹھے۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح

سیدھا نہیں بلکہ آڑا ترچھا ہو کر بھاگ رہا تھا۔ اس کے اس عمل میں بھی اتنی تنظیم اور ربط تھا کہ کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر پاتا تھا کہ وہ اچانک دائیں مڑے گا یا بائیں طرف۔ اس کی پوزیشن آٹھ کے ہندسے والی تھی۔

اس اثناء میں اس کے عقب سے فائرنگ کی آواز آئی۔ بظاہر" میرے ساتھی جو اپنی دھرتی پر پہنچ چکا تھا۔ اسے "کورنگ فائر" دے رہا تھا۔ بین الاقوامی سرحد ہونے کی وجہ سے بھارتی سرحدی افواج زیادہ فائرنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں کیونکہ دونوں اطراف میں سرحدوں پر ہنگامی صورت حال کارفرما تھی اور کسی بھی ملک کی فوج کی طرف سے کی گئی کوئی بھی غیر معمولی حرکت دوسری سمت کی افواج کو اشتعال دلا کر جنگ کی صورت حال پیدا کر سکتی تھی۔

بھارتی افواج چونکہ مشرقی پاکستان میں کی جانے والی تخریبی کارروائیوں میں پوری طرح ملوث ہو چکی تھیں اور مرکزی فوجی کمانڈ کی نظریں بھی مشرقی سرحدوں پر لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ خواہ مخواہ اپنی افواج کو مغربی محاذ پر کسی جنگ میں الجھانے کی پوزیشن میں نہیں تھے—— ان کی تمام تر توجہ مشرقی پاکستان کی طرف مبذول تھی۔ مغربی سرحد پر لڑائی مول لینے میں جو خطرات پوشیدہ تھے' ان سے بھارتی سپریم کمانڈ بھی بخوبی آگاہ تھی اور وہ اپنی افواج کو "بلنڈر" کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔

سرحدی افواج کی فائرنگ بند ہوتے ہی میں نے جسونت اور اپنے ساتھی کو فضا میں اچھلتے دیکھا۔ بظاہر" وہ جوش مسرت سے یا پھر بھارتی سرحدی افواج کو ان کی بے بسی کا احساس دلانے کے لئے یہ حرکت کر رہے تھے۔ میرے دونوں دوست غایت سے سرحد پار کر گئے تھے۔ خوشی کے مارے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہی بھارتی سپاہی منہ لٹکائے واپس چیک پوسٹ کی طرف آ رہے تھے۔ سٹیشن پر موجود لوگ دل کھول کر بھاگنے والوں کو داد دے رہے تھے۔

میں مطمئن شہر کی طرف چل دیا۔

صبح پہلی گاڑی سے میں بھٹنڈہ چلا گیا۔ جہاں مجھے ایک اہم کام سونپا گیا تھا—— بھٹنڈہ میں موجود اطلاعات کے مطابق دشمن کچھ نئی دفاعی نوعیت کی تعمیرات کر رہا تھا۔ مجھے نہ صرف ان کا کھوج لگانا تھا بلکہ یہ بھی جاننا تھا کہ وہاں کس نوعیت کے ہتھیار نصب کئے جا رہے ہیں۔ مشن کی اہم نوعیت نے احساس ذمہ داری کو بڑھا دیا تھا۔

میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اجنبی شہر' اجنبی لوگ اور کسی حد تک اجنبی ماحول۔ میں نے بھارتی معاشرے میں گو کہ خاصے مضبوط قدم جما لئے تھے لیکن میں اپنے ان اقدامات کی وجہ سے شہر کی حد تک ہی محفوظ رہ سکتا تھا۔ دفاعی نوعیت کے اہم مقامات کے گرد پھیلے ہوئے بھارتی

انسانی جنس کے جال میں سے راستہ بنانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔

ممبئی میں' میں شام کے وقت پہنچا تھا۔ ایک ہوٹل میں' میں نے سفری ایجنٹ کی حیثیت سے قیام کیا۔۔۔۔ شام کو میں شہر کا چکر لگا کر اپنے ایجنٹ سے متعلق ضروری بہت معلومات حاصل کر کے ہوٹل واپس آیا تو اپنے کمرے میں جانے کی بجائے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہی جا کر بیٹھ گیا۔ صبح پر صبح سے ہی خاصی بھوک سوار تھی۔ ایک تو ٹرین کا سفر ہی تھکا دینے والا تھا پھر سارا دن دھکے کھانے کے باوجود مجھے اپنے کام کی ایک بات بھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ یہی فوجی نوعیت کی تعمیرات کس جگہ ہو رہی ہے اور آفیسر انچارج کون ہے؟

ایک کونے میں لگی خالی میز کے گرد کرسی گھسیٹ کر میں بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے' جب میں نے ایک سکھ نوجوان کو سارے ہال میں بے چینی سے نظریں دوڑاتے دیکھا۔ قریباً" ہر میز پر ایک سے زیادہ لوگ بیٹھے تھے' وہ سیدھا میری طرف چلا آیا۔

"ست سری اکال" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

جواب میں' میں نے بھی "فتح" بلائی۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں سردار جی۔" اس نے بڑی انکساری سے پوچھا۔

"کیوں نہیں' کیوں نہیں' پدھاریئے۔" میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی خوش اخلاقی سے میں خاصا متاثر ہوا تھا کیونکہ پنجابی اور پھر سکھ بدتمیز بھلے نہ ہوں لیکن اتنے نرم اور ملائم لہجے میں گفتگو۔۔۔۔ واقعی عجیب بات تھی۔

"آپ کیا یہاں قیام فرما ہیں؟" اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔۔ لیکن فائدہ کوئی نظر نہیں آتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر برا نہ منائیں تو اپنا پرچے۔۔۔۔۔"

"ہرکاش نام ہے میرا' سیلز ایجنٹ ہوں۔ کمیشن پر کوئی کام بھی کر سکتا ہوں اور پچھلے تین روز سے کوئی بزنس نہیں ملا۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔

"بڑا آنند ملا آپ سے مل کر' میرا نام سورن سنگھ ہے۔ جالندھر میں ہماری برتن بنانے کی فیکٹری ہے۔" اس نے اپنی فیکٹری کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا بزنس کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟" مجھے پھر امید کی کرن دکھائی دی۔

"جی ہاں چاچی کی خواہش ہے کہ میں گھوم پھر کے کاروبار کا جائزہ لوں۔" اس نے بیرے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دو کافی" میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بیرے سے کہہ دیا جو میرے لئے کافی لا رہا

تھا۔

"مفت خورا میں تو زبردستی کا مہمان بن بیٹھا۔" اوپری خاصا دلچسپ اور یار باش دکھائی دے رہا تھا۔

"اگر آپ منظور فرمائیں تو میں آپ کے لئے کوئی خدمت انجام دوں۔ میں کمیشن پر بہت سی فیکٹریوں کے لئے کام کرتا ہوں۔" میں نے بڑی چاپلوسی سے کہا۔

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"یہاں شہر سے باہر چھاؤنی بن رہی ہے' وہاں سنا ہے آفیسر انچارج کوئی آیا ہے۔ باقی تو سارا سٹاف "میڈ ان مارکہ" ہی ہے۔ اس سے خاصا لمبا آرڈر مل جائے گا میس کے برتنوں کا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" اس نے بے چینی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سردار جی سیلز مین شپ مجھے وراثت میں ملی ہے۔ میں جو بات کہوں گا اس پر عمل کر کے دکھاؤں گا۔" میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

بھارت میں کمیشن ایجنٹ کے بغیر کسی کاروبار کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اس نوجوان سکھ کا تعلق سکھوں کی کاروباری قوم "پاپے" سے تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو "سوا" پوٹھوہار کے علاقے سے متعلق ہیں اور یہاں سے ہجرت کر کے بھارت گئے تھے۔ "پاپے" اپنے بچوں کو اس وقت کوئی کاروبار نہیں سونپتے جب تک کہ انہیں ان کی بصیرت کا یقین نہ آ جائے یا اپنے "سپروں" سے ان کے "کاروباری" ہونے کا ثبوت حاصل نہ کر لیں۔ یہ نوجوان اپنے کاروباری مشن پر نکلا تھا اور چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مال فروخت کر کے اپنے ماں باپ کی نظروں میں مقام حاصل کر سکے۔ اس کو ایسا کمیشن ایجنٹ مل جانا جو اس کا مال معمولی کمیشن کے عوض فروخت کر سکے' بڑی خوش بختی تھی۔

میری خوش نصیبی یہ تھی کہ مجھے "پاپا سکھ" مل گیا تھا اور وہ بھی فیکٹری کے مالک کا بیٹا۔ میرے ذہن نے ایک شاندار منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب مجھے اس پر عمل کرنے کے لئے اس کے لوازمات بہم پہنچانے تھے۔ میں نے جو معلومات اب تک حاصل کی تھیں ان کے مطابق یہ دفاعی تعمیرات فوج کی نگرانی میں ہو رہی تھیں۔ پرتیج کمپنی کے لوگ بھی فوج سے متعلق ہی تھے۔ یہاں کا آفیسر انچارج ایک سکھ کرنل تھا۔

مجھے برتن بنانے والی کمپنی کا سیلز ایجنٹ بن کر اس کرنل تک پہنچنا تھا۔

کافی آ گئی۔ نوجوان بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ میں کافی کے گھونٹ بھرتا اپنے منصوبے کی جزئیات پر غور کر رہا تھا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ منصوبہ بندی میں ذرا سی ڈھیل رہ گئی تو اس کا

نتیجہ کتنا خطرناک ہو گا۔ میں "موقع" سے ایک پاکستانی جاسوس کا گرفتار ہو جانا۔۔۔۔ وہ مجھے فوراً گولی مار دیتے' لیکن یہ خطرہ مول لینا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ وقت کم تھا اور لمبی مدت کی منصوبہ بندی کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"سردار جی آپ کیا موٹر سائیکل کا بندوبست کر سکتے ہیں؟" میں نے کافی پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

تھوڑی دیر تک کچھ سوچنے کے بعد اس نے ہاں میں جواب دیا۔

"بس تو بن گیا کام۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"کیسے یار کچھ میرے بھی پلے پڑے۔" اس نے بے چینی اور اشتیاق سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"دیکھو مہاراج' آفیسر انچارج پنجابی ہے اور یہاں مال سپلائی کرتے ہیں زیادہ تر غیر پنجابی۔ میرا خیال ہے ہمارے پنجابی ہونے کا فائدہ ضرور ملے گا لیکن شرط یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ جائیں۔ اس ذرا مدت کی ضرورت ہے۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے منصوبہ بتایا۔

"تو حکم کریا۔" اس نے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

ooo

کمیشن ملے ہو گئی اور اگلے روز علی الصبح وہ موٹر سائیکل سمیت میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ ایک گتے کے ڈبے میں سٹین لیس سٹیل کے مختلف حجم کے برتن اس نے پیچھے سٹینڈ پر باندھ رکھے تھے۔

"لو سردار جی آج ہماری بھی سیلز مین شپ دیکھو۔"

میں نے اسے اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور لفٹ کو یاد کر کے موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی۔ قریباً گھنٹہ بھر کے سفر کے بعد بالآخر ہم "ٹارگٹ ایریا" میں داخل ہو گئے۔ دفاعی نوعیت کی تعمیرات کے گرد اگرد فوج کا پہرہ تھا اور کم از کم ایک مربع میل کے علاقے میں سویلین کا داخلہ ممنوع تھا۔ میں سارے راستے اپنے ساتھی کی ہمت بڑھاتا رہا تھا کہ وہ کسی بات کی پروا نہ کرے اور بالکل نہ گھبرائے۔

پہلے خاکستی دروازے کی تو ہم نے پروا بھی نہیں کی اور اس پر متعین رکے بڑھ گئے۔ کچھ سویلین جو یہاں "ٹھیکیداری" کرتے تھے' انہیں شناختی کارڈ دکھانے کے بعد ایک مخصوص علاقے تک جانے کی اجازت تھی۔ غالباً ہمیں بھی پہریداروں نے انہی میں سے جان لیا تھا۔ اب

ہم اس علاقے میں داخل ہو چکے تھے جہاں اہم نوعیت کی عمارتیں بن رہی تھیں۔ ہمارے چاروں طرف میزائیل اور جدید نوعیت کے دیگر ہتھیار نصب تھے۔ میری پر تجسس نظریں تمام مناظر کو میرے دماغ کی فلم پر منتقل کر رہی تھیں۔

اب خاصا خطرناک مرحلہ آ گیا تھا۔ ہم آخری دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر بڑے بڑے بلڈوزر اور کرینیں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ لکڑی کے عارضی گیٹ پر دو مسلح سنتری موجود تھے۔

"ہالٹ۔" ایک نے سٹین گن کو پوزیشن میں لیتے ہوئے کہا۔

"کون ہے۔۔۔۔ کدھر جانا ہے؟" ہمارے رکتے ہی مدراسی سپاہی غصے سے بولا۔

"ہم کرنل باجوہ کے رشتہ دار ہیں۔ ان سے "سائٹ" پر ملنے آئے ہیں' میں نے بڑے بارعب لہجے میں کہا۔

"لیکن سر یہ غلط طریقہ ہے' باہر گیٹ پر رپورٹ کریں۔" دوسرا بولا۔

"کالہ جی ہمیں سب گیٹ والے جانتے ہیں' آپ شاید نئے آئے ہیں۔" میرے جواب نے اسے چند لمحوں کے لئے تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ موٹر سائیکل سٹارٹ تھی' ان لمحوں کو گنوانا میری بدقسمتی ہوتی۔ میں نے گیئر لگایا اور آگے بڑھ گیا۔ دونوں بے بسی سے ہمیں دیکھتے رہ گئے۔ ابھی ہم بمشکل دس بارہ گز چلنے پائے تھے کہ سامنے رکاوٹ آ گئی۔ یہاں ٹینٹ لگا تھا اور ایک سکھ کرنل سپاہیوں کو اشارے سے کچھ بتا رہا تھا۔

ہمیں وہاں دیکھ کر وہ سب چونک پڑے۔ دو تین سپاہی تیزی سے ہماری طرف بڑھے' کرنل اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"ست سری اکال۔۔۔۔" ہم دونوں اس اثناء میں موٹر سائیکل سے اتر چکے تھے۔

"ست سری اکال۔۔۔۔" کرنل نے جواب دیا' کون ہو تم لوگ؟ یہاں کیسے آ گئے؟" اس کا لہجہ دوآبہ والی پنجابی کی چغلی کھا رہا تھا۔

"جالندھر سے آئے ہیں مہاراج آپ کا سن کر۔" میں نے اسی پنجابی لہجے میں جواب دیا۔ اس کا تعلق ضلع جالندھر ہی لگتا تھا اور وہ مجھے سونا سکھ سمجھ رہا تھا' یہی اس کی کمزوری تھی۔

"بڑے غلط آدمی ہو' ایسے نہیں آیا کرتے۔" اس نے اتہام حجت کے لئے کہہ دیا۔

"شاکر دیجئے' مہاراج۔" میرے ساتھی نے جواب دیا۔

"آؤ میرے ساتھ کیا بات ہے؟" سپاہی منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا

اشارہ کیا۔

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ کرنل بھی جٹ سکھ تھا اور اپنے سکھ ساتھیوں کے سامنے اپنی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ راستے میں چلتے چلتے میں نے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف اور یہاں آنے کا مقصد بیان کر دیا اور اسے یہ بھی جتلا دیا کہ ہم نے یہاں تک پہنچنے کا خطرہ صرف اس لئے مول لیا تھا کہ یہاں ہمارے علاقے کا ایک جٹ کرنل پرچیز کا انچارج ہے' اب ہم ناکام واپس نہیں جانا چاہتے۔

"لیکن یارو یہاں سپلائی کرنے کے لئے رجسٹریشن کروانا پڑتی ہے۔ یہ تو غیر معمولی اقدام ہو گا۔ ٹھیک ہے ہمیں میس کے لئے برتنوں کی ضرورت ہے لیکن....."

"مہاراج جی قانون بھی آپ ہی ہیں' ہمارے آنے کا کوئی فائدہ تو ہو۔" میں نے بڑی چاپلوسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں لوکل پرچیز کے کھاتے میں تم لوگوں کو آرڈر دلوا دوں گا' لیکن مستقل سپلائی ممکن نہیں۔" اس نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

دوران گفتگو وہ چاروں طرف گھوم پھر کر وہاں کام کرنے والے عملے کو بھی ہدایات دیتا جا رہا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ اس سے بالکل اجنبی' لیکن تجسس بھرے لہجے میں وہاں نصب شدہ ہتھیاروں کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔ میرا ساتھی بھی ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ سکھ کرنل بھی ہمیں باقاعدہ ہتھیاروں کے نزدیک لے جا کر ان کا معائنہ کروا رہا تھا۔

میری شدید خواہش تھی کہ اب اس سے جان چھڑاؤں اور ذہن میں سمائی ہوئی معلومات کو فوراً احاطہ تحریر میں لے آؤں لیکن میرے ساتھی کا دل کچھ زیادہ ہی لگ گیا تھا۔ غالباً یہ سب کچھ اس کے لئے نیا اور دلچسپ تھا۔ ہم نے کرنل کو ایک کٹلری سیٹ "زبردستی" بطور تحفہ پیش کیا اور اس سے چار ہزار روپے کے برتنوں کا آرڈر لے لیا۔ دوپہر کا کھانا کرنل بانوہ نے ہمیں عارضی طور پر بنے ہوئے ایک میس میں کھلایا اور جالندھر میں ملنے کا وعدہ کر کے ہمیں رخصت کر دیا۔ میرے دوست کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

"یار واقعی تم تو کمال کے بندے ہو' میں پتا جی سے کہہ کر تمہیں سیلز منیجر کی نوکری دلوا دیتا ہوں۔" اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے مجھ سے راستے میں کہا۔

"بس سردار جی یہی تو کمزوری ہے میری' نوکری نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر مجھ پر احسان کریں تو

کمیشن ذرا بڑھا دیں۔ آپ کے لئے آرڈر لاتا رہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"یار یہ کوئی کہنے کی بات ہے' جالندھر میں مجھ سے ضرور ملنا۔" اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

کمرے میں پہنچتے ہی مجھے ایک مرتبہ پھر بڑے دلفگار لہجے میں اپنی بیماری کا ذکر کرنا پڑا' جس کے ہاتھوں میں اتنا مجبور تھا کہ شراب پینا تو کیا اسے سونگھ بھی نہیں سکتا تھا۔ سورن سنگھ کف افسوس مل کر رہ گیا۔ رات تک وہ میرے ساتھ رہا۔ ڈنر بھی اس نے کروایا تھا۔ میری کمیشن اس نے فوراً" لوا کر دی تھی کیونکہ میرا اس سے یہی معاہدہ تھا۔ اب مال سپلائی کرنا اور بل وصول کرنا اسی کے ذمے تھا۔

ooo

اسی رات میں نے رخت سفر باندھا اور لدھیانہ روانہ ہو گا۔ صبح مجھے اچانک موجود پا کر پرکاش مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

"یار اتنی دیر؟" اس نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"ایک اور دھندا مل گیا تھا۔" میں نے ہنستے ہنستے اسے ساری کہانی سنا دی' کیونکہ کرنل بانوہ اور سورن سنگھ میرے لئے بہترین "دوست" ثابت ہو سکتے تھے اور پرکاش کا حوالہ میرے لئے ضروری تھا۔

"واہ یار! آج یقین ہو گیا سکھ ہوتے ہی بیوقوف ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پشتہ میں نے اور پرکاش نے اکٹھے ہی کیا تھا۔

"ماتا اور باؤ جی تو اداس ہو گئے تھے تمہارے بغیر اور وہ بھی....." اس نے شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ کون؟" میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر پوچھا۔

"اچھا جیسے تمہیں تو معلوم نہیں' واہ جی واہ اتنا بڑا کام کر گئے اور ہم سے چوری۔" اس نے گلہ کیا۔

"پہلی چوری کی تھی زندگی میں' وہ بھی پکڑی گئی۔ ہت تیرے کی۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔

"ایک بات کہوں۔" پرکاش بولا۔

"ہوں۔" میں نے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"یہ پونم کا سوہاگیہ ہو گا اور مجھے تم اس سلسلے میں ہمدرد پاؤ گے۔" اس کا لہجہ خاصا سنجیدہ

تھا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی پرکاش۔" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

دوپہر تک لمبی تان کے سوتا رہا۔ پرکاش نے میری ہدایات کے مطابق مجھے کھانے کے وقت بیدار کر دیا۔ نہا دھو کر میں نے کھانا کھایا' پونم کی چھٹی کا وقت ہو چلا تھا' میں نے اس کے کالج کا رخ کیا۔

کالج میں عین چھٹی کے وقت پہنچا' مجھ جیسے سینکڑوں مشتاقانِ دید نے پہلے ہی کالج کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ سائیکلوں پر سوار اور پیدل بھارتی ملاؤں کی ٹولیاں' خیرات حسن بانٹتی مسکراتی ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتیں کالج کے دروازے سے برآمد ہوتیں اور کالج کے باہر پہلے سے انتظار میں کھڑے اپنے پریتم کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی راہ لیتیں۔ قریباً دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد پونم لڑکیوں کے ایک جھرمٹ سے نمودار ہوئی۔ وہ اپنی ساتھیوں میں بلاشبہ ان کی ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔

جیسے وہ اس درخت کے نزدیک پہنچی جس کے نیچے میں سراپا انتظار بنا اس کا منتظر تھا۔ میں اچانک ان کے سامنے آ گیا۔ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات اس کی خوبصورت آنکھوں میں لہرائے۔

"نمسکار۔" اس نے سنبھلتے ہوئے میرے پرنام کے جواب میں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"آپ یہاں....." اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"واپس چلا جاؤں۔" میں نے اس کا فقرہ اچک لیا۔

"پرماتما نہ کرے! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ آپ اچانک اس طرح چلے آئیں گے۔" اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ جب لفظ اپنا مفہوم کھو دیں اور کہنے کو کچھ باقی نہ رہے تو جذبوں کی خاموش زبان اظہار کا بہترین ذریعہ بن جاتی ہے۔ پونم وہ کچھ مجھے کبھی نہ کہہ پاتی جو اس کی خاموش آنکھوں نے چند لمحوں میں مجھ سے کہہ دیا۔ خود میرے جذبات بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔

ہم دونوں قدم سے قدم ملائے نزدیکی ریسٹورینٹ کی طرف جا رہے تھے' اس اثنا میں سائیکل سوار اس کی دوستوں نے ہمارے نزدیک سے گزرتے ہوئے ہم پر اچھے خاصے ریمارکس بھی کسے تھے۔ ریسٹورینٹ میں کافی پیتے ہوئے ہم دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے—— سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ ایک دوسرے سے کیا کہیں' کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔

پونم سے ملتے ہوئے بھی میں اپنا مشن کبھی نہیں بھولا تھا۔ مجھے علم تھا کہ بھارتی ایئرفورس کے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ان کے مخصوص کلب اور میس ہوتے ہیں۔ بھارتی معاشرے میں خصوصاً میرے ذاتی کردار کی وجہ سے پرکاش یا پونم کے گھر میں کسی کو میرے اور اس کے اکٹھے گھومنے پر کبھی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ فلوط تعلقات بھارتی سوسائٹی کا حصہ ہیں اور ایک ایسے نوجوان سے جو کٹر "ویشنو" ہو' شراب کباب سے نفرت کرے' کسی کی سپتری کا میل جول قطعی اعتراض کیسے ہو سکتا تھا؟"

"میرے ساتھ گھر چلئے نا۔" پونم نے ہونٹ سے نکلتے ہوئے کہا۔

"شام کو! کچھ کام ہے یہاں۔" میں نے بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا۔ یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔

ooo

اسے بس میں سوار کر کے میں واپس پرکاش کے پاس چلا آیا۔ پرکاش نے اپنے آپ کو کام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس پر دن رات امیر بننے کا خبط سوار تھا۔ قدرت نے اسے "دھرم ویر" کی صورت میں جو غیبی امداد بہم پہنچائی تھی وہ اس کا حق ادا کر دینا چاہتا تھا۔ اسے میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ پلاسٹک کے کارخانے کا انسٹرکٹر سے مالک بنا تھا تو میرے پیسے کی وجہ سے۔ اب وہ ایک ایک پیسے کی حفاظت کر رہا تھا۔ کاریگروں کے ساتھ وہ خود بھی کام میں جتا رہتا۔ میری "سلیزمین شپ" کا وہ قائل تھا اور خرچ کے تمام اختیارات میں نے اسے سونپ دیئے۔ کارخانہ بننے سے اس کی تمام تر سماجی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کام پر صرف کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اسے زبردستی تفریح کرواتا ورنہ وہ دن رات زیادہ سے زیادہ "پروڈکشن" کے چکر میں ہی رہتا تھا۔

واپسی پر میں اسے زبردستی دفتر سے اٹھا کر اپنے ساتھ فلم دکھانے لے گیا۔ چھ بجے کے بعد فلم سے فارغ ہو کر ہم دونوں رائے کوٹ چل دیئے۔ پرکاش نے ایسا باعتماد آدمی تلاش کر لیا تھا جو میری اور اس کی غیر موجودگی میں کاروبار کی نگرانی کرتا رہے۔ میں نے تو اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں کسی ذمے داری کا اہل نہیں ہوں کیونکہ میں ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا' میرے لئے سب سے بہترین منصب سلیز مین شپ ہی ہے۔ وہلی اور بمبئی سے میں اچھا خاصا آرڈر لے آیا تھا۔ برتنوں کی کمیشن میں نے اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ میری ان باتوں نے اسے میرے اور نزدیک کر دیا۔ اسے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ ضرور پچھلے جنم میں ہم دونوں بھائی تھے۔

گھر پر ماتا اور پاروتی مجھ سے یوں بغلگیر ہو کر ملے جیسے میں واقعی ان کا سپتر تھا اور ایک لمبی

جدائی کے بعد ان سے مل رہا تھا۔

"بیٹے مقامی مارکیٹ ہی میں میرے خیال میں تمہارے لئے کافی کام موجود ہے اتنی مشقت نہ کیا کرو۔" انہوں نے مجھے کمال ہمدردی سے کہا۔

"دیکھئے بابو جی! مارکیٹنگ میرا شعبہ ہے اور میں پرکاش کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ مجھے نالائق سمجھے۔ بس ہم دونوں میں دوڑ لگ گئی ہے۔ یہ مال بناتا رہے' میں اس کا نکاس کرتا رہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا یار تمہاری مرضی ملیا کے لئے اتنی بھاگ دوڑ کچھ ٹھیک نہیں۔" وہ بولے۔

"بابو جی آپ ٹھہرے کیمونسٹ' میں ابھی بنئے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میرے جواب پر وہ قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

سوامی جی

میرے پیشے کا تقاضا تھا کہ میں کبھی "آج" کی حاصل کردہ معلومات پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے روزانہ تازہ سے تازہ معلومات درکار تھیں۔ ہنگامی حالات ہونے کی وجہ سے ہوائی لڑوں پر تبدیلیاں اتنی تیزی سے رونما ہوتی تھیں کہ آج کی بات اگلے روز پرانی دکھائی دیتی تھی۔ ایک سکواڈرن آج یہاں موجود ہے تو اگلے روز اس کے منزل کے متعلق کوئی بھی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ میری کوشش یہی رہتی تھی کہ میں نئی سے نئی اور اہم ترین معلومات حاصل کر سکوں اور تازہ معلومات حاصل کرنے کی بہترین جگہ تھی فضائیہ کے کلب اور ہوٹلوں کے ڈانسنگ ہال۔ سنیچر کی رات خوبصورت ہوتی تھی۔ ہوٹلوں کے ڈانسنگ ہال اور کلبوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ قریبی شہروں کی خوبصورت مستقبل کے خواب دیکھنے والی بھارتی ناریاں اور "مخصوص طبقہ" کی نوجوان لڑکیاں بھی عموماً انہی ہوٹلوں میں زیادہ پائی جاتی تھیں' جہاں ان افسران کی آمد متوقع رہتی تھی۔

شراب کے نشے میں دھت بھارتی فضائیہ کے افسران اور ان کی بیگمات اکثر "ڈپریشن" سے نجات پانے کے لئے ایسے اول جلول بک جاتے تھے جن میں مطلب کی نہایت اہم بات موجود ہوتی تھی۔ میری خواہش پر پونم نے وہ ساڑھی خصوصی طور پر پہنی جو میں نے اسے پہلی ملاقات میں پیش کی تھی۔ پونم کے ساتھ رات کو میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کلب کی طرف جا رہا تھا جو افسران کے لئے مخصوص تھا۔ مجھے اپنا تو علم نہیں کہ میں کیسا لگ رہا تھا لیکن پونم کے متعلق یہ بات دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بھارت کی سب سے زیادہ خوبصورت کنیا لگتی تھی۔

جیسے ہی وہ میرا ہاتھ تھامے "آفیسرز کلب" میں داخل ہوئی' ہال میں بیٹھے تمام لوگوں کی نظریں اس کی سمت اٹھیں۔ اسے دیکھنے والوں میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی۔ ہوس ناک نظریں' حاسد نظریں' رشک بھری نظریں' سب ہی نظروں نے پونم کا احاطہ کر لیا تھا۔ ہمارے ایک کونے میں رکھی میز کے گرد بیٹھنے تک کچھ لوگ گردنیں موڑے ہمیں دیکھتے رہے۔ ان کی میلی نظریں پونم کو سو لینا چاہتی تھیں۔

"مجھے تو بڑی لاج آ رہی ہے۔" پونم لوگوں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

"اور مجھے مزا آ رہا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے میز پر رکھا مینو اٹھالیا۔

چند منٹ کے بعد ہی ایک مشروب بیرا ہمارے سر پر موجود تھا۔ میں نے پونم کی خواہش پر صرف کافی کا آرڈر دیا۔

"کتنے قابل رحم ہیں بے چارے' اتنی سندر دیوی کو میرے ساتھ دیکھ کر یہ جلنے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔۔۔۔" میں نے ان کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے پونم سے کہا۔

ابھی بیرے نے کافی لا کر رکھی ہی تھی کہ ڈانسنگ میوزک شروع ہو گیا۔ مختلف جوڑے اٹھ اٹھ کر ڈانسنگ فلور کی سمت جا رہے تھے۔ پونم نے کچھ نہ کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ماحول اس کے لئے بالکل اجنبی ہو۔ ہمارے ساتھ والی میز پر دو کیڈٹس جنہیں شاید حال ہی میں کمیشن ملا تھا' شراب کے نشے میں اپنی اکلوتی پارٹنر کو چیخ چیخ کر اپنے کارنامے سنا رہے تھے۔ ان لوگوں کی شاید یہ "مشترکہ محبوبہ" تھی اور دونوں نشے کی حالت میں اس کے سامنے زیادہ نمبر بنانے کے چکر میں خاصی اہم نوعیت کی معلومات اگل رہے تھے اور میں بڑی دلچسپی سے انہیں "ننگل" رہا تھا۔

پونم نے کئی مرتبہ بے چینی سے پہلو بدل کر اپنی بیزاری کا اظہار کیا لیکن میں نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کئے رکھا۔ اچانک جیسے سارے ہال کو سکتہ ہو گیا۔ ایک عجیب و غریب شخصیت دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایک لمبا تڑنگا رشی اندر داخل ہو رہا تھا۔ شدید سردی کے موسم میں بھی اس کے جسم پر کپڑے کی صرف دو چادریں تھیں۔ ایک جو اس نے باندھ رکھی تھی اور دوسری اس نے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

آرکسٹرا خاموش تھا' اس کے پاؤں میں پہنی کھڑاؤں کی آواز ہی سناٹے کو مجروح کر رہی تھی ورنہ تو سارے ہال نے سانس روک رکھا تھا۔

"لو لکھ نرنجن!" اس نے اندر گھستے ہی زور سے پکارا۔

"مہاراج آ گئے۔"

"بھگوان آ گئے۔"

"پرماتما آ گئے۔" مختلف آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔

"فراڈ ہے سالا' ایک دم فراڈ۔" شرابی کیڈٹ جس نے سارے ہال کے ساتھ ہی چپ سادھ لی تھی' اچانک چلایا۔

جہاں جہاں اس کی آواز پہنچی' لوگوں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اس کی طرف گھور رہی تھیں۔ سادھو کے ہال میں داخل ہوتے ہی لوگ مختلف کونوں

سے اٹھ اٹھ کر اس کی قدم بوسی کرنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد ان نیم برہنہ لڑکیوں کی تھی جو خاص طور سے سیکنڈ کی رات کو یہاں آیا کرتی تھیں۔ کیڈٹ کی بات ختم ہوتے ہی اچانک بار کاؤنٹر پر بیٹھا ایک نوجوان جو خود بھی کوئی آفیسر دکھائی دیتا تھا' اس طرف بڑھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"کیا بکتے ہو۔" وہ غصے میں چلایا۔ شراب نوشی سے اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے دکھائی دے رہی تھیں۔

"رک جاؤ بالکے۔" اچانک سادھو مہاراج چلایا اور یوں لگا جیسے دونوں پر سحر طاری ہو گیا ہو۔ وہ بڑے پروقار انداز میں چلتا اس میز کی طرف آیا۔

"شانتی! شانتی!" اس نے ہاتھ اٹھا کر دونوں سے نظریں ملائے بغیر بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"پر بھو' اس نے....." حملہ آور نے غصے سے کچھ کہنا چاہا۔

"شانت رہو بالکے اس پر کردھ اندری کا راج ہے' پرماتما اس کی رکھشا کرے۔" سادھو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

"آنند مانو۔" اس نے اچانک آرکسٹرا کی طرف دیکھ کر زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ "رگھو پتی مہاراج دیانند جی کی جے۔" سارے ہال نے نعرہ لگایا اور دوسرے ہی لمحے آرکسٹرا حرکت میں آ گیا۔ ناچنے والوں میں جوش و خروش مہاراج کی آمد سے بڑھ گیا تھا۔ بڑا ہیجان خیز منظر تھا۔

تھرکتے جسموں کا شیطانی رقص اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔

مہاراج نے حسب عادت گردن جھکائی' پھر وہ اچانک مڑا اور میرے سر پر براجمان ہو گیا۔

پونم نے اپنے قریب پاکر اٹھ کر اس کے پاؤں چھو لئے۔ مجھے بھی بادل نخواستہ اس منحوس عمل کو دہرانا پڑا۔

"کلیان ہو' کلیان ہو!" اس نے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور ہمارے سامنے براجمان ہو گیا۔

میں نے دل ہی دل میں نجانے کتنی گالیاں اسے دے ڈالیں۔ اس کے یہاں آتے ہی میرے قریبی میز والوں کا سلسلہ گفتگو بند تو نہیں ہوا تھا' البتہ اس میں پہلے والی سرگرمی باقی نہیں رہی تھی کیونکہ ان کی محبوبہ بھی ہال میں موجود درجنوں خوبصورت لڑکیوں کی طرح مہاراج دیانند سوامی کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھی۔ نجانے یہ کمبخت کیا شے تھی جسے دیکھتے ہی لڑکیاں آفیسروں کی بغلوں سے نکل کر اس کے پاؤں میں آ بیٹھی تھیں۔ کوئی اس کے پاؤں دبا رہی تھی

اور کوئی اس کے چرنوں میں بیٹھی تھی۔

میرے سامنے تصویر کے دونوں رخ تھے۔ ایڈین اتھلی جنس کو بھی بخوبی اس بات کا علم تھا کہ ایسی جگہوں کا رخ غیر ملکی جاسوس ضرور کرتے ہیں' اس کے علاوہ بھی وہ لوگ اپنے شرابی اور بدکردار افسران کو اپنے زیر نگرانی رکھتے تھے اور ایسے مقامات پر ضرور موجود رہتے تھے۔ سوامی دیانند کو دیکھتے ہی نجانے کیوں میرے دل سے ایک ہی آواز اٹھ رہی تھی۔ اس کا تعلق ضرور اتھلی جنس سے ہے۔ اب اس کی اپنے نزدیک "تشریف آوری" کو بھی میں نے کوئی اچھا شگون نہیں جانا تھا۔ خوبصورت عورتوں کا اس کے گرداگرد جمگھٹا دیکھ کر مجھے یہ اندازہ تو ہو چلا تھا کہ وہ کس قسم کا "بھگوان" ہے۔ ایسے "پرماتما" کا پونم ایسی خوبصورت کنیا کے نزدیک براجمان ہونا بھی سمجھ میں آ سکتا تھا لیکن یہ بات بھی میرے پیش نظر تھی کہ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں اور وہ بھی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ـــــ ان حالات میں بھارتی اتھلی جنس مجھے چیک نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سوامی دیانند کی آمد میری میز پر معمول کے مطابق ہرگز نہیں تھی۔ مجھے اس کا بخوبی احساس تھا۔ میں بھی محتاط ہو کر بیٹھ رہا۔ خود کو اس سے لاتعلق ظاہر کر کے خوامخواہ مصیبت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا' میں بھی اس پر مٹا جا رہا تھا اور اس کی اپنے پاس آمد کو "سوبھاگیہ" گردان رہا تھا۔

میری شدید خواہش پر مہاراج نے میری طرف سے "سوم رس" پینا قبول کر لیا تھا۔ ہال میں موجود خاصے لوگ تو پہلے ہی پونم کی وجہ سے مجھ سے حسد کر رہے تھے۔ اب مہاراج کی آمد نے مجھے ان کی نظروں میں غیر معمولی اہمیت دلا دی تھی۔ جتنی دیر مہاراج بیٹھے رہے' انہوں نے بمشکل چند باتیں ہی اپنی طرف سے کی تھیں ورنہ تو وہ زیادہ تر لوگوں کی باتوں کا جواب ہی دیتے رہے تھے۔ مختلف عورتیں باری باری ان کے چرنوں میں بیٹھ جاتیں' سوامی جی اپنی دھیان میں غرق ہو جاتے اور اچانک جھک کر کوئی بات اس کے کان میں کہہ دیتے۔ عورت بات سن کر اٹھتی' ان کی قدم بوسی کرتی اور الٹے پاؤں اپنی کرسی پر واپس چلی جاتی۔

"تم بہت خوش قسمت ہو بالیکے۔" اس نے اچانک میری طرف نظریں اٹھائیں۔ ایک لمحے کو تو مجھے زبردست ذہنی جھٹکا لگا' ضرور اس کی نظروں میں کوئی مقناطیسی قوت پوشیدہ تھی لیکن اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔

"سندری کو ساتھ لے کر ہمارے آشرم میں آنا' مہاگرو تمہیں اپنے درشن دیں گے۔" اس نے فقرہ مکمل کرتے ہی نظریں جھکا لیں۔

"ہمارا سوبھاگیہ مہاراج ہم سر کے بل آئیں گے۔" پونم نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

آرکسٹرا تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ مہاراج بھاشن دینے والے تھے' پھر سوامی جی کا بھاشن شروع ہوا۔ بھاشن کیا تھا نفسیات کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے پجاریوں کو جنسی آزادی کا سبق دے رہا تھا اور "شریر کو فنا کر کے آتما کی آزادی" کا اسپوٹین فارمولا رلائن اور گیتا کے مختلف اشلوکوں کی مدد سے سنا رہا تھا۔

جیسے ہی اس کا بھاشن ختم ہوا' لوگ پھر سجدے میں گر گئے اور سوامی دیانند مہاراج "شانتی" اور "کلیان" کا راگ الاپتے وہاں سے پدھار گئے۔ ان کے جاتے ہی نئی مصیبت آ گئی۔ اب لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو کر ہمیں "ودھائی" دے رہے تھے کیونکہ مہاراج ہم پر خاص طور پر "دیال" ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں ہم دونوں میں سے کسی میں ضرور کوئی "گپت شکتی" سمائی تھی جس نے مہاراج کو خاص طور سے ہماری طرف متوجہ کیا تھا۔

جب پڑھے لکھے ہندو طبقے کا یہ حال تھا تو جاہل عوام کے نظریات کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کی ذہنی پستی پر لعنت بھیجی اور ان کیڈٹس کی طرف متوجہ ہو گیا جو سوامی جی کے جاتے ہی اپنی مشترکہ محبوبہ کو گالیاں دینے لگے تھے جس نے مہاراج کو دیکھتے ہی طوطے کی طرح ان سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

"فراڈ ہے سالا' ایک دم فراڈ' میں اسے خوب جانتا ہوں۔" ابھی اس کا لیکچر جاری تھا کہ اچانک دو تین نوجوان مختلف میزوں سے اٹھے اور اس پر پل پڑے۔ اپنے ساتھی کو پٹتا دیکھ کر اس کا دوست بھی مقابلے پر اتر آیا اور وہاں وہ دھما چوکڑی مچی کہ خدا کی پناہ!

میں پونم کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے گیا۔ رات کے قریباً بارہ بج رہے تھے۔ کلب کے باہر دو تین خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم گھر روانہ ہو گئے۔ پونم اور میں دونوں اپنے آپ کو اس بدشگونی کا باعث جان رہے تھے۔

"تمہیں تو بور ہی کیا یہاں لا کر!" میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں تو ـــــ میں تو خود شرمندہ ہو رہی تھی شاید میری وجہ سے ـــــ"

"تمہاری وجہ سے ایک کلب تو کیا دو ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ سکتی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے فقرہ مکمل کر دیا۔

اس کے شرما جانے کی ادا پر بے اختیار مرمٹنے کو جی چاہا۔

گھر پہنچنے تک ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ میرے جانے کا مقصد کافی حد تک حل ہو چکا تھا' مجھے وہاں مختلف لوگوں کے آپس میں بحث مباحثے سے کچھ نئی باتوں کا علم ہوا تھا جو

کہنے والوں کی نظروں میں تو کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں لیکن ان کی میرے ملک کے نزدیک کیا اہمیت ہو گی' اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتا تھا۔ پونم کے قریب کا احساس اتنا سرور انگیز تھا کہ میں شاید اس کیفیت کو بیان نہ کر پاؤں۔ جب وہ میرے ہمراہ ہوتی تو میرا من بڑھ جاتا تھا۔

ooo

واپسی پر نہر کے قریب سے ٹیکسی گزری تو میں چونک اٹھا۔ یہ نہر ہوائی اڈے کے قریب سے گزرتی تھی اور شاید حفاظتی اقدامات کی غرض سے وہاں آرمی ڈیپلائے ہو رہی تھی۔ ساری رات میرے ذہن میں نہر اور اس کے اردگرد کا علاقہ گھومتا رہا۔ ہوائی اڈے کے گرداگرد ایسے دفاعی حصار کا علم ضروری تھا۔ مجھے بے چینی سے صبح کا انتظار تھا تاکہ اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکوں۔ اگلے روز چھٹی تھی۔

صبح میری تجویز پر سب نے نہر کے کنارے پکنک منانے کا پروگرام بنا لیا۔ علی الصبح میں نے ماتاجی کو یہ تجویز پیش کر دی تھی۔ وہ تو سنتے ہی کھل اٹھیں۔

"بیٹا تمہیں تو بھگوان نے ہمارے لئے اوتار بنا کر بھیجا ہے۔ جل پوجا تو ہمارا دھرم ہے لیکن پرکاش کے باپو جی نجانے کس مٹی کے بنے ہیں۔ پچھلے سال بھر سے مجھے نہر کا منہ نہیں دیکھنے دیا۔" انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میرا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی میں مجھے وہاں کام کرنے کا موقعہ مل جائے گا بلکہ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں وہ لوگ اتنے مصروف رہیں کہ انہیں میرے بارے میں سوچنے کی فرصت نصیب نہ ہو۔

زندگی سے اپنے حصے کی مسرتیں حاصل کرنا ہر انسان کا فرض ہے لیکن وقت نے کبھی انہیں اتنی مہلت نہ دی تھی کہ باپو جی انہیں اس طرح گھما پھرا کر لاتے۔ ایک عرصے سے ماتاجی انہیں "ویشنو یاترا" کے لئے کہہ رہی تھیں لیکن وہ ہر مرتبہ بات گول کر جاتے۔ صرف اس لئے نہیں کہ بقول ان کے انہیں ایسی فضولیات سے نفرت تھی بلکہ اس کا بڑا سبب پیسے کا نہ ہونا تھا۔ اب ان کے لئے جہاں ایک باعزت زندگی گزارنے کے مواقع میسر تھے وہاں انہیں مجھ جیسا "دھرم پتر" بھی مل گیا تھا جو زبردستی ان کی جھولی میں ان کے حصے کی خوشیاں ڈال رہا تھا۔ جب کبھی میں ان لوگوں کو فلم یا کسی دوسرے تفریحی پروگرام کی تجویز پیش کرتا تو باپو جی جذباتی ہو جاتے۔ مجھے اس بوڑھے کیونسٹ پر بڑا رحم آتا اور اس بات کا یقین ہونے لگتا کہ قدرت نے بلاوجہ مجھے ان لوگوں سے نہیں ٹکرایا۔ شاید اب خدا کو انہیں کچھ سکھ دکھانا ہی مقصود تھا۔

میرے شدید اصرار پر موسی جی بھی ہمارے ساتھ جا رہی تھیں۔ ایک مقامی ٹمپو پر بیٹھ کر وہ

لوگ نہر کی طرف چل دیئے۔ نہر کے کنارے پر ایک جگہ لوگوں نے تالاب کی شکل دے کر وہاں ایک مورتی کھڑی کر رکھی تھی۔ مورتی ہو گی تو مندر بھی ہو گا اور مندر بنے گا تو پوجا بھی ہو گی۔

ہندو بھی بڑی عجیب و غریب قوم ہے۔ پوجا کے لئے ان کے کوئی خاص دیوتا مخصوص نہیں۔ میں نے انہیں ایک چیونٹی سے لے کر پہاڑ تک کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ کیونکہ تمام دریا کیلاش پربت سے نکلتے ہیں' اس لئے ان میں سے نکلنے والے ندی نالے بھی قابل پرستش ہیں۔ نہر کے متعلق تو انہیں علم تھا کہ یہ "گنگا جل" ہے' اس لئے یہاں کچھ زیادہ ہی سرگرمی دیکھنے میں آتی تھی۔ نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ پکی سڑک بنی ہوئی تھی جس پر سے گزر کر لوگ "ماتا مندر" کو جاتے تھے' معاملہ چونکہ پوجا کا تھا اس لئے انڈین آرمی وہ سڑک بند نہ کرنے پر مجبور تھی۔ یہ الگ بات کہ انہوں نے وہاں اپنی سیکورٹی خاصی پھیلا دی تھی بلکہ حال ہی میں پاکستانی جاسوس بھی اس علاقے سے گرفتار ہوا تھا۔ اخبارات کے مطابق وہ جاسوس پکنک منانے والوں کی آڑ میں فوٹو گرافی کر رہا تھا۔ اس جاسوس کی گرفتاری کے بعد سے تو انتظامات اور بھی سخت ہو گئے تھے۔

باقی تمام لوگ تو ٹمپو پر چلے گئے جب کہ میں اور پرکاش موٹر سائیکل پر آ رہے تھے کیونکہ ہمیں بازار سے کچھ فروٹ بھی خرید کر لے جانا تھا۔ نہر کے قریب پہنچتے ہی موٹر سائیکل "پروگرام" کے مطابق جھٹکے کھانے لگی۔

"کیا ہوا؟" پرکاش نے پریشانی سے پوچھا۔

"پلگ' کچرا' پٹرول میں ملاوٹ یا کوئی اور گھپلا۔" میں نے گردن موڑ کر جواب دیا۔

"یار نہ جانے یہ مصیبت کیوں پال رکھی ہے باپو جی نے؟" پرکاش بولا۔

"کاش تم نے بھی کوئی مصیبت پالی ہوتی!" میں نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

نہر کی سڑک پر کچھ دور تک تو موٹر سائیکل چلتی رہی' جیسے ہی ایک آرمی یونٹ کے نزدیک پہنچے' وہ اچانک بند ہو گئی۔

"کہاں مروا دیا سالی نے—— یار اس میں تو پلگ پانا بھی نہیں ہے۔" پرکاش پریشانی سے بولا۔

"اچھا کچھ کرتے ہیں۔" میں نے اسے فروٹ کی ٹوکری تھما دی۔

ہم موٹر سائیکل گھسیٹتے ہوئے ایک انٹی ایئر کرافٹ گن کے نزدیک پہنچ گئے' جسے بڑے خوبصورت طریقے سے کیموفلاج کیا گیا تھا۔ نزدیک ہی ایک آرمی ٹرک کھڑا تھا' جس سے جوان

سامان اتار رہے تھے۔ ٹرک پر لگے "بنالین مارک" پر بھی لیپا پوتی کی گئی تھی لیکن اس کا کچھ حصہ ابھی تک نمایاں تھا' جس کا علم ہونا بہت ضروری تھا۔ سب لوگ حیرانی سے ہماری سمت دیکھ رہے تھے۔

"جے ہند!" ہم نے قریب پہنچتے ہی انہیں پرنام کیا۔

"جے ہند!" دو تین جوان بولے۔

"سر شما کیجئے آپ کو ڈسٹرب کیا' ایک مشکل پیش آ گئی تھی۔" میں نے سارا فقرہ انگریزی میں بول کر اس میجر پر اپنی اہمیت جتلا دی تھی جو ان سب میں سینئر نظر آ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں' آل رائیٹ۔" اس نے فراخدلی دکھائی۔

چند منٹ کے بعد ہی اپنی فروٹ والی آدھی نوکری خالی کروانے کے بعد ہم ان کے ایک لانس نائیک سے پلگ کھلوا کر صاف کروا چکے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک ایسی چابی نکالی تھی جس سے ہماری موٹر سائیکل کا پلگ کھلا اور موٹر سائیکل بھی خود ہی سٹارٹ کر کے ہمارے حوالے کی تھی۔ جاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ہم نے "جے ہند" کا نعرہ لگایا اور وہاں سے چل پڑے۔ تمام جزئیات میرے ذہن میں نقش ہو چکی تھیں۔ پرکاش نے موٹر سائیکل کے چلتے ہی ایک موٹی سی گالی انہیں دی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

"باپ کا مال سمجھ رکھا ہے' ویر جی انہیں کچھ دینے سے بہتر تھا آپ اسے دریا میں پھینک دیتے۔"

"یار اپنی سینا سے محبت کرنا سیکھو۔" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

جواب میں اس نے "سینا" کو دو تین گالیوں سے نواز دیا۔ یہ بات میں نے اکثر محسوس کی تھی کہ بہت کم لوگ بھارت میں اپنی فوج سے محبت کرتے تھے۔ زیادہ تر انہیں غاصب اور عیاش ہی قرار دیتے تھے۔ یوں تو بھارتی حکومت اپنے جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتی' لیکن سویلین ملازمین کے مقابلے میں فوج کو بے پناہ سہولتیں حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کا پڑھا لکھا طبقہ فوج کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ ان دنوں ابھی ۷۱ء کی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی اور عوام ۶۲ء میں چین سے اور ۶۵ء میں پاکستان کے ہاتھوں اپنی فوج کی درگت کا تماشہ دیکھ چکے تھے۔

"مجھے دس پٹانے دے دو' ابھی سب کو بھگا دوں گا۔" پرکاش نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے اس موضوع پر مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل ہی دل میں مجھے اس بات

سے بے حد خوشی ہوئی کہ اسے اپنی فوج سے نفرت ہے۔ میں تو اسے پکنک ہی کہوں گا کیونکہ سوائے بوڑھوں کے اور کوئی تالاب کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ کافی لوگ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ نہر کے کنارے بنے ہوئے مختلف باغات کے ہر محفوظ کونے میں کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ چمٹائے بیٹھا تھا۔

ooo

بابو جی کے کچھ واقف لوگ مل گئے تھے جو آپس میں ملکی حالات پر بحث کر رہے تھے۔ چونکہ ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا' اس لئے ان کی باتیں بھی حکومت کے خلاف تھیں۔ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کانگریس کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رہی تھی۔ بھارت میں کافی عرصے سے چلنے والی زیر زمین تحریک "نکسل باڑی" کا چرچا ان دنوں پنجاب میں بھی سننے میں آ رہا تھا۔ پہلے یہ لوگ کلکتہ اور مہاراشٹر تک ہی محدود تھے لیکن آہستہ آہستہ وہ سارے بھارت میں پھیل رہے تھے۔ پچھلے دنوں انہوں نے جالندھر کے ایک ڈی۔ ایس۔ پی کو گولی مار دی تھی جس کے بعد سے حکومت پنجاب کمیونسٹ لیڈروں کی خصوصی نگرانی کر رہی تھی--- یہاں بھی یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ ان لوگوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ضرور کسی اہم "چکر" میں ہیں۔ میرے قریب ہونے کی وجہ سے حالانکہ وہ خاصی محتاط گفتگو کر رہے تھے لیکن میری چھٹی حس نے مجھے ان کے متعلق نجانے کیوں شک میں مبتلا کر دیا۔ بات تو میرے مطلب کی نہیں تھی' بہرحال میں نے اس روز بابو جی کو "چیک" کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی دوپہر کا کھانا جو پونم اور ماتا جی نے مل کر وہیں ایک سٹوو پر تیار کیا تھا' کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک دھماکہ خیز خبر سنائی دی۔

"سوامی دیانند جی مہاراج سکھوں کو درشن دینے آئے ہیں۔"

سوامی جی کا نام سنتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کمبخت یہاں بھی آن مرے گا۔ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ ہر مشتبہ جگہ پر مہاراج پہنچ جاتا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ضرور اس شخص کا انٹیلی جنس سے کوئی تعلق ہے کیونکہ حال ہی میں اس علاقے سے ایک جاسوس کی گرفتاری نے اسے "مشتبہ" بنا دیا تھا جس کی وجہ سے یہاں بھارتی سیکورٹی کا عمل دخل خاصا بڑھ گیا تھا۔ ابھی کل ہی میری ملاقات سوامی سے ہوئی تھی اور وہ بھی خصوصی ملاقات۔ اگر اس نے آج بھی مجھے یہاں دیکھ لیا تو خواہ مخواہ میرے متعلق کسی وہم میں مبتلا نہ ہو جائے۔

میرے متعلق انٹیلی جنس کا شک خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ رائے کوٹ میں میری آمد حال ہی میں ہوئی تھی۔ انٹیلی جنس والے فوراً میرے ماضی کا تعاقب شروع کر دیتے' جس کا

کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس طرح وہ لوگ اپنا جال بنتے بنتے بہرحال مجھ تک پہنچ جاتے۔ اس بات کے امکانات قطعی تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سوامی دیانند وہی ہو جو وہ نظر آتا ہے لیکن میں خطرہ کیوں مول لوں؟ میں نے سوچا۔

پرکاش' میں' باجوجی اور پونم تاش کھیل رہے تھے جب اچانک میرے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" سب نے باری باری پریشانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس ذرا طبیعت خراب ہے۔ باجوجی میرا خیال ہے میں گھر چلوں' مجھے آرام کرنا چاہیے ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔" میں نے تاش کے پتے ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ بیٹے' ٹھیک ہے ہم بھی پیچھے آ رہے ہیں۔" باجوجی بولے۔

میرے علاوہ پونم کا یہاں رہنا بھی کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا اپنا کوئی "کلو" باقی چھوڑنا مجھے گوارہ نہ تھا۔

"آپ لوگ تو سوامی جی کے درشن بھی کریں گے۔ میرا خیال ہے میں اور پونم موٹر سائیکل سے چلے جائیں۔" میں نے خود تجویز پیش کر دی۔ جواب میں باجوجی نے مہاراج دیانند کو بے شمار گالیوں سے نواز دیا۔ پرکاش کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کیونکہ ابھی اس کی کوششوں کے باوجود بھی مجھے اور پونم کو تنہائی میسر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی دانست میں شاید اب میں یہی چاہتا تھا۔ اس نے مجھے اور پونم کو چلتا کیا۔ باقی سب کو وہ لے کر مہاراج کے درشن کرنے چلا گیا جب کہ باجوجی اپنے دوستوں کے پاس جا بیٹھے۔

جیسے ہی ہم لوگ رائے کوٹ جانے والی سڑک پر گھومے' میری طبیعت بحال ہو گئی۔ پونم میری اچانک صحت یابی سے سب کچھ سمجھ گئی۔ گھر پہنچتے ہی وہ مسکراتی ہوئی گویا ہوئی۔

"کمال ایکٹنگ کرتے ہو' آپ کو تو....." فقرہ اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی اس سلسلے میں حساس ہو آ جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں' میرے سوا تمہیں کوئی نہ دیکھے' کوئی نہ چاہے۔" میں نے خاص قلمی لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

پونم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کافی دیر ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہمیں شام ڈھلنے کی خبر تب ہوئی جب سب گھر والے واپس آ گئے۔ سوہی اور ماتا جی مہاراج دیانند سوامی کے گن گا رہی تھیں۔ انہیں مہاراج کی شکل میں "پرمو" کے درشن جو ہو گئے تھے جب کہ دونوں باپ بیٹا اسے سارے راستے کوستے آئے تھے۔

"کمبخت نے ساری تفریح کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔" باجوجی نے اسے کوستے ہوئے کہا۔

ooo

ہم لوگ اگلی صبح لڈھیانہ آ گئے۔ تین چار روز بعد ایک دن میں اپنے انتہائی خطرناک مشن پر جا رہا تھا۔ مجھے ہوائی اڈے کے تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود رات کے اندھیرے میں اڈے میں داخل ہو کر ایک خاص نوعیت کی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس اثناء میں میرے چہرے پر داڑھی اگ آئی تھی اور دو تین مزید تبدیلیوں سے میری شکل بالکل بدل چکی تھی۔ سرشام ہی میں ہوائی اڈے کے قریبی جنگلوں کا رخ کر رہا تھا۔

کسان اپنے بیلوں کے ساتھ واپس لوٹ رہے تھے۔ میں نے ایک پنجالی (بیلوں کے گلے میں ڈالنے والی) اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ دیہاتیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کپڑوں میں کیا کیا چھپا تھا' اس کا علم مجھے یا پھر میرے خدا کو تھا۔ دور سے دیکھنے پر یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی دوسرے کسانوں کی طرح ایک کسان ہوں جس کی فصل سڑک کے دوسری طرف واقع ہے۔ وہاں اپنا کام ختم کرنے کے بعد اب گاؤں واپس جا رہا ہوں۔ ہوائی اڈے کے گرداگرد دو رویہ سڑک کے دونوں کے مختلف لوگوں کی زمین تھی اور شام کو وہ سب اسی راستے سے گزر کر اپنے اپنے گاؤں کو چلا کرتے تھے۔ جو ہوائی اڈے کے نزدیک سے گزرتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ کھیتوں کی منڈیروں پر چلتا ہوائی اڈے کے مخصوص علاقے کے گرد لگائی گئی حفاظتی باڑ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس اثناء میں میری نظریں بڑی بے چینی سے چاروں اطراف کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ بظاہر تو اس بات کے کوئی آثار نہیں تھے کہ مجھے کسی نے دیکھا ہے' کیونکہ سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے اب آہستہ آہستہ اندھیرا بھی چھانے لگا تھا۔ یہ چودھویں چاند کی رات تھی جسے میں نے خاص طور سے اپنے مہم کے لئے منتخب کیا تھا۔ جیسے ہی ہوائی اڈے کی حدود شروع ہوئیں۔ ایک لکڑی کے بورڈ پر میری نظر پڑی جس پر وارننگ دی گئی تھی کہ اس جگہ سے آگے جانا جرم ہے۔ میں نے بڑی لمبی جنگلی گھاس میں جسے "کیمو فلاج" کے نظریے کے تحت انڈین ایئر فورس نے خود ہی پروان چڑھایا تھا' پنجالی پھینکی اور خود بھی بڑی پھرتی سے اس میں رینگ گیا۔ اپنے ہاتھوں پر میں نے احتیاطاً ربڑ کے باریک دستانے چڑھا لئے تھے۔ کمر کے گرد بندھا تسلہ بند میں نے اپنے جسم کے گرداگرد کس کر باندھ لیا تھا اور اپنے اصلی لباس میں جو خاصا چست تھا' واپس آ گیا تھا۔

گھاس کے اندر ہی اندر رینگتے ہوئے آواز پیدا کئے بغیر میں خاردار تار کی باڑھ کے نزدیک پہنچ چکا

تھا۔ یہ پہلی حفاظتی باڑھ تھی۔ میں نے چاروں طرف آہٹ لی اور اطمینان کرنے کے بعد بڑی پھرتی سے ایک چھوٹے سے پلاس کی مدد سے اسے کاٹ کر اپنا راستہ بنایا۔ پھر اسے جوڑ کر ٹھیک کیا اور اندر جا گھسا۔ آگے ایک نالہ بنایا گیا تھا جسے عبور کرنا ذرا مشکل دکھائی دیتا تھا لیکن اللہ کی مدد شامل حال تھی۔ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر میں نے اسے بھی عبور کر لیا۔ اس کے بعد پھر لمبی لمبی گھاس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ گھاس ٹیلوں کے ایک سلسلہ پر اگی ہوئی تھی۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ نزدیک ہی ایک تار نظر آیا' جس کا سلسلہ کسی جست کی پلیٹ نما شے سے ملا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں' میں بھارتی سیکورٹی کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے یہاں ہونے والی غیر معمولی نقل و حرکت نوٹ کرنے کے لئے ایسے حساس آلات کا سلسلہ چاروں طرف پھیلا رکھا تھا جو معمولی سی آہٹ کو بھی ریکارڈ کر سکتے تھے۔

ان آلات کا بروقت علم ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مزید احتیاط کے ساتھ آگے رینگ گیا۔ اب میں اسی سڑک کے نزدیک پہنچ گیا تھا جو ہوائی اڈے کے چاروں طرف گشتی دستوں کے لئے بنائی گئی تھی ——— مجھے یہاں رک کر "پٹرول پارٹی" کا انتظار کرنے کے بعد آگے جانا تھا۔ قریباً" آدھ گھنٹہ تک میں زمین سے چپکا وہیں لیٹا رہا' جب اچانک دور سے آنے والی جیپ کی آواز سن کر میرے اعصاب تن گئے۔

تاریکی بڑھ گئی تھی اور دور کی چیزیں بجلی کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھیں۔ سوائے ان بڑی بڑی ریوہیکل عمارتوں کے جو یہاں سے کم از کم ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایستادہ تھیں اور جن میں سے ایک عمارت میں مجھے داخل ہو کر معلومات حاصل کرنا تھیں۔ گشتی پارٹی کی جیپ میرے نزدیک آکر ٹھہر گئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں اچانک بے قابو ہونے لگیں۔ جیپ کے ہڈ پر لگی ایک طاقت ور سرچ لائٹ کی روشنی وہاں پڑنے لگی۔

"کہیں انہیں شک تو نہیں ہو گیا۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ہاتھ میں پکڑے پستول پر میری گرفت اور سخت ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح گھاس میں چھپا رکھا تھا اور دم سادھے زمین سے چپکا ہوا تھا۔ روشنی کا ہالہ میرے اوپر ہی اوپر سے گھومتا ہوا اب آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ابھی میں بمشکل آگے بڑھنے کے ارادے سے زمین سے اٹھا ہی تھا کہ اچانک مجھے پھر اسی پوزیشن پر واپس آنا پڑا۔ کوئی پیدل گشتی پارٹی اس طرف آ رہی تھی۔

میں سنبھل ہی پایا تھا جب دو تین سائے مجھے اپنے قریب ہی رینگتے دکھائی دیئے۔ جنگلی

گھاس میں مختلف جگہ ٹارچوں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ وہ ٹارچیں تھیں جو ان لوگوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ سرچ لائٹ سے بچنا تو ممکن تھا لیکن ٹارچ کی روشنی' اُفوہ! میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح میں نے پستول کے سیفٹی کیچ کو کھولا اور اسے فائر کی پوزیشن میں کر کے آنے والے حالات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اچانک میرا دل زور سے دھڑکا ——— ایک لمبا فوجی بوٹ میرے منہ کے سامنے موجود تھا اور پٹرول پارٹی کا جوان میرے سر پر ٹارچ لئے کھڑا تھا۔ میری تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں' میں نے بمشکل پستول کا رخ لیٹے ہی لیٹے اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ ایک ایک لمحہ قیامت ڈھا رہا تھا۔

ooo

میں اُسی پوزیشن میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھئے یا ان کی بیوقوفی کہ ٹارچ بردار گارڈ میرے سر پر کھڑا ہو کر اردگرد روشنی ڈالتا رہا جب کہ میں اس سے چند انچ کے فاصلے پر موجود تھا۔ پھر مجھے ایک اور جیپ کے انجن کی قریب آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ جیپ بھی ٹھیک اسی جگہ آکر رک گئی اور ایک آواز گونجی۔

"کچھ ملا؟"

"نو سر۔" غالباً" میرے سر پر مسلط گارڈ نے جواب دیا تھا۔

"شٹ اپ ——" اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ "اسے ڈھونڈو' وہ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایک مرتبہ پھر میرے اردگرد ٹارچوں کی روشنی پھیلنے سمٹنے لگی۔ اب بھاگتے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ غالباً" وہ لوگ چاروں طرف پھیل رہے تھے۔

زمین میں چھپے حساس آلات نے انہیں میری موجودگی سے خبردار کر دیا تھا۔ ایک ہی کروٹ لیٹے لیٹے اب مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ پھر اچانک میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ نجانے کس قسم کا کیڑا تھا جس نے میری ٹانگ پر کاٹا۔ میں نے تربیت کے مطابق اینٹی سنیک (سانپوں کے کاٹے سے مدافعت کی) گولیاں تو نگل رکھی تھیں لیکن اس بات کا مجھے علم تھا کہ بسا اوقات ایسے زہریلے سانپ بھی ہوتے ہیں جن کے زہر کا اثر روکنے میں یہ گولیاں ناکام رہتی ہیں۔ درد کی شدت اور جلن کو قابو کرنے کے لئے مجھے بار بار اپنے ہونٹ کاٹنے پڑتے تھے۔ خدا کا شکر ہوا کہ وہ کوئی سانپ نہیں تھا' جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اب وہ لوگ آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں آنے والے ایک خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ "اگر یہ لوگ کتے لے آئے تو ــــــ"

اس سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ وہ خاص نوعیت کے اہم مقامات پر متعین گارڈ کے پاس سدھائے ہوئے کتے ہوتے ہیں جو شکار کو چند منٹ میں ڈھونڈ لیتے ہیں اور بھاگنے والوں کی تکہ بوٹی کر ڈالتے ہیں۔ پھر جیسے میں خود ہی مطمئن ہو گیا۔ میں نے سوچا "اگر ایسی بات ہوتی تو اس مرتبہ آنے والی جیپ میں کتا بھی ہوتا۔ غالباً" قریبی کھیتوں سے جنگلی جانور بھی بسا اوقات یہاں گھس آتے ہوں گے۔ ان کی آہٹ کا نوٹس لینا خاص طور سے ان حالات میں جن سے بھارتی افواج آج کل دوچار تھیں بہت ضروری تھا۔" پھر میری بات کی تصدیق اسی گو بردار آواز نے کر دی جس نے سب کو چلا کر مجھے ڈھونڈنے کا حکم دیا تھا۔ "یار کوئی جنگلی جانور ہو گا۔ یہ سالے پوسٹ والے خواہ مخواہ پریشان کر دیتے ہیں۔ کم آن بوائے۔" اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز سن کر میری جان میں جان آئی۔

قریباً" پانچ منٹ تک میں دم سادھے لیٹا رہا۔ اس اثناء میں' میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اس بات کا جائزہ لے لیا تھا کہ میں بھاگنے کے قابل بھی رہ گیا ہوں یا نہیں؟ ٹانگ پر ہاتھ پھیرنے سے مجھے سوجن کا احساس ہوا لیکن جلن اب قریباً" ختم ہو چکی تھی۔ لیٹے لیٹے میں نے پانچ چھ مرتبہ ٹانگ کو ہلایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب سوائے سوجن کے باقی معاملہ ٹھیک ہی تھا۔ میں بغیر آہٹ پیدا کئے اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اندھیرے میں میری آنکھیں بھی اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔

○○○

میں نے سرسری نظر اس سڑک پر ڈالی جسے "پٹرولنگ پارٹی" استعمال کرتی تھی۔ اس بات کا اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب خطرہ ٹل چکا ہے۔ میں اپنی جگہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ کھسکتا اس درخت کے قریب آ گیا جس کے بعد سڑک کو عبور کر کے مجھے قریبی "ورکشاپ" تک پہنچنا تھا۔ ورکشاپس کی مختلف بلڈنگیں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر تعمیر کی گئی تھیں۔ سب ہی بلڈنگوں کی مشابہت قریباً" ایک جیسی تھی۔ ان کی چھتوں کو لوہے کے بڑے بڑے شیڈ بنا کر ڈھانپا گیا تھا اور ان پر گہرا خاکی رنگ کر کے کافی حد تک کیموفلاج بھی کر دیا گیا تھا۔ ورکشاپس کی دیواریں بھی خاکی رنگ میں ہی رنگی ہوئی تھیں۔

سڑک میں نے پھرتی سے عبور کر لی تھی۔ اب میں نزدیکی ورکشاپ تک پہنچ چکا تھا۔

ورکشاپ کے گرداگرد لگے بلب اور سرچ لائٹیں ہنگامی حالات کی وجہ سے قریباً" آف تھیں۔ صرف ایک دو بلب کہیں کہیں جلتے نظر آ رہے تھے۔ رات کے وقت ہوائی اڈے کی ورکشاپیں عموماً" بند ہو جاتی ہیں لیکن ایمرجنسی کے دوران کچھ بھی ممکن تھا۔ میں نے ایک ورکشاپ کی دیوار کے قریب کھڑے ٹرک کی اوٹ میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ یہ بڑے بڑے ٹرک عموماً" اوور لوڈنگ کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور ورکشاپوں کے اردگرد کھڑے تھے۔

اب میرا رخ نزدیکی ورکشاپ کے ٹائیلٹ کی طرف تھا۔

ٹائیلٹ میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک باہر کا محدود روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں بڑی پھرتی سے ٹرک کی اوٹ سے نکلا اور ٹائیلٹ میں جا گھسا۔ قریباً" تین چار منٹ کے بعد ہی میرے جسم سے بندھے پلاسٹک کے مضبوط تھیلے میں رکھی انجن ایمرجنسی پولیس کی وردی میرے پہلے سے پہنے ہوئے لباس پر منتقل ہو چکی تھی۔ پلاسٹک کا تھیلا فلش کے باہر رکھے کوڑا کرکٹ کے ڈرم میں غائب ہو چکا تھا۔

ہوائی اڈے کا تنظیمی ڈھانچہ گو کہ خاصا منظم ہوتا ہے لیکن بہت بڑی تنظیم ہونے کی وجہ سے لاکھ حفاظتی اقدامات کے باوجود اس میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسا "خلاء" رہ جاتا ہے جہاں سے ایک ذہین جاسوس اس میں داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہاں سیکورٹی گارڈ کی اپنی اپنی حدود متعین ہیں اور ہر گروپ کے ذمے الگ الگ فرائض ہیں۔ عموماً" ورکشاپوں وغیرہ کے گرد پہرے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ حالت جنگ کی البتہ اور بات تھی کیونکہ اس وقت "کمانڈوز" کے ممکنہ حملے کے پیش نظر چپے چپے پر مسلح گارڈز موجود رہتے ہیں۔

میری حاصل کردہ اطلاعات کے مطابق کسی ورکشاپ کے گرد اول تو کوئی سیکورٹی گارڈ مقرر ہی نہیں تھا۔ اگر ایک آدھ ہوا بھی تو مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میں اسے بآسانی قابو کر سکتا تھا۔ اردگرد دور دور تک کسی کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنی پی کیپ خاصی جھکا رکھی تھی۔ پہلی نظر میں میری شناخت ممکن نہیں رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا کہ شام سے چھائے گہرے بادل اب برس جائیں۔ کبھی کبھی دو چار بوندیں ٹپکتیں اور سلسلہ بند ہو جاتا۔ اب تو جیسے مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ بارش نہیں ہو گی۔

میں بظاہر لاپرواہ سا ٹہلتا ہوا ورکشاپ کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ جب اچانک میری نیچے کی سانس نیچے اور اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ چند گز کے فاصلے سے ایک دوسری ورکشاپ کی اوٹ سے اچانک ایک سیکورٹی گارڈ نکل کر میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر

اچانک قدرے ٹیڑھے ہو کر چلنا شروع کر دیا تھا۔

جیسے جیسے وہ میرے قریب آتا جا رہا تھا' میرے جسم میں بجلیاں دوڑنے لگی تھیں۔ میری خواہش تھی کہ وہ مجھ سے بغیر گفتگو کئے آگے نکل جائے لیکن بظاہر ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے چند فٹ کی دوری سے پکارا۔

"شیکر" شاید یہاں کسی شیکر کی ڈیوٹی تھی۔

اس اثناء میں میرے ذہن نے ایک تجویز سوچ رکھی تھی' ابھی اس کے منہ سے بمشکل شیکر ہی نکلا تھا جب میں نے اس کے مخالف سمت منہ کر کے آہستہ آہستہ کھانسنا شروع کر دیا۔ کھانستے کھانستے میں آہستہ آہستہ نیچے کو جھکتا جا رہا تھا۔ آنے والا شاید میری خیریت دریافت کرنے کے لئے تیزی سے میری طرف آیا۔ اسے اپنے قریب محسوس کرتے ہوئے میں نے پھرتی سے رخ بدلا۔ میرا زوردار گھٹنا اس کے پیٹ کے نچلے حصے پر اور زوردار ہاتھ اس کی کنپٹی پر ایک ساتھ لگے تھے۔ آدمی کمزور دل کا دکھائی دیتا تھا۔ بیچارے کو منہ سے آواز نکالنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

زمین بوس ہونے سے پہلے وہ میرے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آ چکا تھا۔ مجھے کچھ نہ سوجھا' اسے بھی میں اپنے ساتھ ہی ورکشاپ میں لے آیا۔

ورکشاپ کا بغلی دروازہ کھلا ہی ملا۔ بے ہوش گارڈ کو میں نے ایک کونے میں لٹایا۔ اس کی بے ہوشی کو لمبا کرنے کے لئے میں نے اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر اسے سونگھا دیا تھا۔ اب تین چار گھنٹے سے پہلے اس کے خود بخود ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا۔ کوئی اور اسے جگا دیتا تو الگ بات تھی۔

اندر ہلکی روشنی کے ایک دو بلب جل رہے تھے۔ میری توقع کے عین مطابق ورکشاپ میں ایک جہاز کے انجن کے مخصوص حصے مرمت یا اوور ہالنگ کے لئے ایک ٹریلر پر رکھے تھے۔ چند منٹ کے بعد ہی میں ان کے ایک ایک پرزے کو اپنے پاس موجود ایک چھوٹے سے طاقت ور کیمرے کی مدد سے اپنی "گرفت" میں لا چکا تھا۔ پرزوں پر لگے مختلف ٹریڈ مارک میرے ذہن میں سما چکے تھے۔

ابھی میں بمشکل چند قدم ہی چل پایا تھا کہ اچانک لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔ میری ٹانگ میں زبردست ٹیس اٹھی تھی' غالباً" زخم پھر سے ہرا ہو رہا تھا۔ درد سے بے حال ہو کر میں نے قریبی دیوار کا سہارا لیا۔ ذرا سکون ملا تو دوبارہ قدم آگے بڑھانا چاہا لیکن ایک مرتبہ پھر منہ میں آنے والی چیخ کو ضبط کرتے ہوئے اسی پوزیشن میں واپس آنا پڑا۔ "اف میرے خدایا—— کیا

اتنی زبردست کامیابی کے بعد میں ایک کیچوے کی طرح بھارتی ایئرفورس کے قابو آ جاؤں گا۔" میں نے سوچ اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

اچانک پیش آنے والی صورت حال نے مجھے رلا دیا۔ میں خاصا جذباتی ہو چلا تھا جب قدرت کو مجھ پر رحم آیا اور رک رک کر ہونے والی بوندا باندی نے اچانک زوردار بارش کی صورت اختیار کر لی۔ اب کم از کم مجھے اتنا تحفظ تو حاصل تھا کہ بارش کی وجہ سے شاید ہی کوئی اس طرف آتا۔

میرے کپڑے بھیگنے لگے تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے قدم بڑھائے۔ درد سے میرا برا حال تھا لیکن کسی نہ کسی طرح گھسٹتے ہوئے میں نے خطرے کی پہلی حد یعنی سڑک عبور کر لی۔ سڑک سے تاروں کی پہلی باڑ تک کا فاصلہ میں نے قریباً" کہنیوں کے بل ہی طے کیا تھا۔

واپسی کا سفر کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر لوہے کی خاردار تاروں میں سے راستہ بنایا اور وہ فاصلہ جو مجھے اپنی تربیت کے مطابق تین یا چار منٹ میں عبور کر جانا چاہیے تھا' وہ صدیوں پر محیط نظر آنے لگا۔ خدا خدا کر کے قریباً" آدھ گھنٹے بعد کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا میں اس کھیت تک پہنچ گیا جہاں مجھے کپڑوں سے "نجات" حاصل کرنا تھی۔

میری سانس بری طرح پھولنے لگی تھی۔ سارا جسم پسینے سے نہا گیا تھا' موت کا خوف تھا یا میری قوت ارادی کہ درد کا احساس اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ ہنگامی ضرورت کے تحت اپنے پاس پہلے سے موجود اسپرین کی دو تین گولیاں نگلنے کے بعد اب قدرے افاقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ میں لنگڑاتا ہوا کھیت سے باہر نکلا اور اپنے مقررہ راستے پر چلنے لگا۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے بہت دور چلے جانا تھا۔

صبح جب سورج کی روپہلی کرن نے تاریکیوں کے چھٹ جانے کا مژدہ سنایا تو میں نے اندازے کے مطابق اپنی خستہ حالی کے باوجود کم از کم دس میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ میں محفوظ تو ہو چکا تھا لیکن ٹانگ کی بری حالت تھی۔ سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے جلد از جلد کسی ڈاکٹر تک پہنچنا تھا۔

ایک لاری میں بمشکل میں لدھیانہ پہنچا۔ دوران سفر میں نے زبردستی اپنے آپ کو نارمل رکھا۔ لدھیانہ لاڑے کی بجائے شہر سے باہر ہی اتر گیا۔ اب میرا رخ ایک مقامی ڈاکٹر کی دکان کی طرف تھا جس سے میرا تعارف پرکاش نے کروایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی کلینک جانے کی تیاری کر رہے تھے جب میں ان سے ٹکرا گیا۔

انہوں نے مجھے پہچانتے ہوئے خصوصی توجہ اور کمال مہربانی سے مجھے دیکھا۔

"کمال ہے سوجن اتنی زیادہ کیسے ہو گئی ——— شاید کسی "ٹھوئیں" نے کاٹا ہے۔" انہوں نے میری سوجھی ہوئی ٹانگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔

"جناب اصل میں کل رات ایک جگہ پیشاب کرتے ہوئے کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ اس وقت تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ اب صبح سے درد ہونے لگا ہے۔" میں نے صفائی پیش کی۔

"تو یوں کہو نا یار بے احتیاطی کی وجہ سے یہ حالت ہوئی ہے۔"

انہوں نے مجھے دو انجکشن لگائے۔ ٹانگ پر معمولی سی نشتر زنی کے بعد پٹی باندھی۔ دوائیوں کی ایک فہرست لکھ کر مجھے تھما دی اور فیس لے کر چلتا کیا۔ ایک رکشہ میں پہلے میں سٹیشن پہنچا۔ جہاں ایک لاکر میں اپنی ضروری اشیاء محفوظ کیں اور دوبارہ رکشہ کے ذریعے پرکاش کے پاس جا پہنچا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"پہلے یہ لاؤ پھر دوسری بات کرنا۔" میں نے دوائیوں کا نسخہ اسے تھما دیا۔

پرکاش اگلی بات کرنے سے پہلے بھاگا بھاگا باہر گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ کے بعد ہی ہو گئی۔

اسی اثناء میں، میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے ایک شاندار کہانی گھڑ لی تھی۔ پرکاش مطمئن ہو گیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ گھر میں کسی کو اس حادثے کی اطلاع نہ دے۔ میں انہیں خواہ مخواہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ پرکاش نے میری یہ درخواست اس شرط پر مانی کہ میں کم از کم ایک مہینہ کہیں نہیں جاؤں گا' بڑی کڑی شرط لگائی تھی اس نے ———!

تین دن میں نے بیماری کی حالت میں گزارے۔ ٹانگ کی سوجن نے بخار کی کیفیت پیدا کر دی تھی' پھر بخار شدت اختیار کرنے لگا لیکن میں نے بڑے جبر سے اپنی حالت کو پرکاش کے سامنے بظاہر نارمل بنائے رکھا۔ مجھے تشویش تھی کہ وہ گھبرا کر کہیں بابو جی کو اطلاع نہ کر دے۔ تیسرے دن میری حالت خاصی سنبھل گئی۔ اب مجھے چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ صحت یاب ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے "بل" کی فکر کی اور اسے "محفوظ ہاتھوں" کے ذریعے اپنے ملک میں پہنچا دیا۔

پانچویں روز جب میں اچھی طرح چلنے کے قابل ہو گیا تو میں نے رائے کوٹ کو رخت سفر باندھا۔ پرکاش کام کی زیادتی کی وجہ سے لدھیانہ ہی رہ گیا۔ ہفتے کا دن تھا میں نے سوچا اگلے روز چھٹی ہے' پونم سے بھی ملاقات رہے گی۔ میرا ارادہ اس مرتبہ سوامی جی کو "چیک" کرنے کا تھا کہ

آخر یہ مہاتما ہیں کیا؟

بابو جی سے نکسل باڑیوں کے روابط بھی مدنظر تھے کیونکہ زیر زمین چلنے والی تحریکیں کسی ملک کی سیاست میں کیا کردار ادا کرتی ہیں' مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ ذاتی طور پر مجھے خود بھی خواہش رہی تھی کہ میں ان لوگوں کو قریب سے کام کرتے ہوئے دیکھوں جو ایک لمبے عرصے سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

"چارو موزمدار" ان دنوں بھارتی اخبارات کی شہ سرخیوں کا موضوع بنا ہوا تھا۔ یہ پراسرار شخص نکسل باڑی تحریک کا سربراہ تھا جسے بھارتی حکومت نے ایک زبردست مقابلے کے بعد زخمی حالت میں گرفتار کر لیا تھا۔ تفتیش کے بدترین مراحل سے گزارنے کے بعد اسے کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا تھا' جہاں وہ حسب روایت "پراسرار بیماری" کی وجہ سے چل بسا۔ گو کہ حکومت نے اس کے لواحقین کو ڈرا دھمکا کر چارو موزمدار کی طبعی موت کی تصدیق کروا لی تھی اور اس کی بیماری کے سرٹیفکیٹ بھی اخبارات میں چھپ رہے تھے لیکن حقیقت کیا تھی؟ بھارت کا ہر باشعور شہری اس سے آگاہ تھا۔ چارو کی موت کے بعد ملک کے قریباً تمام بڑے بڑے اخبارات کو نکسل باڑیوں کی دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں کہ وہ بھارت کے ہر صوبے میں اعلیٰ سول حکام کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے "عظیم نیتا" کو "شردھا منجلی" بھینٹ کریں گے۔

انہوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کلکتہ کے اس ایس۔پی کو موت کے گھاٹ اتارنے سے کر دیا تھا جس نے چارو موزمدار کی تفتیش کی تھی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ البتہ قاتلانہ حملے سے بچ گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ لمبی سرکاری رخصت لے کر نجانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔

ooo

میں شام ڈھلے رائے کوٹ پہنچا۔ بابو جی گھر پر نہیں تھے' کسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ میری آمد کا سنتے ہی پونم میرے کمرے میں مجھ سے ملنے چلی آئی۔

"نمسکار!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔

میرے ذہن میں اہنسا کی وہ تصویر ابھری جس میں پاربتی نے اپنے دونوں ہاتھ اسی طرح سینے پر باندھے ہوئے تھے۔ اس کی سرمگیں آنکھوں کے گہرے پانیوں میں' میں ڈوب ڈوب گیا۔ پونم کو دیکھتے ہی ایک عجیب سا سرور ——— ایک طمانیت' ایک گمبھیر سے سکون کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اس کے حسن میں ایک تقدس تھا' رکھ رکھاؤ میں اک حجاب۔ وہ ایسی ہی حسین تھی جیسے کرسمس کارڈ پر بنے ہوئے خوبصورت فرشتے ہوتے ہیں۔

اسے دیکھ کر مجھے سکول کے زمانے میں پڑھی وڈز ورتھ کی ساری نظمیں یاد آ جاتی تھیں۔

اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں راستہ بھول کر پریوں کے دیس میں آنکلا ہوں۔ وہ لمحے امر ہو جاتے جو اس کی صحبت میں گزرتے۔

"کہاں غائب رہے شہزاد جی اتنے روز؟" اس نے شکایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں اسے کیا بتاتا؟ میرا جی چاہتا تھا اس سے کہہ دوں کہ میں اس سے بچ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ اس کے تصور سے چھٹکارا میرے لئے کب ممکن ہے؟ لیکن رعب حسن تھا کہ اسے کہتے کو بات بدل بدل جاتی تھی۔

"ذرا طبیعت خراب تھی' چوٹ لگ گئی تھی۔ سوچا تم لوگوں کو پریشان کیوں کروں؟" میں نے جواب دیا۔

"کہاں لگی چوٹ؟" اس نے بے چینی سے کہا۔

"یہاں ——!" میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اور پونم لجا گئی۔ دھنک رنگ اس کے گالوں پر قوس و قزح کی طرح پھیل گئے' اس کی حیا آلود نظریں جھک جھک گئیں۔

"آپ کو تو مذاق کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں —— میں چائے لاتی ہوں آپ کے لئے۔" اس نے نظریں جھکائے ہوئے کہا اور باہر چلی گئی۔

پونم واپس آئی تو میں کپڑے بدل کر تیار ہو چکا تھا۔ آج میں نے دوبارہ "ایمرز کلب" جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ہوائی حوادث پر گزرنے والی قیامت کے اثرات کس حد تک باقی ہیں۔ پونم کو ساتھ لے جانے کے لئے اب مجھے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی نہ ہی شاید پونم کو۔ ہم دونوں صرف اتمام حجت کے لئے گھر والوں کے سامنے اپنی روانگی کا اعلان کر دیا کرتے تھے۔

بابو جی کا کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بالآخر ہم دونوں کلب کی طرف روانہ ہو گئے —— اس مرتبہ میں نے موٹر سائیکل پر سفر کرنے کو ترجیح دی تھی۔ ہم کلب میں پہنچے تو ایک مرتبہ پھر حریصانہ نظروں نے پونم کا احاطہ کر لیا لیکن میں نے پونم کا ہاتھ تھامے رکھا اور ایک کونے میں رکھی میز سنبھال لی —— آج سوامی جی نظر نہیں آ رہے تھے اور میرے دل سے دعا نکل رہی تھی کہ خدا کرے اس کی منحوس صورت یہاں دکھائی نہ دے۔

میں نے پونم کی خواہش پر "صرف کافی" کا آرڈر دیا اور اس میں کھو گیا —— آہ کتنے خوبصورت لمحے تھے جو اس کی صحبت میں گزرتے تھے! زندگی انہی خوبصورت لمحوں سے تو عبارت ہے۔

"آپ سوامی جی کے آشرم نہیں جائیں گے کیا ——؟" پونم نے اچانک بیٹھے بیٹھے سوال کر دیا۔

"ہرے رام! یہ وقت ایسے موضوعات پر گفتگو کرنے کا ہے؟" میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔

"ایک بات کہوں پرکاش بابو ——" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اگر سوامی کی بات کرنی ہے تو نہ کہنا۔ ہاں اور کوئی بات ہو تو کہہ ڈالو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غمگسار لہجے میں جواب دیا۔

"نجانے مجھے کبھی کبھی یہ احساس کیوں ہونے لگتا ہے کہ آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔" اس کی اس بات نے ایک لمحے کے لئے تو سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑا دی۔

"کیا لگتا ہے؟" میں نے لہجہ شوخ بنائے رکھا۔

"کچھ بھی —— میں شاید وضاحت نہ کر پاؤں۔ مجھے آپ کی طرح بڑے بڑے لفظ بولنے نہیں آتے۔ بس مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے پچھلے کئی جنموں سے مجھے آپ کا انتظار تھا اور اب تو من کا سوا گھر بیتا نظر آتا ہے لیکن یہ کیسا جذبہ ہے جو میرے اندر ہی اندر مجھے میری کم مائیگی کا احساس دلاتا رہتا ہے' نجانے مجھے کیوں دشواش نہیں ہوتا کہ آپ کو کبھی پا بھی سکوں گی؟"

اس لمحے اس کی بات نے مجھے بھی جذباتی کر دیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ پچھلے کئی روز سے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پاتی تھی۔ اب شاید میرے پانچ روز تک بغیر اطلاع دیئے غائب رہنے کی وجہ سے اس کو صبر آ گیا تھا اور اس نے اپنا دل کھول دیا تھا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ دل کی گہری کا دستور ہی نرالا ہے۔ یہاں سب سے پہلے آنے والا مسافر ہی اس کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ جس کیفیت کا وہ شکار تھی' میں بھی اسی آگ میں جل رہا تھا۔ پونم سے میری محبت اس حباب کی مانند نہیں تھی جو ندی کی سطح پر ایک لمحے کے لئے نمودار ہو کر غائب ہو جائے۔ اس میں تو دریا جیسی گہرائی تھی۔ اس کی تپش تو مجھے کبھی بھی جلا سکتی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی لگائی ہوئی آگ میں جل رہے تھے۔

"ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ تم ہمیشہ حتمی نقطہ نظر سے کیوں سوچتی ہو؟" میں نے دل پر جبر کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہمارے ساتھ ویشنو یاترا ضرور چلنے۔ بابو جی آپ کو منع تو کریں گے لیکن میرے لئے —— وہاں مانگنے والی ہر منت پوری ہوتی ہے۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے ہاں کر دی۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ کلب میں ابھی تک کسی کے منہ سے میں نے ہوائی لڑے پر ہونے والے "واقعے" کے متعلق کچھ نہیں سنا تھا یا پھر ان لوگوں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے کیونکہ بھارتی سیکورٹی کم از کم اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ ایسی بات کی ہوا کسی کو لگنے ہی نہ دیتی۔ نئے سکولوئرنوں کی آمد' افسران کے تبادلے' شکائتیں' نئے نئے انکشافات اور مختلف سکینڈل (جن کا موضوع زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ فلاں افسر کی بیوی فلاں کیڈٹ سے پینگیں بڑھا رہی ہے اور فلاں کی فلاں سے) یہ تھے وہ موضوعات جن پر عموماً" یہاں گفتگو سننے کو ملتی تھی۔

ہم اگرچہ دوسری مرتبہ کلب میں آئے تھے لیکن ابھی وہاں کے مستقل بیٹھنے والوں نے پونم کو نہیں بھلایا تھا۔ ان کے لئے باعث حسد بات یہ بھی تھی کہ اعلیٰ فوجی افسران کے ہوتے ہوئے آخر ایک سول لڑکے سے پونم کی دوستی چہ معنی دارد؟ کیونکہ اعلیٰ فوجی افسران کی ذہنی تربیت ہی کچھ اس انداز میں کی جاتی ہے کہ کم از کم لڑکیوں کی حد تک وہ خود کو بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت جانتے ہیں۔ عجب بات کہ بھارت میں آج تک مارشل لاء نہ لگنے کے باوجود وہاں فوج کے خلاف خاصی نفرت پائی جاتی ہے۔ خصوصاً" پولیس اور فوج کے درمیان تصادم اور تلخ کلامی تو آئے روز اخبارات میں پڑھنے کو ملتی ہے۔

ہمیں بیٹھے ہوئے ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا جب میں نے ایک سمارٹ براہمن آفیسر کو اپنی میز کی طرف بڑھتے دیکھا' وہ سول کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو.....؟" اس نے بڑے مؤدب لہجے میں پوچھا۔

"اوہ! کیوں نہیں' کیوں نہیں!" میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار---" اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"پرکاش اور پونم۔" میں نے پونم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پونم نے ہاتھ ملانے سے بچنے کے لئے پہلے ہی ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ کلب میں آنے والی کسی بھارتی ناری سے یہ امید تو کم ہی ہوتی تھی کہ وہ شرم و حیا کا مظاہرہ کرے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کبھی کبھی کوئی "بھارتی ملا" بھی آ جاتی--- جس کے متعلق عموماً" وہ لوگ یہی اندازہ لگاتے تھے۔ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ دو چار روایتی باتوں کے بعد ہم بے تکلفی سے آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم تو "کلب" کو "واحد شریفانہ تفریح گاہ" سمجھ کر یہاں چلے آتے ہیں' کیونکہ دور نزدیک اور کوئی اچھی جگہ بیٹھنے کے لئے نہیں ملتی! پونم کو

میں نے اپنی منگیتر بتایا۔ اس تعارف نے ہی راجکمار کے ارمانوں پر اوس ڈال دی تھی لیکن وہ جلدی ہتھیار پھینکنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"آپ لوگ کبھی میس میں آیئے نا۔" اس نے مجھے بڑی پرخلوص دعوت دی۔

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں--- میں نے ایک آدھ فقرے میں اپنی لدھیانہ معصومیت کا رونا رو کر اس کی پرخلوص دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے وعدہ کر لیا کہ ضرور آؤں گا۔

فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار کی درخواست پر ہم نے ایک مرتبہ پھر اس کی منگوائی ہوئی کافی پی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ باتیں تو بظاہر مجھ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظروں نے پونم کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ پونم کو سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ عورت تھی اس لئے مرد کی حریص نگاہوں کا مجھ سے زیادہ بہتر اندازہ لگا سکتی تھی۔

"مجھے آپ کی مارشل لائف بہت پسند ہے۔" میں نے بالآخر مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"شکریہ آپ لوگ آیئے تو آپ کو کچھ دکھائیں' میں ایرونائیکل انجینئر ہوں۔" اس نے میری بات سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

قریباً" گیارہ بجے رات تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ میں اسے ہیر پھیر کر ایئرفورس کی طرف لے آتا تھا۔ دوران گفتگو میں نے اس کو اس بات کا مطلقاً" احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ فوج کی تنظیم (Organisaion) کے متعلق معمولی سی معلومات رکھتا ہوں کیونکہ ہم جنگ کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔ اس لئے راجکمار کے سامنے مجھے (خاکم بدہن) اپنے ملک کے خلاف خوب خوب زہر اگلنا پڑتا تھا۔ جواب میں مجھے انتہائی اہم معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ جدید ترین ایئرکنٹرول سسٹم' بھارتی فضائیہ کے دفاعی اقدامات' حملہ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ وغیرہ وغیرہ۔

گیارہ بجے کے قریب جب وہ ٹائیلٹ جانے کے لئے اٹھا تو پونم نے سکھ کا سانس لیا۔ اس اثناء میں وہ زبردستی ہماری گفتگو میں صرف "ہوں' ہاں" کرتی رہی تھی۔

"پرماتما کے لئے اب اس مصیبت سے جان چھڑایئے اور گھر چلئے۔" اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"اخلاق بھی کسی چیز کا نام ہے اور پھر اس بے چارے نے ہم پر بیس پچیس روپے ضائع کئے ہیں۔ اسے کم از کم جی بھر کے اپنا دیدار تو کرنے دو۔" میری بات پر پونم چڑ گئی۔

رانجلکار واپس آیا تو ہم جانے کے لئے تیار تھے۔ میں نے مزید وقت اس کی "اچھی صحبت" میں نہ گزارنے پر معذرت کرتے ہوئے اس سے اجازت لی اور ہم اٹھ گئے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ رانجلکار ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ آخری لمحے تک پونم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اب تو میں بھی رقابت محسوس کرنے لگا تھا۔

سردی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا لیکن پونم کی ہمراہی نے مجھے سارے راستے ٹھنڈک کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خواہ مخواہ میں کسی کی نیند غارت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے گھر سے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا۔

ooo

گھر میں داخل ہوتے وقت میں نے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔ میری متوقع آمد کے پیش نظر ماتا جی نے دروازہ کھلا رکھا تھا۔ پونم دوسرے دروازے سے اپنے گھر چلی گئی۔ میں اندر داخل ہوا تو چونک پڑا۔ بیٹھک کی لائٹ جل رہی تھی۔ عموماً اس وقت لائٹ نہیں جلا کرتی تھی اور سارے گھر والے دس بجے ہی لمبی تان کے سو جاتے تھے۔

باپو جی رات کو دیر گئے گھر ضرور آیا کرتے تھے لیکن انہوں نے گھر میں کبھی اتنی رات گئے تک کام نہیں کیا تھا۔ عموماً ان کی میٹنگیں ان کے دفتر میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ شاید کوئی مہمان ہو؟ میں نے سوچا لیکن ایسا کون سا مہمان تھا جس کی آمد کی خبر مجھے نہ ہوتی کیونکہ اس دوران میری کوشش یہی رہی تھی کہ اس گھر میں آمدورفت رکھنے والے ہر شخص کے متعلق مجھے معلومات حاصل ہو جائیں۔ مبادا کوئی میری لاعلمی میں میرے لئے خطرہ نہ بن جائے۔

میرا فطری تجسس تھا یا میرے بزنس کا تقاضا کہ میں نے چھپ کر وہاں موجود لوگوں کی گفتگو سننے کا ارادہ کر لیا۔ گھر کے باقی تمام لوگ لمبی تان کر سو رہے تھے۔ سردیوں کی وجہ سے بیٹھک کا دروازہ بند تھا۔ اندر شاید کسی معاملے میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ میں بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کئے پنجوں کے بل آگے بڑھا اور بند دروازے سے کان لگا دیئے۔

دو لوگ کسی پولیس افسر کو قتل کرنے کے طریق کار پر بحث کر رہے تھے۔ باپو جی اور ان کے حامیوں کا خیال تھا کہ اسے دن دہاڑے بھرے بازار میں گولی ماری جائے خواہ اس میں کوئی ورکر ہی کیوں نہ کام آ جائے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس طرح دہشت سے کی گئی واردات کا اثر زیادہ دیرپا ثابت ہو گا اور پولیس گھبرا جائے گی۔ اس طرح ممکن ہے پولیس کے اعلیٰ افسران بھی آئندہ "مکمل باڑیوں" کو گرفتار کرتے ہوئے گھبراہٹ محسوس کریں۔ جب کہ دوسرے گروپ کا کہنا تھا کہ بجائے شور شرابہ کرنے کے چپ چاپ اپنا کام کیا جائے اور اس پولیس افسر کو رات

میں سوتے میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ کارروائی مکمل ہونے کے بعد پولیس کے اعلیٰ افسران کو ٹیلی فون کے ذریعے اس قتل کی اطلاع دے کر آئندہ خطرناک اقدامات کی دھمکی دی جائے۔

قریباً دس پندرہ منٹ تک بحث مباحثہ کرنے کے بعد بالآخر ان لوگوں نے کثرت رائے سے باپو جی کی بات مان لی اور اس بات کا فیصلہ ہوا کہ پولیس افسر (جو جالندھر کا پولیس کپتان تھا اور جس نے دو "مکمل باڑیوں" کو گرفتار کرنے کے بعد فراری کے بہانے گولی مار دی تھی) دن دہاڑے قتل کیا جائے۔ اس سلسلے میں ان لوگوں نے امریک سنگھ کا نام منتخب کیا جو ستانی کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم کارکن تھا۔ میں چپ چاپ واپس چلا آیا۔ اس واردات کے لئے انہوں نے دس دن بعد کی تاریخ مقرر کی تھی کیونکہ وہ افسر جسے گولی مارنی تھی ان دنوں دہلی گیا ہوا تھا۔

ویشنو یاترا

بابو جی اور ان کے ساتھیوں کے متعلق سوچتا سوچتا میں سو گیا—— صبح پونم نے آکر مجھے جگایا۔ آج چونکہ چھٹی تھی اس لئے وہ گھر پر ہی تھی۔

بابو جی سے ناشتے پر ملاقات ہوئی "کب آئے تھے یار تم لوگ؟" انہوں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"آپ اس وقت مصروف تھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے بابو جی کے چہرے کا رنگ بدلا' لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔

"اوہ بس کیا بتاؤں کل تمہارے جاتے ہی کچھ دوست آ گئے تھے۔ وہ لوگ بضد تھے کہ آج میرے گھر ہی تاش کھیلیں گے۔ میں نے تمہاری ماتا کو سوتے دیکھ کر ہاں کر دی۔ کیا کروں یار وہ لوگ پہلے ہی کہتے ہیں۔ مَیں بیوی سے ڈرتا ہوں۔" میں بھی ان کے ساتھ ان کی بات پر ہنس پڑا۔

بابو جی کا رات والا روپ میں نے ابھی تک نہیں بھلایا تھا۔ میں نے فی الحال اس معاملے کو جوں کا توں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"بیٹا ہم لوگ ویشنو یاترا پر جا رہے ہیں۔ اب زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں' سوچتی ہوں جیتے جی ویشنو یاترا کے درشن کر لوں۔" ماتا جی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ضرور کیجئے۔" میں نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ قدرت نے بیٹھے بٹھائے ایک مشکل جو آسان کر دی تھی۔

بابو جی نے ناشتہ کرتے کرتے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔

"آدمی کو تھوڑا بہت "آرتھوڈکس" بھی ہونا چاہیے بابو جی!" میں نے ان کے کچھ بولنے سے قبل ہی کہہ دیا۔

جواب میں انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ وشنو سے لے کر برہما تک سب کو مغلظات

سے نوازتے ہوئے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں ان کے متعلق لکھی باتوں کا حوالہ دے کر پوچھا۔

"اب کیا خیال ہے؟"

"جو ماتا جی کہے ——" میں نے دوبارہ ہنستے ہوئے کہا۔

"یعنی مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔" وہ بھی مسکرا دیئے۔

ماتا جی اس اثناء میں خاموش بیٹھی رہیں کیونکہ ایسی باتیں انہوں نے باپو جی سے پہلے بھی ہزاروں مرتبہ سنی تھیں۔ جس کا ان کے نزدیک ایک ہی جواب تھا کہ وہ "سٹھیا گئے ہیں۔"

"ویشنو پُوجا" بھارت کی عام" سب سے بڑی پوجا ہے۔ قریباً" سارے بھارت کے ہندو اس دیوی کو پوجتے ہیں۔ ورنہ میرے مشاہدے میں تو یہی بات آئی تھی کہ جوں جوں پنجاب سے آگے چلتے جائیں دیویاں تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً" کلکتہ میں جتنی پوجا "کالی ماتا" کی ہوتی تھی اتنی پنجاب میں نہیں ہوتی تھی یا پھر اتر پردیش میں جتنی پُوجا "درگا بھائی" کی کیجاتی تھی اتنی مہاراشٹر میں نہیں ہوتی تھی۔ ایک "ویشنو ماتا" ایسی دیوی تھی کہ دنیا بھر کے ہندو اس کی پوجا کرتے تھے ورنہ تو ہر ایک نے مرضی کا بھگوان گھڑا ہوا تھا۔

باپو جی نے مجھے ماتا جی اور پونم کے ساتھ بھیج کر اپنی دانست میں اپنی جان چھڑالی تھی جب کہ پرکاش نے بھگوان کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ شدید سردی سے بچ گیا ہے ورنہ کشمیر کی برفیلی ہوائیں تو ہڈیوں میں گھس جاتی ہیں۔ سالگ رام بیچارے کو حسب معمول چھٹی نہیں ملی تھی۔ پر پنڈ کو باپو جی نے یہ کہہ کر روک لیا تھا "اس پر ماتا کا سایہ نہ پڑے تو بہتر ہے۔ اتنی سردی بیچارا کہاں برداشت کرے گا۔" خود پنڈ بھی پہاڑیوں میں پیدل چلنے سے خوفزدہ تھا۔ اس کی خواہش تو بس یہی تھی کہ باپو جی اسے پرکاش انکل کے پاس لدھیانہ چھوڑ آئیں۔

ooo

ہم چاروں تیزی سے لدھیانہ سے بس کے ذریعے جموں جا رہے تھے جہاں سے آگے ہمیں کٹڑہ جانا تھا۔ جو پہاڑوں کے دامن میں ایک وادی ہے جس تک پہنچنے کے لئے انتہائی دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

قریباً" شام کے وقت ہم پٹھانکوٹ پہنچے۔ راستے میں جگہ جگہ بھارتی افواج کے کنوائے گزرتے نظر آتے —— سارے بھارت پر جنگی جنون طاری تھا۔ خصوصاً" پٹھانکوٹ کے گردونواح میں تو سرحدی علاقے ہونے کی وجہ سے چپے چپے پر حفاظتی اقدامات کئے گئے تھے۔ یہ بس زیادہ تر یاتریوں پر ہی مشتمل تھی جو سارے راستے "ماتا کی جے جے کار" کرتے آئے تھے۔

مجھے بھی بادل نخواستہ ان کا ساتھ دینا پڑا۔

یہاں بھی سرحدی شہروں کی طرح یہی بات سننے میں آئی: "فلاں جگہ سے پاکستانی جاسوس پکڑا گیا۔ فلاں جگہ وہ لوگ کنویں میں زہر ملا رہے تھے۔" بھارتی حکومت پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے اپنے ملک کے علاوہ دنیا بھر میں بھی خوب خوب پراپیگنڈہ کر رہی تھی۔ یہ طریقہ بھارتی عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے اپنایا گیا تھا کیونکہ بھارت کے سنجیدہ حلقے شدت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ جنگ نہ لگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھارتی سرکار خواہ مخواہ مشرقی پاکستان کے پھڈے میں ٹانگ اڑائے۔

لیکن آئے روز اخبارات خاص طور سے انگریزی اخبارات میں پاکستانی جاسوسوں اور "گھس بیٹھیوں" (کمانڈوز) کے متعلق خبریں چھپتے رہنے سے بالآخر بھارتی عوام بھی دھوکے میں آ گئے تھے —— ان کے دلوں میں بھی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ جہاں کہیں کوئی مشتبہ شخص نظر آتا پہلے اس غریب کی اچھی بھلی ٹھکائی ہو جاتی۔ اس کے بعد اُسے پولیس کو سونپ دیا جاتا۔ بعد میں اکثر بے گناہ ثابت ہوتے تھے۔

پٹھانکوٹ چھوٹا سا شہر ہے لیکن ہماچل' پنجاب اور کشمیر کا سنگم ہونے کی وجہ سے یہاں کچھ زیادہ ہی گہما گہمی دیکھنے میں آتی ہے' جس میں زیادہ ہاتھ سانبا' کٹھوعہ' شیزان پور اور اس کے گردونواح میں بسنے والی گوجر قوم کا بھی ہے۔ اس خطے کو قدرت نے اپنے لازوال حسن سے نوازنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ پنجاب اور کشمیر کے حسن کی آمیزش یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ گوجر قوم کے مردوں کو کھیتی باڑی کے مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے اور تو کوئی کام کرنے کو ہوتا نہیں' وہ "قہوہ گری" شروع کر دیتے ہیں۔

صبح پٹھانکوٹ میں ان علاقوں سے تازہ دودھ آتا ہے اور شام کے بعد عورتیں۔ خصوصاً" پٹھانکوٹ چھاؤنی اور شہر میں واقع دوسرے رجمنٹل ہیڈ کوارٹرز میں ان کی آمدورفت لگی رہتی ہے۔ سرحدی علاقوں سے لوٹنے والے سپاہی بغل میں رم کی بوتل دبائے (جو انہیں سستے داموں مل جاتی ہے) قہوہ خانوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہی "دلچسپی" گورداسپور' دینا نگر اور پٹھانکوٹ کے اردگرد بسنے والے رنگین مزاجوں کو کشاں کشاں پٹھانکوٹ کھینچ لاتی ہے۔ کسی نہ کسی تماشبین کا کسی نہ کسی فوجی سے پٹ جانا یہاں روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔

پٹھانکوٹ میں بس نے قریباً" آدھ گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔ ہم نے بھی دوسرے یاتریوں کی طرح لاری اڈے میں واقع ایک ہوٹل کا رخ کیا جہاں "ویشنو ڈھابے" پر ہر چیز تگنے بھاؤ بک رہی تھی۔ ہوٹلوں والے یاتریوں کو خصوصاً" دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔

دال چھلکے زہرمار کر کے ہم لوگ واپس بس میں آ گئے۔ ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار کھڑکیوں پر لگی تھی۔ یہ وہ یاتری تھے جو ملک کے دوسرے حصوں سے یہاں آئے تھے اور اب جنہیں جموں تک جانے کے لئے بھی ٹکٹ ملنا مشکل نظر آتا تھا۔ عموماً" دوسرے دن باری آتی تھی۔ ہم خوش قسمت تھے جو لدھیانے سے براہ راست جموں جا رہے تھے۔ پٹھانکوٹ سے جموں پہنچنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا کیونکہ ان دنوں پٹھانکوٹ کو کشمیر سے ملانے والا واحد رابطہ سڑکیں تھیں۔ پھر ہوائی جہاز۔ ابھی تک پٹھانکوٹ سے آگے ریلوے لائن نہیں بنی تھی۔ (ریلوے لائن بعد میں کٹھوعہ تک اور پھر جموں تک بن چکی ہے۔)

ooo

کٹھوعہ بس پہنچی تو ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ یہاں کشمیر اور پنجاب کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں اور بہت بڑی چیک پوسٹ بنائی گئی ہے۔ بس کے رکتے ہی چار انٹیلی جنس والے اندر گھس آئے۔ وہ ہر مسافر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اپنی افسری جتانے کے لئے قریباً" ہر مسافر کا سامان چیک کر رہے تھے۔ مسافروں کی تو تو میں میں بھی جاری تھی لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔

میں اور پونم' ماتا اور موسی جی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پونم کھڑکی کی طرف بیٹھی تھی۔ اس نے انٹیلی جنس والوں کو دیکھتے ہی اپنا رخ موڑ لیا تھا اور باہر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ یہ بابو جی کی تربیت کا اثر تھا یا پھر پونم کا اپنا کوئی کمپلکس' حالانکہ اس کا سگا بھائی فوج میں ملازم تھا اسے فوج سے کوئی خاص انس نہیں تھا۔

"کیا مصیبت ہے ان کمبختوں کو بھی یہیں آنا تھا؟" اس نے ناگوار لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"تم آخر انہیں اتنا برا کیوں سمجھتی ہو۔ بھئی دیش کے رکھوالے ہیں یہ لوگ ہماری رکھشا کرتے ہیں۔" میں نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

"بھاڑ میں گئے یہ اور ان کی رکھشا۔ آپ کو تو بس موقعہ ملے ان کی تعریف کرنے کا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اپنا "کام" مکمل کر کے چلے گئے۔

کٹھوعہ سے جموں تک شاید ہی سڑک کہیں خالی نظر آتی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ بھارتی مسلح افواج کے کنوائے نظر آ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے کئی مقامات پر انہوں نے مورچے کھودے ہوئے تھے جن میں سے طیارہ شکن توپیں صاف جھانک رہی تھیں۔ اپنے اسلحے اور مورچوں کو انہوں نے اس طرح کیموفلاج کیا ہوا تھا جیسے وہ جنگ لڑ رہے ہوں۔ جہاں کہیں راستے

میں کراسنگ آتا' ہمیں رکنا پڑتا اور جب تک فوجی کنوائے گزر نہ جاتا ہم کھڑے رہتے۔

جموں ہم رات کے وقت پہنچے۔ جموں کالا ری لڈہ کم از کم میری معلومات کی حد تک چندی گڑھ کے بعد پنجاب کا سب سے خوبصورت لاری اڈہ ہے۔ یہاں حکومت نے ایک شاندار اور جدید طرز کی سرائے اڈے کی حدود میں بنا رکھی ہے۔ یہ سرائے یاتریوں کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر بنائی گئی ہے جن کی آمد کا سلسلہ سارا سال جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے۔

سرائے میں کمرہ حاصل کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ خدا خدا کر کے ایک مہاتما جی کی مٹھی گرم کی تو ہمیں ایک فیملی روم مل گیا۔ یہ کمرہ تو خاصا بڑا تھا لیکن اس میں صرف دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ یہاں وہ کمبل کام آیا جو ہم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ میلے کچیلے کمبل جو ہمیں سرکاری طور پر ملے تھے وہ ہم نے نیچے بچھا لئے۔ اب مسئلہ یہ تھا اوپر کون سوئے اور نیچے کون؟ خاصی ردوقد کے بعد یہ طے پایا کہ پلنگوں پر ماتا اور موسی جی سو جائیں۔

ساری رات سرائے میں گونجنے والے بھجنوں کی آوازوں اور سردی نے جگائے رکھا۔ سونے کا ہوش کسے تھا۔ مختلف علاقوں سے آئی ہوئی کھتا کرنے والوں کی ٹولیوں نے اپنے اپنے کمروں کو سٹوڈیو میں تبدیل کر لیا تھا اور ویشنو ماتا کے بالک اس کی عظمتوں کا رونا رو رہے تھے۔ ساری رات میں جاگتا رہا اور ان کے عجیب و غریب دھرم پر لعنت بھیجتا رہا۔

صبح تھوڑی دیر کے لئے اس وقت لونگھ آئی تھی جب پونم نے اپنی گرم شال مجھ پر زبردستی ڈال دی۔ وہ قریباً" آدھی رات کے بعد دونوں بوڑھیوں کے ساتھ "بھجن کھتا" سننے چلی گئی تھی۔ واپس پر اس نے مجھے بیدار پایا کیونکہ صبح بہت سویرے اٹھ کر ہی ٹکٹ ملنے کی کوئی امید تھی وگرنہ تو لوگ کھڑکیوں کے سامنے ہی ڈیرے ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ ٹکٹ کا حصول یہاں پہلے سے بھی زیادہ مشکل دکھائی دیتا تھا۔

پونم نے جب مجھے واپسی پر بھی جاگتے پایا تو اسے شدید شرمندگی محسوس ہوئی۔ آخر اس کے کہنے پر ہی تو میں چلا آیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں شریمان جی!" اس نے ماتا اور موسی جی کا بستر سمیٹتے ہوئے کہا۔

"سوچتا ہوں بابو جی کے دھرم کے متعلق وچار کچھ ٹھیک ہی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائے رام! ماتا کے چرنوں میں بیٹھ کر ایسی باتیں۔" اس نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ رات کو جاگتے رہنے سے اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سی سرخی جھلک رہی تھی۔ مجھ پر

فسوں پھونک دیا تھا اس نے ـــــ "آنکھیں ایسی خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔" میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں سحرزدہ سا اپنی جگہ سے اٹھا۔ نجانے کون سا جذبہ تھا جس نے میرے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیئے:

"جانتی ہو! میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

پونم کی حیرت زدہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔

"تمہارے لئے! تم جو میری پارتی ہو۔" میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا ـــــ وہ لمحہ ہم دونوں کو جذباتی کر گیا۔ ہمیں ہوش اس وقت آیا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ماتا لور موسی جی قریبی مندر سے پوجا پاٹ کے بعد واپس آ گئی تھیں۔ ناشتے کے لئے نیچے کنٹین میں آنے تک بمشکل پونم نے ایک مرتبہ مجھ سے نظریں ملائیں۔ نجانے ہم دونوں اس سے ایک دوسرے سے کیوں شرمندہ تھے! ٹکٹ خریدنے کے لئے میں نے ٹکٹ گھر کی بجائے نزدیکی ٹرانسپورٹ آفس کا رخ کیا۔ جہاں ایک کنڈیکٹر نے مجھ پر خاصی مہربانی کرتے ہوئے مجھے دوگنے داموں چار ٹکٹ دیئے۔ ماتا لور موسی جی تو حیران ہی رہ گئیں۔

"اسی لئے تو میں کہتی تھی کہ پرکاش جائے ہمارے ساتھ۔" انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ایک مرتبہ پھر وہی جنکارلے' یاتریوں کا شوروغل' بچوں کی چیخم دھاڑ۔ پونم ابھی تک اسی جذباتیت کا شکار تھی ـــــ چپ چاپ سی باہر فضاؤں میں نجانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"کچھ تو ہے! آخر ایسی خاموشی بھی کیا۔ ہم بس کے دوسرے مسافروں سے الگ ہیں کیا۔"

"ایک بات ہے پرکاش بابو!"

"ہوں!"

"یہ آپ مجھے اتنا مان نہ دیجئے۔ میں آپ سے کیا کہوں۔ میں کیسے آپ کو بتاؤں میں آپ کی داسی ہوں' دیوی نہیں۔" اس کی بات سے ظاہر تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے کہہ نہیں پاتی۔

"پونم!" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا۔ لفظوں کی جھولیاں خالی ہو چکی تھیں۔

ooo

کٹھوعہ سے دس بارہ میل لوھری بس رک گئی۔ مقامی ملیشیا کے جوان سُرخ جھنڈیاں لئے

ٹریفک روکے ہوئے تھے۔

"پاکستانی کمانڈوز نے پل اڑا دیا ہے۔ اب کشتیوں کا پل بنایا جا رہا ہے۔" یہ تھی وہ اطلاع جس نے سب پر سناٹا طاری کر دیا تھا۔ ساری بس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ لوگ جو سارے راستے "شیراں والی ماتا" "لاہل والی ماتا" کے جنکارے لگاتے آئے تھے اب "ہرے لوم' ہرے لوم" کے علاوہ ان کے منہ سے کچھ نہیں نکل پا رہا تھا۔

پونم کی حالت بھی دوسرے مسافروں سے الگ نہیں تھی۔ ماتا لور موسی جی جو ہم سے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ ان کا تو خوف کے مارے رنگ فق ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کہا "ہماری سینا کے سامنے کس کی مجال ہے جو دم مار سکے' یہ تو بے خبری میں ایسا ہو گیا۔" ابھی میرا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ قریبی سیٹ پر بیٹھے ایک لالہ جی پھٹ پڑے۔

"ابے جنم میں گئی تمہاری سینا۔ کمبخت۔ ملٹی بھر فوج نے سارے بھارت کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ روزانہ اخبارات ان کے کارناموں سے بھرے ہوتے ہیں' کتنے پکڑے جا سکے ہیں اب تک؟" لالہ جی کی بات نے مسافروں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک گروپ تو ان لوگوں کا تھا جو لالہ جی کی حمایت میں اپنی "سینا" کو کوس رہے تھے اور دوسرے وہ جو پاکستانی جاسوسوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ ان کے ہاتھوں سے کسی کو امان نہیں۔ پونم پہلے گروپ کا ساتھ دے رہی تھی وہ چونکہ کم گو واقع ہوئی تھی اس لئے بحث میں تو حصہ نہیں لے رہی تھی' البتہ میرے سامنے اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکال رہی تھی۔

دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد آخر ہمیں روانگی کا سگنل مل ہی گیا ـــــ یہ سارا وقت ہم نے بس کے اندر اور باہر آنے جانے میں گزارا تھا۔

کٹھوعہ سے پہلے ایک چھوٹی سی ندی آتی ہے جس کے گرد فوج نے نُوھم پور کی حفاظت کرنے والا ریڈار سسٹم قائم کر رکھا ہے اور اس کی وجہ سے اس علاقے کی فوجی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ندی پر سے گزرتے ہوئے ہم نے وہ پل بھی دیکھا جو کشتیوں کے عارضی پل سے کچھ فاصلے پر بنا ہوا تھا اور جسے بقول بھارتی سیکھوں کے پاکستانی کمانڈوز نے نجانے کتنے دشوار گزار پہاڑوں کا سفر کرنے کے بعد نہ صرف نشانہ بنایا بلکہ وہ بخیر و عافیت واپس بھی چلے گئے۔

اس ندی سے کٹھوعہ صرف دس بارہ کلومیٹر رہ جاتا تھا اور وہ پہاڑی سلسلہ جس سے پیدل گزر کر ہمیں ماتا ویشنو کے مندر تک پہنچنا تھا اس میں ریڈار نصب کئے گئے تھے۔ یہاں سے ریڈار کی لوکیشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم ہرگز نہیں تھا۔ جاسوس کو یہاں داخل ہونے کے لئے بمشکل ہی کوئی خلاء (Gap) میسر آتا تھا۔ مجھے دورانِ تربیت جو بات ہمیشہ بتائی جاتی تھی۔ وہ یہ

تھی کہ "بہترین جاسوس سچویشن سے صرف فائدہ ہی نہیں اٹھاتا بلکہ فائدہ اٹھانے کے لئے بہتر سچویشن بھی پیدا کر لیتا ہے۔"

میں نے یہ اطلاعات حاصل کر لی تھیں کہ ماتا ویشنو کا مندر بھی یہیں کہیں واقع ہے اور مجھے شدت سے اس موقعے کا انتظار تھا جب میں ایک براہمن یاتری کے روپ میں اپنی خود ساختہ فیملی کے ساتھ یہاں آؤں اور بھارتی سیکورٹی کا زعم توڑ کر کٹڑہ ریڈار سسٹم اور موبائیل میزائل سسٹم کا پردہ چاک کر سکوں۔ آج جب قدرت نے مجھے یہ موقع نصیب کیا تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اُدھم پور کے ہوائی اڈے کی دفاعی اہمیت کیا ہے اور اس کی حفاظت میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر لگے ان ریڈار انٹینا کا کتنا ہاتھ ہے۔ جب میرے ہمراہی اپنے دلوں میں "ماتا ویشنو" کی یاترا کی خواہش کے لئے کشاں کشاں کٹڑہ کی سراؤں کی طرف گامزن تھے تو میں بھی "آپریشن رومر" کو پاتال سے نکال کر کاغذ پر منتقل کرنے کا عزم لئے ان کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا —— میں کہ محمود غزنوی کا پیروکار ماتا ویشنو کے مندر کا بھرم توڑنے جا رہا تھا۔

ooo

جموں سے کٹڑہ تک کشمیر کا ننگا حسن میرا منہ چڑاتا آیا تھا۔ یہ خطہ جنت نظیر یقیناً قدرت کی فیاضی کا بہترین شاہکار ہے۔ ہرے بھرے سرسبز پہاڑ اور ان کے دامن میں بنے باغات کی قطاریں، جھرنے اور ان میں پانی کی مٹکیاں بھرتی گوپیاں، چرواہوں کے پہاڑوں کے دامن سے ٹکراتے خوبصورت ماہئے اور پہاڑی سلسلوں سے اٹھکیلیاں کرتے، جھومتے گاتے دریا، دریاؤں میں دھوپ کی روشنی سے چمکتے سنگریزے اور کہیں کہیں ان کے کنارے پانی پیتی بھیڑیں۔ یہاں کے ذرے ستارے ہیں اور چہرے چاند، یہ الگ بات کہ مفلوک الحالی نے انہیں گہنا دیا ہے۔

میں یہاں پہنچتے ہی ماضی میں کھو گیا۔

یادیں تاریخ کی کڑیاں ملاتی چلی جا رہی تھیں۔ انہی پہاڑوں کے دامن میں میرے ۶۵ء کے گمنام شہیدوں کا لہو بکھرا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں وہم گزرتا جیسے ان کی ہریالی کا سبب انہی پاکبازوں کا خون تو نہیں۔ انہی پہاڑیوں کے چپے چپے پر کشمیری حریت پسندوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ میری نظروں میں ۶۵ء کے مجاہدوں کے وہ چہرے گھومنے لگے جو سترہ دنوں اور سترہ راتوں کی خونریز اور تیز ترین معرکہ آرائی، شب بیداری، بارود، دھول اور ان کے زخموں سے بہتے مقدس خون سے لالہ رنگ ہو رہے تھے۔ ان کی وردیاں اپنے شہید ساتھیوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم چھلنی چھلنی ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا عزم و حوصلہ بھی ان کے

قدموں کی طرح کبھی نہ ڈگمگایا۔ یہ بدر و حنین کے سپاہی تھے جو چودہ سو سال سے مصروف جہاد تھے کیونکہ انہوں نے یہ سبق پڑھ لیا تھا کہ:

"یاد رکھو! آج کے دن جس نے پیٹھ دکھائی، بغیر اس کے کہ وہ لڑائی کی کسی ضرورت کے لئے پینترا بدلے، تو وہ جان لے کہ خدا کا غضب اس پر نازل ہو گا۔ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

(الانفال: ۱۶)

قرآن کا یہ فرمان ان جانبازوں کے خون میں شامل تھا۔ انہوں نے انہی پہاڑوں کی چوٹیوں سے آسمان پر کمندیں پھینکیں —— وہ خود شہید ہو گئے لیکن آنے والوں کے لئے راہ عمل متعین کر گئے۔

ooo

کٹڑہ کوئی ایسا شہر نہیں جہاں قیام کا کوئی بہانہ بن سکے۔ صرف وہی لوگ یہاں کے مستقل مکین ہیں جن کے اپنے باغات ہیں۔ ایک بستی مختلف مندروں میں مفت کے اناج پر پلنے والے ان پجاریوں کی فوج نے آباد کر رکھی ہے جو کسی بنچ جاتی کا وہاں سے گزر ہونے پر بھی دھرم بھرشٹ ہونے کا رونا رونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "بھانڈو" نامی گانے بجانے والی قوم کے گاؤں ان سے الگ تھلگ ہیں۔ ان بے چاروں کا تو مندر بھی علیحدہ ہے۔ گو کہ اب وہ راستوں میں ہارمونیم اور ڈھولک لئے مانگتے پھرتے ہیں لیکن لاکھ سیکولر ہونے کے باوجود بھارتی حکومت ابھی تک اس بات کی ہمت نہیں کر سکی کہ انہیں ماتا کے درشن کرنے کی اجازت دے۔ کاغذات اور قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں یقیناً ایسی کسی پابندی کا تذکرہ نہیں ملتا لیکن گاندھی کے چیلے وہ کبھی نہیں کرتے جو کہتے ہیں اور وہ کبھی نہیں کہتے جو کرتے ہیں۔

شام کو مجھے بھی بادل نخواستہ سب کے ساتھ مندر میں جانا پڑا۔ جہاں رات گئے تک سر کھپائی کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ رات کو ایک سرائے میں قیام کا بندوبست کیا۔ ابھی تک مجھے سوائے اس کے اور کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ایک فوجی جیپ کو مندر کے نزدیک رکتے دیکھا تھا جس میں سے ایک فوجی میجر اور کچھ سپاہی مندر میں "ماتھا ٹیکنے" آئے تھے۔ جتنی دیر تک وہ لوگ مندر میں رہے میں کسی نہ کسی بہانے ان کی جیپ کا طواف کرتا رہا۔ ان کے "بٹالین مارک" پر سے مٹی اتارنے کے لئے مجھے ایک مرتبہ ان کی جیپ سے رگڑ کھا کر گزرنا بھی پڑا تھا۔ "بٹالین مارک" دیکھ کر میں کم از کم اپنے ذہن میں ایک اندازہ قائم

کرنے کے قابل ہو گیا۔

ooo

کٹڑہ سے ماتا ویشنو کے مندر تک دس گھنٹے کا پیدل راستہ تھا۔ مگر بھی ایک خاص مقام تک ہی جاتے تھے۔ راستے میں ہر دوسرے تیسرے میل کے بعد کوئی نہ کوئی مندر نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ تین چار مقامات پر سرائیں بھی بنی ہوئی تھیں تاکہ ضعیف لوگ سستا کر یا آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہوں۔ اس کے علاوہ پانچ چھ مقامات ایسے بھی آتے تھے جہاں رک کر مختلف رسومات ادا کرنی پڑتی تھیں۔ اس سارے راستے میں دونوں طرف کھائیوں اور جنگلات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کہیں کہیں حکومت نے بلتات بھی لگائے تھے جن میں لگے سرخ سیب یا تو جنگلات میں پلنے والے بندروں کی فوج چٹ کر جاتی تھی یا پھر راستے کے کنارے لگے درختوں سے یاتری اتار کر کھا جاتے۔

علی الصبح ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ سرائے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر پہلے ایک تالاب آتا تھا۔ ہر یاتری کے لئے لازم ہے کہ وہ یہاں اشنان کرے۔ تالاب ایک ندی کی شکل میں تھا جس کے ایک کونے میں بڑی بڑی چادروں کا پردہ جو نہ ہونے کے برابر تھا' تان دیا گیا تھا جس کی ایک سمت خواتین اشنان کرتی تھیں اور ایک سمت مرد۔ ہندوانہ رسومات کی بے حیائی کی بہترین تصویر دیکھنے کو ملتی تھی۔ میرے ذہن میں رامائن اور گیتا کے وہ اشلوک گھومنے لگے جن میں کرشن کے تالاب میں نہاتی گوپیوں کے کپڑے اٹھا کر بھاگ جانے کا بیان ہے۔ اس زمانے میں شاید کیمرہ نہیں تھا لیکن اب تھا اور آج کے بھارتی کرشن بڑی بے باکی سے کسی نہ کسی بہانے تالاب کی دوسری سمت چلے جاتے اور اشنان کرتی اپنی ماؤں بہنوں کے بے ہودہ مناظر کیمرے کی فلم پر منتقل کر لیتے۔ چند بوڑھوں کے علاوہ اور کسی کو میں نے اس قبیح حرکت پر ناک بھوں چڑھاتے بھی نہیں دیکھا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجھے بھی اشنان کرنے پڑے کہ یہ تیرتھ اشنان ہی ماتا کو شروعاتی بھینٹ کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔ یہ الگ بات کہ سارے راستے نزلے اور زکام نے جان نہ چھوڑی۔ پونم واپس پلٹی تو اس کی سیاہ گھنیری زلفوں سے پانی موتیوں کے قطرے بن کر ٹپک رہا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر وہ اپنے بال سکھانے لگی' جہاں میں پہلے ہی سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔

"دیوی درشن کی ابتدا ہی ٹھٹھرا دینے والی ہے۔ انتا نجانے کیا ہو گی۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"انتا کی فکر آپ نہ کیجئے۔" پونم کے فقرے میں چھپے اشارے نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

تالاب کنارے کھڑی "بھوکی ماتاؤں" کو آٹے کی ٹکیاں کھلا کر وہاں سے چھٹکارہ حاصل کیا اور آگے چل دیئے کیونکہ پہاڑی راستے تھے۔ اس لئے دو گھنٹے کے سفر نے ہی سب کو تھکا دیا۔ دونوں بوڑھیوں کی حالت تو خاصی قابل رحم تھی۔ راستے میں دوسرے یاتریوں کی طرح ہم بھی مختلف مناظر کی تصویر کشی کر رہے تھے۔ دوربین کے ساتھ میں ماتا اور موی جی کو خصوصاً" دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ وہ سب تو پہاڑوں کے دامن میں بہتے چھوٹے سے شہر میں غرق تھے جب کہ مجھے بڑی بے چینی سے اپنے مطلب کی شے کی تلاش تھی جو نظر آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

پہاڑی راستے پر جابجا چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور چائے کے کھوکھے بھی بنے نظر آ رہے تھے جہاں یاتری دم لے کر سستا کر آگے روانہ ہو جاتے تھے۔ سارا راستہ چوروں کے ایک جنگل سے پٹا پڑا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں' نگر نگر کے لوگ' بوڑھے' جوان' بچے' نوجوان' خوبصورت کنیائیں سبھی ایک دوسرے کے سنگ سنگ ایک سرشاری کی کیفیت میں ماتا ویشنو کے جنکارے لگاتے' ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتے' آنکھیں لڑاتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں بھانڑوں کی نوجوان لڑکیاں تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ہر آنے جانے والے کو دعوت گناہ بھی دیتی جا رہی تھیں۔ چلتے کارواں سے کوئی نوجوان رکتا' کسی لڑکی سے دو چار فحش جملوں کا تبادلہ کرتا اور وہ دونوں پہاڑی سلسلے میں کھو جاتے۔ اتنے پوتر استھان پر بھی کمبخت باز نہیں آتے تھے۔

یہ تھا ان کا دھرم---- جس سے وہ انسانیت کی اصلاح کرنے چلے تھے۔

دو گھنٹے کے مزید جان لیوا سفر کے بعد بالآخر ہم لوگ "ادھ کواری مندر" پہنچے۔ یہاں بھیڑیئے کے بھٹ سے مشابہ ایک سوراخ سا بنا ہے جس میں سے گزر کر اندر مورتی تک پہنچا جاتا ہے۔ یہاں ایک عجیب و غریب تماشہ لگا تھا۔ کئی لوگ اس سوراخ کے نزدیک جاتے اور واپس پلٹ آتے۔ کہا جاتا تھا کہ جس کے من میں ذرا سی بے ایمانی ہو وہ اس سوراخ سے کبھی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ روایت خاصی قدیم ہے۔ پونم سے پہلے میرا نمبر آتا تھا۔ میں خدا کو یاد کر کے کفر کدے میں گھس گیا اور اطمینان سے اندر دیوی درشن کر کے واپس آ گیا۔ باہر نکلنے کا راستہ خاصا کشادہ تھا لیکن اندر رش ہونے کی وجہ سے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔

"میرا وشواش تجربوں کا محتاج نہیں رہا پرکاش بابو۔" پونم نے تڑپ کر کہا۔ اس کے لہجے کی سنجیدگی مجھے بسا اوقات رلا دیتی تھی۔ میں یہ سوچ کر سہم جاتا تھا کہ اس خوبصورت المیے کا انجام آخر کیا ہو گا؟

موسی اور ماتا جی کا تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ ہم نے آگے جانے کا خیال چھوڑ دیا اور رات یہیں بسر کرنے کی ٹھانی۔ سورج کی سرخ ٹکڑی آہستہ آہستہ کوہساروں کی گود میں ڈوب رہی تھی۔ پونم میرے ساتھ ایک کونے میں کھڑی دوسرے لوگوں کی طرح سامنے پھیلے قدرت کے بے پایاں حسن سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ہمارے دائیں ہاتھ درختوں پر چڑھے بندر حیرت سے تماشہ کر رہے تھے۔ اچانک پونم نے دوربین مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ سامنے کیا چیز حرکت کر رہی ہے؟"

میں نے دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ اس کی انگلی کی سمت نظریں دوڑائیں تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ سامنے ریڈار کا ایک انٹینا حرکت کرتا نظر آ رہا تھا کیونکہ پونم کے لئے یہ چیز نئی تھی اس لئے اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"کمال ہے یہ کیا ہے۔ آؤ اس طرف جا کر دیکھیں۔" میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بظاہر انجان بن کر پونم سے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر اس کا ہاتھ تھامے اس سمت چل دیا جہاں سے پہاڑی کا دامن نظر آ سکتا تھا۔ پونم بھی متجسس سی میرے ساتھ کھنچی چلی آئی۔

وہ مقام جہاں سے ہمیں پہاڑی کا دامن نظر آنے کی امید تھی' بظاہر تو بہت قریب لگتا تھا لیکن وہاں پہنچنے میں ہمیں کم از کم آدھ گھنٹہ تو لگا ہو گا۔ اس اثناء میں پونم نے دو تین مرتبہ مجھے اس قصے کو چھوڑ دینے کو بھی کہا۔ لیکن میں اسے ہر دفعہ یہی کہہ دیتا تھا "تم نے ہی مجھے وہ پراسرار شے دکھائی ہے۔ اب جب تک میں اسے قریب سے نہ دیکھ لوں واپس نہیں ہو سکتا۔"

اب ہم اس اونچے پہاڑی ٹیلے کے پاس کھڑے تھے جہاں سے ہمیں یہ نظارہ کرنا تھا——— میں نے بے صبری سے آنکھوں سے دوربین لگائی اور میرا دل بلیوں اچھلنے لگا——— سامنے بھارتی فوج کا انتہائی محفوظ طریقے سے کیموفلاج کیا ہوا آپریشن روم موجود تھا۔ دل ہی دل میں میں ان کے حفاظتی نظام کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا' کیونکہ ماتا ویشنو کے مندر کو جانے والے مخصوص راستے سے صرف انٹینا ہی بمشکل نظر آ سکتا تھا وہ بھی اس طرح کہ جیسے پونم نے اچانک ایک مخصوص زاویے سے نظارہ کیا تھا۔ آپریشن روم کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس عظیم کارنامے پر داد دی اور نظارہ کرنے میں غرق ہو گیا۔

"کہاں کھو گئے شریمان جی!" پونم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں چونک پڑا۔

"تم تو نہ ہی دیکھو تو بہتر ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوربین اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔

"یہ کچھ دکھانے کے لئے مجھے یہاں لائے تھے۔" اس نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"پونم! میں تمہاری سنگت کے ایک ایک لمحے کو حسین بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں یہ سفر میرے جیون کا امر لمحہ بن جائے۔ کبھی نہ بھلائے جانے والا لمحہ۔" میں نے اس کے کندھے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا——— پونم سے باتیں کرنے کے بہانے میں نے آپریشن روم کی تمام جزئیات کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا۔ اب میں انہیں پہلی فرصت میں کاغذ پر منتقل کرنا چاہتا تھا۔ واپسی پر تھائی میسر آگئی اور دشمن کا زعم کاغذ کے پرزے کی شکل میں میری پتلون کی جیب میں منتقل ہو گیا۔

ooo

رات کو "آدھ کواری" پر قیام کرنے کے بعد علی الصبح ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

ایک مرتبہ پھر وہی جوش و خروش' ماتا ویشنو کے جیکارے' خوش فعلیاں۔ شام گئے تک ہم اس مخصوص مندر تک پہنچ گئے۔ ماتا ویشنو کے مندر سے پہلے "بھیرو کا مندر" آتا ہے جسے دیکھے بغیر آگے گزر جانا ہے کیونکہ ہندو مائتھالوجی کے مطابق اگر پہلے بھیرو کا مندر دیکھ لیا تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے البتہ ضرور گزرتے ہوئے بھی اسے دیکھا۔ پوجا کے انتہائی نازک مرحلے کا آغاز ہونے والا تھا———!!

رات گئے پھر اشنان کا حکم ملا۔ پہاڑیوں سے آنے والا پانی جو ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کیلاش پربت پر بیٹھے برہما کے ہاتھوں کی انگلیوں سے بہہ رہا ہے۔ یہاں مختلف جگہ تالابوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ خیریت یہ گزری کہ یہاں خاصا رش تھا۔ میں نے باقی لوگوں کو خواتین کی قطار میں کھڑا کر دیا اور خود دوسری طرف چلا گیا کہ جہاں رش کم ہو گا وہاں اشنان کر لوں گا اور اس طرح مجھے اس بے ہودہ رسم سے نجات مل گئی ورنہ میرے منجمد ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اشنان کے بعد اب ماتا کے درشن کی باری تھی۔ اس کے لئے بھی مشترکہ خواتین اور مردوں کی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ قریباً ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد پونم کے بعد میری باری آئی۔ یہ مندر بھی بڑے پراسرار طریقے سے بنایا گیا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کے لئے برفیلے پانی میں سے گزرنا پڑتا تھا جس کے بعد ایک چبوترے پر ایک مورتی جس کے سر پر سونے کا چھتر لگا ہے (یہ چھتر سمراٹ اکبر نے رکھوایا ہے) رکھی ہے۔ جس کے دونوں اطراف دو ہٹے کٹے کریہہ الصورت پجاری بیٹھے ہیں۔ ہر آنے والا یاتری ناریل اور حسب توفیق پیسے

مورتی کے چرنوں میں رکھ کر اسے "سیس نوائے" گے۔ جواب میں اس کو ناریل ایک آدھ پیسہ (جس پر پجاری اپنے دانت کا نشان لگا دے گا) ماتھے پر چندرا تلک لگا کر پجاری آگے دھکیل دے گا' جہاں سے اسے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ مراحل بھی طے ہوئے۔ قریباً" آدھی رات کے بعد ہم عبادات سے فارغ ہوئے اور سرائے میں چلے آئے۔

نیند تو برائے نام ہی تھی کیونکہ صبح تک ۔ بھجنوں کے شور نے آنکھ نہ لگنے دی۔ صبح ہم نے "ماتا کی کنجیکیں" وہاں مانگنے والوں میں تقسیم کیں اور تمام رسومات سے فارغ ہو کر واپسی کے لئے رخت سفر باندھا۔ واپسی پر "بھیرو کا مندر" اور "ہاتھی متھا" سے گزرتے خدا خدا کر کے کٹڑہ پہنچے۔ سفر کے ہر لمحے کو پونم کی قربت نے حسین بنا دیا تھا۔ کشمیر کے حسن پر نظر جاتی تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ الٰہی کب اس خطہ جنت نظیر کے مکین آزاد فضاؤں میں سانس لے سکیں گے؟

کٹڑہ سے روانگی سے پہلے ماتا جی نے مجھ سے علیحدگی میں بات کرنے کے لئے کہا۔ میں حیران تھا کہ انہیں ایسی کیا پرائیویٹ بات کی ضرورت پیش آ گئی۔ ہم دونوں مندر سے نکل کر اپنے آشرم کے کمرے میں آ گئے جب کہ موسی جی اور پونم پروگرام کے مطابق وہیں رہ گئیں۔

"بیٹا کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ پونم تم میں خاصی دلچسپی لیتی ہے' وہ میری بیٹی تو نہیں لیکن تم نے بھی محسوس کیا ہو گا کہ مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ مجھے علم نہیں کہ تمہارے اس کے متعلق کیا جذبات ہیں۔ بابو جی لاابالی آدمی ہیں۔ وہ تم سے شاید کبھی بات نہ کر پائیں۔ بیٹا میں نے دونوں پر کاشوں کو ہمیشہ ایک ہی سمجھا ہے۔ تم ہمارے لئے اوتار بن کر آئے ہو۔ اگر تم پونم سے وداہ کرنا قبول کر لو تو میرا اگلا جیون سپھل ہو جائے گا۔" انہوں نے بغیر تمہید باندھے بڑی شفقت سے سیدھی سادھی بات کر دی۔ جیسے جیسے وہ بولتی جا رہی تھیں' مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر آری چل رہی ہو۔ ماتا جی نے مجھے بڑے اذیت ناک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ مجھے ٹریننگ کے سارے سبق بھول گئے۔ انہیں اسی لمحے میں دو ٹوک جواب ملنا چاہیئے تھا۔ چند لمحوں تک میں سوچتا رہا' بالآخر مجھے ایک فیصلے تک پہنچنا ہی پڑا۔

"ماتا جی پونم سے وداہ میرا سوبھاگیہ ہے' لیکن میری خواہش ہے' وہ اپنی پڑھائی جاری رکھے۔ کم از کم ایم۔اے کر لے۔ اس اثنا میں ممکن ہے میرے پتا جی کا دل بھگوان میری طرف پھیر دے۔" میں نے گول مول سی بات کی۔

"اس کا مطلب ہے میں تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں۔" انہوں نے بڑے پرامید لہجے میں کہا۔

"آپ میرے سب کچھ ہیں' آپ کے حکم کی سرتابی میں کیسے کر سکتا ہوں۔" میں اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔

ماتا جی نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ میں اندر ہی اندر کٹ کر رہ گیا۔ قدرت نے اپنے بھیانک المیے کا آغاز کر دیا تھا اور مجھے اس سے بہرحال گزرنا تھا۔

موسی جی اور پونم کو انہوں نے یہ خوشخبری فوراً" ہی سنا دی تھی' کتنی خوش ہوئی تھی بے چاروں کو یہ جان کر کہ میں نے ہاں کر دی ہے۔

"میں نہ کہتی تھی کہ یہاں سے مانگنے والی ہر منت پوری ہوتی ہے۔" پونم نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے مجھے گھر پہنچتے ہی کہا۔

آشرم کے اسرار

گھر واپس آئے تو بابو جی نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"بھگوان کا شکر ہے کہ تم لوگ مکمل واپس آ گئے ہو۔" انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

دو روز تک میں نے رائے کوٹ میں ہی قیام کیا۔ اس اثناء میں صرف ایک مرتبہ اپنا پیغام آگے پہنچانے کے لئے ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ اگلے روز منگل تھا اور وہ دن جب تکمل باڑیوں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے چنا تھا۔ میں نے گھر بتا دیا تھا کہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے جالندھر جا رہا ہوں۔

"یار منگل ذرا منحوس دن ہوتا ہے' ایک آدھ روز بعد چلے جانا۔" بابو جی نے مجھے روکنا چاہا۔

"آپ کو کیونسٹ ہو کر ایسی بات نہیں کرنی چاہیے بابو جی۔" میں نے مسکرا کر ان کو ٹال دیا۔

جالندھر جانے سے پہلے میں پرکاش سے ملا۔ بزنس کے معاملات پر بحث اور سورن سنگھ سے ملنے کا کہہ کر جالندھر چلا گیا۔ سورن سنگھ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میری اچانک آمد سے وہ بہت خوش ہوا۔ رات میں نے اس کے ہاں قیام کیا اور صبح مارکیٹنگ کا بہانہ کر کے پولیس کپتان کے دفتر کی طرف چل دیا۔ میں دفتر کے سامنے بنی کنٹین میں بڑی بے چینی سے آنے والے واقعات کا منتظر تھا۔ ابھی تک وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں اچانک چونک پڑا۔ مجھے امریک سنگھ کنٹین کے ایک کونے میں جہاں خاصا رش تھا کھڑا نظر آیا۔ اسی اثناء میں پولیس کپتان کی جیپ بھی آتی دکھائی دی۔ امریک سنگھ آہستہ آہستہ کنٹین کی دوسری طرف کھسک رہا تھا جہاں سے جیپ کو گزرنا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک مجھے اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئیں۔

ایک پولیس تھانیدار امریک سنگھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اس نے امریک کو پہچان لیا تھا کیونکہ اکثر پنجاب کے پولیس افسران اسے جانتے تھے۔ تھانیدار کو اس کی وہاں موجودگی نے

مشکوک کر دیا تھا۔ گو کہ ان دنوں امریک سنگھ کو آزادی میسر تھی پھر بھی تھانیدار نے اپنا شک رفع کرنا ضروری جانا۔ امریک کو بھی شاید اس کی آمد کی خبر ہو گئی تھی' کیونکہ وہ مختلف لوگوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ دوسری طرف کھسک رہا تھا۔ تھانیدار نے کارکردگی دکھانے کے شوق میں اسے للکارا اور ٹھہرنے کے لئے کہا۔ امریک سنگھ مڑا اور دوسرے ہی لمحے دو گولیاں تھانیدار کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔۔۔۔ اس کی فائرنگ اور نشانہ قابل داد تھا۔

کنٹین میں افراتفری پھیل گئی۔ پولیس کے علاوہ عام لوگوں کو بھی ابھی تک معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ میں بھی بھاگنے والوں کے ہجوم میں شامل تھا۔۔۔۔ یہ الگ بات کہ ابھی تک میری نظریں امریک کو تلاش کر رہی تھیں جو نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

پولیس کپتان ابھی جیپ کے نزدیک ہی پہنچا تھا اور معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کنٹین کے ایک کونے میں ایک میز کی آڑ میں چھپا امریک سنگھ باہر نکلا۔ اس نے کپتان کو زوردار گالی دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور اس سے پہلے کہ دوسرے پولیس اہلکار اس کی مدد کو لپکیں' باقی چار گولیاں اس نے چند لمحوں میں اس پر خالی کر دیں۔ پولیس کپتان الٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ اس کی وردی خون سے رنگین ہونے لگی تھی۔ امریک سنگھ نے ہجوم کے مخالف سمت چھلانگ لگائی' لیکن اب پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ ابھی بمشکل اس نے کچہری کا دروازہ ہی عبور کیا تھا جب بھاگتے ہوئے اس پر فائرنگ کرنے والے ایک حوالدار کی گولی اس کی پسلی میں لگی' امریک سنگھ تڑپ کر دوسری طرف جا گرا۔۔۔۔ لیکن چند ہی سیکنڈ بعد اٹھا' اس کا ہاتھ اپنے کپڑوں میں چھپی کوئی چیز ٹٹولنے لگا۔

تعاقب کرنے والوں نے یہی سمجھا کہ وہ کوئی خطرناک چیز نکال رہا ہے۔ اب پولیس اسے مہلت دینے کے لئے تیار نہ تھی۔۔۔۔ ایک ہی وقت میں دو اطراف کی فائرنگ نے اسے بھون کر رکھ دیا۔ میں دل ہی دل میں اس کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ حقیقتاً اس کے کپڑوں میں ایک خالی پستول تھا جس سے وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ ایک مرتبہ زندہ قابو آ گیا تو پولیس اپنے روایتی تھرڈ ڈگری تشدد کے ذریعے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دے گی۔ شاید اسی لئے اس نے پولیس کو دھوکہ میں ڈال کر مرنا قبول کر لیا کہ اپنا راز بھی اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

چند منٹ کے اندر ہی پولیس نے کچہری کے چاروں سمت گھیرا ڈال لیا تھا۔ ایس۔پی کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا' جہاں وہ آپریشن تھیٹر میں پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا جب کہ

تھانیدار سوہن لال موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔

ایسے خطرناک مواقع پر موجودگی "اصولاً" غلط تھی۔ تربیت کے مطابق مجھے بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ خیز جگہوں سے اجتناب برتنا چاہیئے تھا لیکن اسے میرا بے پناہ تجسس کہہ لیجئے کہ میں نے وہاں سے اس وقت تک ہٹنا پسند نہ کیا' جب تک پولیس اس کی لاش کو اٹھا کر نہیں لے گئی۔

جب میں واپس سورن سنگھ کے پاس جا رہا تھا تو میرے ذہن میں بابو جی کے بارے میں کئی طرح کے خطرات سر اٹھا رہے تھے لیکن ایک انہونی طاقت مجھے احساس دلا رہی تھی کہ اس "محتاط کمیونسٹ" نے آنے والے واقعات کی فوراً پیش بندی کر لی ہو گی اور پولیس کبھی اس تک نہ پہنچ سکے گی۔

ooo

دوپہر تک میں کچہری کے اردگرد گھومتا رہا۔ اس کے بعد سورن سنگھ کے پاس آ گیا۔ سورن سنگھ کا خیال تھا کہ شاید میں اس کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھانے آیا ہوں لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں صرف تفریح کرنے آیا ہوں' تب بھی اس نے میری خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ میں نے پہلے ہی "بزنس ٹرپ" میں اسے قابو کر لیا تھا۔ سورن سنگھ نے مجھے بتایا کہ کرنل بانوہ اس پر خاص طور سے مہربان ہے۔ اس نے بھنڈہ کے بہت سے آفیسرز میس کی باقاعدہ سپلائی اسے دلا دی ہے اور آرمی ہیڈ کوارٹر میں بھی اس کی باقاعدہ رجسٹریشن کروا دی ہے۔

اس کے ذریعے مجھے اس بات کا بھی علم ہوا کہ کرنل بانوہ نے ایک دو مرتبہ مجھ سے ملنے کی بھی خواہش ظاہر کی ہے۔ بھارتی فوج کے ایک کرنل کی مجھ سے دلچسپی میری خوش بختی کی علامت تھی۔ میں نے خود سورن سنگھ کے سامنے اس کی مہمان نوازی اور "پنجابی پوری" کی تعریف کئی مرتبہ کی لیکن ساتھ ہی اپنی حد سے بڑھی مصروفیات کا رونا بھی رویا (کیونکہ ابھی تک مجھے دوبارہ کرنل بانوہ والے ایریا میں کوئی مشن نہیں سونپا گیا تھا) سورن سنگھ نے مجھے ایک مرتبہ پھر اچھی خاصی تنخواہ اور بہت سارے الاؤنسز کی پیشکش کی' لیکن میں نے اسے بتایا کہ نوکر مالک کے رشتے میں دوستی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی' صرف اطاعت ہی اطاعت رہ جاتی ہے اور میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس کی فرم کے لئے بطور کمیشن ایجنٹ کام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں' جیسے ہی کوئی آرڈر ملا' اپنی کمیشن کھری کر لوں گا۔

میری اس بات نے سورن سنگھ کو خدا جانے متاثر کیا یا نہیں' البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ مجھے کھونے پر ہرگز تیار نہیں تھا اور ایک کاروباری شخص کی طرح اپنے بزنس کے لئے فائدہ مند

آسامی کو کسی نہ کسی صورت اپنے قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دو روز تک میں اس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتا رہا' پھر میں واپس لدھیانہ آگیا۔

لدھیانہ میں پرکاش کی زبانی علم ہوا کہ بابو جی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ میرے ذہن میں بہت سے خدشات نے سر اٹھایا "اگر انہیں پولیس کپتان کے قتل کے جرم میں پکڑا گیا ہے تو معاملہ واقعی خطرناک ہے ورنہ صورت حال اتنی خراب نہیں۔" پرکاش کے ساتھ میں فوراً رائے کوٹ پہنچا۔ سارے گھر والے پریشان تھے۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا۔ بابو جی ابھی تک رائے کوٹ پولیس سٹیشن میں ہی تھے۔ یہ سن کر میری جان میں جان آئی کہ انہیں محض اندیشہ نقص امن کے تحت پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی سارے بھارت میں ملک گیر پیمانے پر ہڑتالوں کا پروگرام بنا رہی تھی اور کانگریس "جمہوریت نواز" حکومت نے آنے والے حالات سے نمٹنے کے لئے تمام صوبوں کو کمیونسٹ اے اور بی کلاس لیڈر شپ کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے تھے۔

میرے ذہن میں جس بات کا کھٹکا تھا' وہ صورت حال نہیں تھی---- بابو جی کی "سیاسی بصیرت" کو میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ جس روز پولیس کپتان کو قتل ہونا تھا' عین اس روز علی الصبح وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ بات ان کے لئے کچھ مشکل بھی نہیں تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے ان کی سرگرمیوں پر پہلے ہی سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس روز رات کو ایک جلسے میں دھواں دھار تقریر کر دی اور صبح دھر لئے گئے۔ اس طرح انہوں نے خوبصورت چال چل کر جالندھر والے قتل میں اپنے ملوث ہونے کے امکانات ہی ختم کر دیئے تھے۔

پولیس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہاں کوئی تکنی باڑی بھی رہتا ہے----!

شام تک بھاگ دوڑ کر کے ہم نے بابو جی کی اچھے چال چلن کی ضمانت دینے کے بعد ضمانت کروالی تھی۔ رائے کوٹ کے سرکردہ افراد کا تعاون ہم نے اپنے وکیل کے ذریعے حاصل کر لیا تھا۔ رات تک ان کی رہائی عمل میں آئی تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ بابو جی حوالات سے نکلتے ہی مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔

"بابو جی! چھوڑیئے اب سیاست کو اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ لدھیانہ چلئے۔ کاروبار سنبھالئے۔" میں نے گھر واپس آتے ہوئے راستے میں ان سے کہا۔

"بیٹا پچھلے پانچ چھ سال سے میں خاموش تھا اس لئے کہ تمہاری ماتا جی بڑے چھوٹے دل کی

مالک ہیں اور پرکاش بھی اکیلا تھا پھر مجھ پر اپنا ہی نہیں تمہاری موسی جی کا بوجھ بھی تھا---- اب سالگ رام اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میرے دو پرکاش ہو گئے ہیں' اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ میں اپنے کاز سے کیسے پیچھے ہٹ جاؤں' مجھے تمہاری صلاحیتوں کا علم ہے بیٹا---- میرا وشواش ہے کہ تم کبھی گھر والوں کو میری کمی کا احساس نہیں ہونے دو گے----" بابو جی کے جواب میں چھپے اعتماد پر میں کٹ کر رہ گیا۔

اس گھر کے ہر فرد نے مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ نجانے قدرت نے ان لوگوں کو اپنے بھیانک مذاق کا نشانہ بنانے کے لئے کیوں چن لیا تھا۔ مجھے خود اپنے کل کا علم نہیں تھا۔ میری حیثیت بظاہر ہوا میں اڑنے والے اس پتے کی سی تھی جسے آندھی نے ان کے آنگن میں لا پھینکا تھا۔ اگلا جھونکا مجھے کہاں لے جائے اس کا مجھے بالکل پتہ نہ تھا---- کبھی کبھی تو ان لوگوں کی حالت پر مجھے رحم آنے لگتا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں' کہیں اور پناہ لے لوں۔ کوئی اور Safe House بنا لوں۔ ممکن ہے اس مرحلے پر میری جدائی ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔

لیکن---- وہ عظیم جذبہ جو میرے وجود میں کارفرما تھا۔ ان سب جذبوں پر غالب آجاتا۔ میری ٹریننگ کا تقاضا تھا کہ میں یہاں جما رہوں۔ ایسی محفوظ پناہ گاہ جانے پھر میسر ہو کہ نہ ہو۔ میں نے ایک کومٹ منٹ خود سے ضرور کر رکھی تھی کہ "زندگی میں اگر کوئی ایسا مرحلہ آگیا جس کی توقع ایک جاسوس کو رہنی چاہیے تو کبھی اس ہنستے بستے گھر پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

گھر پہنچے تو ماتا اور موسی جی کے چہرے کھل اٹھے۔ انہوں نے بابو جی کی رہائی کا "کارن" بھی میری آمد ہی کو جانا۔ ایسی تمام باتیں ان کی نظروں میں میرا مان بڑھا رہی تھیں۔ انہیں پونم سے میری نسبت طے کرنے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

پونم کے رویے میں اس روایتی حجاب نے جگہ پالی تھی جو مشرقی دوشیزاؤں کا خاصہ ہے۔ گو ہم پر ایسی کوئی معاشرتی پابندی عائد نہیں تھی جو ایک دوسرے سے مل نہ سکیں پھر بھی نجانے کیوں اب اس کے رویے میں وہ پہلی سی بے ساختگی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے حسین سراپے کے گرد شرم و حیا کا خول چڑھا لیا تھا۔ وہ ابھی سے ذہنی طور پر مجھے اپنا "پتی" جاننے لگی تھی۔ وہ ہندو لڑکی تھی۔ اس کے دھرم اور سماج نے اس کے لاشعور میں "پتی ورتا" کا جو تصور باندھ دیا تھا۔ وہ جی جان سے اس پر عمل پیرا تھی۔ اس کی محبت نے اب پوجا کا درجہ پالیا تھا اور اپنے ہر عمل سے وہ خود کو "دھارمک پتنی" ثابت کرنے پر تلی تھی۔ میں اس کے برتاؤ سے کٹ کر رہ جاتا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ تقدیر کے سامنے تدبیر کی بے بسی کا احساس مجھے حقیقتاً اب ہوا

تھا۔

○○○

اس روز میں اکیلا ہی سوامی دیانند جی کے آشرم کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنی روانگی کے متعلق پونم کو بھی نہیں بتایا تھا حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے ہمراہ سوامی دیانند جی کے آشرم جاؤں لیکن سوامی کے متعلق بار بار میرے ذہن میں جو خدشات سر اٹھا رہے تھے' ان کا تقاضا یہی تھا کہ میں پہلے اکیلا مہاراج کے درشن کروں۔ ایک مرتبہ اس کے اصل روپ کا علم ہو جاتا تو ہم محتاط ہو سکتے تھے ورنہ تو جو خطرناک لبادہ اس نے اوڑھ رکھا تھا کوئی بھی دوست اس کی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔

میں علی الصبح وہاں جا پہنچا۔ سوامی نے شہر سے باہر ایک ویرانے میں صدیوں پرانے ایک مندر پر قبضہ کر کے اسے آشرم کی شکل دے رکھی تھی۔ مندر سے ملحقہ پراسرار عمارت کے مکمل کمرے میں کوشش کے باوجود نہ گن سکا۔ ہر کمرے کا منصرف الگ الگ تھا۔ "ماتا ویشنو" کے بعد مجھے یہاں صحیح معنوں میں عقیدت مندوں کا جمگھٹا دکھائی دیا۔ لڑکیاں اور لڑکے یہاں موجود تھے۔۔۔۔ یہ تمام لوگ یہاں "روحانی غسل" کرنے آئے تھے اور مختلف الیطا یوگا کورسوں کے ذریعے اپنی آتما کی مکتی کے لئے کوشاں تھے۔ پہلی نظر میں ان کے لئے میرے ذہن میں فوراً ایک لفظ ابھرا تھا "مشرقی ہپی۔۔۔۔" ان کے حلیے' لباس' چال ڈھال میں عجیب سی بے نیازی پائی جاتی تھی۔ یہ بے نیازی لباس میں تو کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتی تھی۔ نوجوان لڑکیاں جو زیادہ تر امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے "آتما کی مکتی" پانے یہاں آ گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں ایک عجیب و غریب نشے سے سرشار تھیں۔ یہ کیسا نشہ تھا جو یہاں کے مکینوں کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ مجھے اسی کا کھوج لگانا تھا۔

سوامی دیانند کا اصل روپ تو یہاں دیکھنے میں آتا تھا۔ کلب میں جو اندازہ میں نے لگایا تھا۔ اُس سے کہیں بڑھ کر اس کی پوجا ہو رہی تھی۔ آشرم میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو گھوم کر ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ ایک عجیب سی یاسیت اس کے درودیوار سے ٹپکتی تھی۔ ہال کمرے میں پھیلی "دھوف" کے دھویں سے اٹھنے والی پراسرار سی خوشبو انسانی تصور کو صدیوں پرانے دور میں لے جاتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر دیویوں اور دیوتاؤں کے نقش "آسن" سب سے پہلے آنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے تھے۔ ان "آسنوں" میں وہ صدیوں پرانے راز پنہاں تھے جو سینہ بہ سینہ مختلف رشیوں سے ہوتے ہوئے سوامی دیانند مہاراج تک پہنچے تھے۔ وہ لوگوں کو جنسیت پرستی کی کھلی تعلیم دے رہا تھا۔ لمبی اور پرتعیش زندگی کا راز ان "یوگ آسنوں" میں چھپا

ہوا تھا جن کی ایک مختصر سی جھلک اس آشرم کے درودیوار پر بنے نقش و نگار میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

میں بھی پہلے سے موجود لوگوں کی بھیڑ میں ایک طرف جا بیٹھا۔ سب لوگ ہال کمرے سے ملحق ایک بغلی دروازے پر نظریں جمائے بے چینی سے سوامی جی کی آمد کے منتظر تھے۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے جب اچانک فضا "جے بھولے ناتھ کی" "جے شو شمبو" کے بے ہنگم شور سے گونجنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گیروی لباس پہنے مہاراج کے داس اور داسیاں اندر گھس آئے۔ انہوں نے "سنکھوں" کو "امرت جل" جو بھنگ اور دیگر الم غلم پر مشتمل تھا' پلانا شروع کیا۔ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے تھے اور کوئی مقدس پانی سمجھ کر غٹاغٹ پی رہے تھے۔ میرے علاوہ کچھ لوگ اور بھی ایسے تھے جنہوں نے اس سے احتراز کیا' جن لوگوں نے یہ امرت جل پی لیا۔ ان پر ایک عجیب سی بے خودی طاری ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی "بھجن کھتا" شروع ہو گئی۔۔۔۔ ڈھولک اور ڈفلی کی سنگت میں سب لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔

پتی تا پاون سیتا رام

بھنگ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور کچھ لوگ وجد میں آ کر پہلے تو جھومنے لگے' اُس کے بعد انہوں نے بے ہنگم انداز میں ناچنا شروع کر دیا۔ پھر اس ناچ میں سوامی جی کی داسیاں اور داس بھی شامل ہوتے چلے گئے تھے۔

خدا کی پناہ۔۔۔۔ ایسا وحشیانہ اور بے ہنگم رقص شاید افریقی قبائل میں بھی دیکھنے کو نہ ملے جس کا مظاہرہ یہاں کیا جا رہا تھا۔ ناچنے والے اپنی ستر پوشی سے قریباً" بے نیاز ہوتے جا رہے تھے۔ خصوصاً" داسیاں تو نیم برہنہ ہو چکی تھیں۔ شیطانی رقص اپنے عروج پر تھا' جب اچانک دروازہ کھلا' اس کے ساتھ ہی "سوامی دیانند مہاراج کی جے" کے نعرے گونجنے لگے۔ جیسے جیسے نعرے بلند ہو رہے تھے' ہیجان انگیز رقص میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ جو لڑکیاں یا نوجوان چکر کھا کر گرنے لگتا اسے آشرم کے سیوا دار اٹھا کر ایک نزدیکی کمرے میں غائب ہو جاتے۔ دروازے پر جیسے ہی دو خوبصورت ناریاں جنہوں نے گیروی لمبے لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور جن کی سیاہ لمبی زلفیں ناگنوں کی طرح ان کے شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں لوہے کی گرزیاں پکڑے نمودار ہوئیں۔ یک لخت سارا ہنگامہ تھم گیا' اچانک چاروں سمت سکوت طاری ہو گیا۔

مہاراج پدھار رہے تھے۔۔۔۔!

اپنی جٹاؤں کو سلیقے سے سمیٹے' دو گیروی دھوتیاں بدن پر لوڑھے' بائیں ہاتھ میں "کمنڈل" اونچا کئے' داہاں ہاتھ جس میں قیمتی ہیرے جواہرات جڑی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ سائبان کے انداز میں اٹھائے "شانتی' شانتی" پکارتا راسپوٹین ہال کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے لباس اور جسم پر نجانے کیسی کیسی تیز خوشبوئیں لگی تھیں۔ سارا ہال کمرہ مہک اٹھا' سوامی کو دیکھتے ہی "سنگتیں" گھنٹوں کے بل جھک گئیں۔ زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو باقاعدہ سجدے میں جا گرے تھے۔ اس کی سیوادار کنیائیں سنگتوں پر اپنی گڑویوں سے عرق کا چھڑکاؤ کر رہی تھیں' جہاں جہاں سے وہ گزرتیں' خوشبوؤں کا ایک طوفان ان کے ہمرکاب ہوتا۔ مہاراج اس اثناء میں اپنے آسن پر تن براجے تھے۔

ایک کونے میں دھرا چھوٹا سا مائیک ان کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ اس اثناء میں لوگ اٹھ اٹھ کر ان کے چرنوں کو چھو رہے تھے۔ کئی نوجوان اور لڑکیاں تو انہیں کتوں کی طرح چومنے چاٹنے بھی لگے تھے۔ سوامی دیانند کا کسی کی پیٹھ تھپکنا غالباً" واپسی کا اشارہ ہوتا تھا۔ جیسے ہی سیوادار کنیاؤں کا چھڑکاؤ مکمل ہوا' وہ مہاراج کے دائیں بائیں ہاتھوں میں لوہے کی پتلی پتلی سلاخیں لئے جن پر گنیش لگا تھا' آن کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی لوگ مؤدب ہو کر نظریں جھکائے بیٹھ گئے اور مہاراج کا "بھاشن" شروع ہو گیا۔

اس نے ہندو دھرم کے حوالے سے ایک مرتبہ پھر لوگوں کو کرودھ' لوبھ' موہ اور اہنکار کو اپنے شریر سے باہر پھینکنے کی ترغیب دینی شروع کر دی اور اس کا واحد طریقہ جنسی بے راہروی بتایا۔ اس طرح بقول اس کے ہر بابش جنسی کاموتاؤں سے بے نیاز ہو سکتا تھا۔ اس دوران ایک بات میں نے خاص طور سے محسوس کی کہ یہاں کسی کو کیمرہ تک لانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ بات بعد میں میرے علم میں آئی کہ یہاں خفیہ گرافی کرنے یا مہاراج کا بھاشن ریکارڈ کرنے کی کوشش کرنے والے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر توڑ دیئے جاتے ہیں۔ مہاراج کے بے پناہ اثر و رسوخ کے آگے مقامی پریس بے بس دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی دبی دبی آواز اس کے خلاف اگر اٹھ بھی جاتی تو اس کے پیروکار ایسا کرنے والے کو پاتال کی تہہ سے ڈھونڈ نکالتے اور اس کا وہ حشر کرتے کہ دوسروں کو دیکھ کر نصیحت ہو جاتی اور وہ کان پکڑ لیتے۔

کچھ شناسا چہرے بھی مجھے دکھائی دے رہے تھے' یہ وہی لوگ تھے جو کلب میں مہاراج کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے رہتے تھے اور جن میں زیادہ تعداد ایئر فورس کے افسران کی تھی جو سوامی پر مٹی جا رہی تھی۔ دوپہر تک کا وقت سوامی کے بھاشن ہی میں گزرا۔ اس دوران میں عورتیں اور مرد اس کے قریب جا کر اسے اپنی مشکلات بھی بتاتے جن کا حل سوامی جی فوراً" نکال

دیتے۔

مختلف اقسام کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے مختلف کمرے مختص تھے۔ جہاں سوامی دیانند کے بڑے چیلے چانٹے خواتین کا اور اس کی داسیاں مردوں کا علاج کرتی تھیں۔ زیادہ تر مریضوں کو یوگا کے مختلف آسن بتائے جاتے تھے۔ مساز پھونک کا فریضہ سوامی خود ادا کرتا تھا۔ دوپہر کے بعد "بھوجن" کا غلغلہ اٹھا۔ سوامی کے درشن کے لئے آنے والوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ صبح سے رات تک کا وقت آشرم میں گزاریں اور اس دوران میں ان کی مہمان داری کے مکمل فرائض سوامی کے ذمے ہوتے تھے۔ صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک سب کچھ آشرم کے لنگر سے سپلائی ہوتا تھا۔ یہاں آنے والے خود بخود اپنے لئے کوئی خدمت تجویز کر لیتے تھے۔ کوئی لنگر میں چلا جاتا' کوئی کمرے صاف کرنے کی ڈیوٹی سنبھال لیتا۔ اگر کوئی مہاراج کے "یوگا کورسوں" میں شرکت کا خواہش مند ہوتا' اس کو اپنا نام ایک جگہ لکھوانا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی پہلے سوامی دیانند سے "فرداً فرداً" ملاقات کروائی جاتی تھی' جس پر اس کی نگاہِ انتخاب ٹھہرتی تھی وہی اس کی سیوا کا مستحق قرار پاتا ورنہ اسے انتظار کرنے والوں کی لمبی قطار میں شامل ہونا پڑتا تھا۔

ان لوگوں کے روزانہ کے معمولات کا شیڈول ان کے گروپ کا انچارج مہیا کرتا تھا جس کے مطابق وہ آشرم میں زندگی گزارنے کے پابند تھے۔ اگر کوئی مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتا تو اسے دھکے دے کر نہ صرف آشرم سے نکال دیا جاتا بلکہ ہمیشہ کے لئے داخلہ ممنوع قرار پاتا تھا۔

سوامی دیانند کے تمام پیروکار "بھگت" کہلاتے تھے۔ اس کے خصوصی سیواداروں میں بڑی مشکل سے کسی کو جگہ ملتی تھی۔ یہاں خاصی تعداد میں وہ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے قیام پذیر تھے جنہیں ان کے والدین نے قانون کے دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بذریعہ پولیس یہاں سے واپس لے جانا چاہا' لیکن وہ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے۔ کیونکہ عدالتی بیانات قبل تو آشرم کے نزدیک پھٹکنے کی جرأت ہی نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی قانونی کارروائی پوری کرنے وہاں آ بھی جاتے تو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انہیں تحریری بیان دے دیتے کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں قیام پذیر ہیں اور ساری زندگی اپنے خود ساختہ بھگوان کے چرنوں میں گزار دیں گے۔ اس کے بعد قانونی طور پر ان کو واپس لے جانے کا کوئی جواز باقی نہ رہتا تھا۔

اس شیطان کے پاس زبردست ہتھیار موجود تھے جن کے ذریعے وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو قابو میں رکھتا تھا۔ وہ تھے نشہ اور مکمل تحفظ کے ساتھ جنسی آزادی۔ بھارتی نوجوان گمراہ نسل کو انہی دونوں چیزوں کی تلاش رہتی ہے۔ جن کے لئے وہ دیوانہ وار اس کے آشرم

میں کچھے چلے آتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس کے چنگل میں پھنسنے کے بعد بچ نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا "خودکشی ——!"

دو تین ماہ بعد اس کے آشرم میں رہنے والی کسی لڑکی یا لڑکے کی لاش شہر کے کسی ویران کونے میں پڑی مل جاتی تھی جس پر اکثر جسمانی تشدد کے نشانات بھی ملتے تھے لیکن آج تک پولیس یہ بھی ثابت نہ کر پائی تھی کہ ان میں سے کسی کا تعلق کبھی سوامی دیانند کے آشرم سے رہا بھی تھا یا نہیں ——؟ ضلع بھر کے تمام اعلیٰ افسران کی بیگمات ان کے گلے جاتی پھرتی تھیں۔ یہی حال افسروں کا تھا —— لدھیانہ' جالندھر حتیٰ کہ فیروزپور تک کے اعلیٰ افسران اس کی شفا کرم کے محتاج رہتے تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک دعویٰ تھا کہ اسے "لوک سبھا" تک رسائی حاصل ہے۔ بڑا گھنا اور خطرناک جال بچھا رکھا تھا اس نے ——!!

میں نے جان بوجھ کر اپنے لئے کمروں کی صفائی کی سیوا حاصل کی تھی۔ اس طرح مجھے وہاں ہونے والے گھپلے کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اس پاپی کے پاؤں چھوئے لیکن حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لئے شناسائی کا کوئی تاثر نہ ابھرا جب کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس نے مجھے بھلایا نہیں ہو گا خصوصاً" پونم کے حوالے سے۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر انجان بنا رہا یا واقعی اس نے مجھے یاد نہیں رکھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد ہی اپنے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک جھاڑو مجھے فراہم کر دی گئی تھی۔ میں جان بوجھ کر اس مخصوص حصے کی طرف نکل گیا جہاں سوامی دیانند کے مستقل چیلے چانٹے قیام پذیر تھے۔ ہر کمرے سے الگ الگ قسم کے مجسموں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ کمرے خاصے کشادہ اور لوہے سے بنے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں اتنی بلند تھیں کہ برآمدے میں کھڑے ہو کر ان کے اندر جھانکنا ناممکن تھا۔ برآمدے میں سوامی کے سیوادار لڑکے لڑکیاں سرشاری کی کیفیت میں ادھر ادھر ڈولتے پھرتے تھے۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر دو تین مرد عورتیں بھی موجود تھیں۔ یہ لوگ بھی ہاتھوں میں جھاڑو پکڑے "کارسیوا" کر رہے تھے۔

تمام سیوادار ہدایت کے مطابق برآمدے ہی میں صفائی کرتے تھے۔ کمروں میں موجود مہاراج کے بالکوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کی اجازت کسی کو نہیں تھی۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ اب میں ایک کونے والے کمرے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اپنی طرف کسی کو متوجہ نہ پا کر میرا حوصلہ بڑھا اور میں لڑکھڑانے کی ایکٹنگ کرتا ہوا کمرے کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ دروازہ

کھلا لیکن جتنی تیزی سے میں اندر گرا تھا اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے باہر آنا پڑا۔ اندر کا منظر دیکھنے کی تاب میری آنکھیں نہیں لا سکی تھیں۔ "اوم گن آتن" کے بم پر بے حیائی کا ننگا عروج میرے سامنے تھا۔ میرے اندر گرنے اور تیزی سے باہر پلٹنے کا کمرے کے مکینوں پر کوئی اثر نہ پڑا —— میں نے انہیں چونکتے ہوئے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اطمینان سے اپنی "یوگ پوجا" میں لگے رہے۔ اب مجھے اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی کہ باقی کمروں میں کیا ہو رہا ہے۔

ooo

سوامی دیانند کے کمرہ خاص کے نزدیک جہاں وہ خود رہتا تھا سوائے اس کی سیوادار کنیاؤں یا پھر اس کے خصوصی محافظوں کے اور کسی کو پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرا ذاتی اندازہ تھا کہ بھارتی پولیس کی گرفت سے بچنے کے لئے کئی قاتلوں اور ڈاکوؤں نے بھی یہاں پناہ لے رکھی تھی۔ یہ لوگ ہر وقت مسلح رہتے تھے کیونکہ اپنا اسلحہ انہوں نے لمبے لمبے چوغوں میں چھپایا ہوا تھا لیکن اس کی نمائش سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ایک مرتبہ سوامی دیانند پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا جس کے بعد حکومت نے اس کے محافظوں کو لائسنس یافتہ اسلحہ رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

اس قاتلانہ حملے کی روداد بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ دلی یونیورسٹی کا ایک نوجوان استاد اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک مرتبہ اس کے گھر گیا۔ سوامی دیانند نے حسب روایت اس کی محبوبہ کو شیشے میں اتار لیا اور وہ آتما کی شکتی کے لئے ایک ہفتہ تک آشرم میں مقیم رہی۔ ایک ہفتے کے بعد جب اس کا دوست اسے واپس بلانے آیا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا اور اپنی باقی عمر مہاراج کے چرنوں میں گزارنے کا اعلان کر دیا۔ امرناتھ نے اپنی محبوبہ کو سمجھایا بجھایا اور سوامی جی کی چاپلوسیوں سے آگاہ کیا لیکن اس کی محبوبہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کے پائے ثبات میں ہلکی لغزش نہ آئی کیونکہ ایک مرتبہ مہاراج کا امرت جل پی لینے کے بعد کوئی ہوش بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ امرناتھ نے پولیس کی مدد حاصل کی' اس کا باپ دلی میں پولیس ہیڈکوارٹر تھا۔ پنجاب کی لیجسلیٹو اسمبلی میں اس کے مقدمے کی بازگشت گونجی لیکن کوئی اس کی محبوبہ کو واپس نہ لا سکا۔ اس بات سے طیش کھا کر اس نے ایک روز چھپتے چھپاتے مہاراج دیانند سوامی پر خنجر سے حملہ کیا لیکن ان کی "صدن شکتی" کے آگے کسی کا وار کب چلتا تھا۔ مہاراج نے نظر بھر کر دیکھا ہی تھا کہ خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا۔ مزید فرائض کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہاراج نے نہ صرف یہ کہ اسے معاف کر دیا بلکہ پولیس کو سرے سے اس کے خلاف کوئی بیان تک نہ دیا۔

اس واقعے نے جال بندروں میں اس کی عقیدت دوچند کر دی تھی اور اس کے پیروکاروں

نے اپنے گرو بھگوان کی حفاظت کے لئے اس کے گرد مسلح پہرے دار مقرر کر دیئے تھے۔

میں نے اس امر پر نگاہ رکھی تھی کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا اور مقام شکر تھا کہ کسی نے میری اس حرکت کا نوٹس نہ لیا' پھر بھی میں نے وہاں سے فوراً ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا اور دوسری طرف چل دیا۔ ابھی تک مجھے وہ کچھ نہیں ملا تھا جس کی تلاش میں' میں یہاں آیا تھا۔ شام تک یہی شور وغل برپا رہا۔ شام کو پھر گروجی بھاشن دینے آن پہنچے۔ اس مرتبہ لوگوں کی تعداد صبح سے بھی زیادہ تھی اور "امرت جل" بھی صبح سے بہت زیادہ پلایا جا رہا تھا۔ مرد عورتیں وحشیانہ انداز میں اٹھ اٹھ کر رقص کرنے لگتے اور لڑکھڑاتے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے۔ شیطان کی روح بھی اس شرمناک ڈرامے کو دیکھ کر شرما رہی تھی۔

میں زیادہ دیر اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور اس کمرے میں چلا آیا جہاں بھوجن پر شاول رہا تھا۔ دال اور پھلکے زہرمار کر کے میں آشرم سے باہر نکل آیا۔ میرا ارادہ اس وقت یہاں سے واپس چلے جانے کا تھا۔ اندھیرا اب گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سوامی دیانند اپنا بھاشن ختم کر کے دوبارہ اپنے کمرہ خاص میں واپس جا چکا تھا جب کہ اس کے پیروکار مختلف ٹولیوں میں بھجن گاتے اور گانجا اور بھنگ پینے کے بعد آشرم کے کونوں کھدروں میں لڑکھڑاتے پھرتے تھے۔ آشرم کے باہر ایک وسیع قطعہ اراضی کار پارکنگ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں اس طرف جا رہا تھا تاکہ کسی ٹیکسی کے ذریعے گھر واپس جا سکوں کہ ایک کار دھول اڑاتی وہاں آ کر رکی اور شاندار سوٹ میں ملبوس ایک درمیانی عمر کا ہندو جو اسے خود ہی چلاتا ہوا آیا تھا' اُس میں سے اُتر کر باہر آیا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا اور مَیں نے لاشعوری طور پر اُس کی طرف دیکھا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شکل کچھ جانی پہچانی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"کون ہو سکتا ہے یہ؟" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور دو تین کاروں کا چکر کاٹ کر دوبارہ ایسا راستہ اختیار کیا کہ جس سے میرا اور اس کا آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔۔۔۔ اس مرتبہ نووارد خاصی روشنی کی زد میں آ چکا تھا اور جیسے ہی اس کے نقوش نمایاں ہوئے' میرا خون کھولنے لگا۔

میرے سامنے بھارتی انٹیلی جنس "را" کا مقامی آپریشن کمانڈر کھڑا تھا۔۔۔۔! میجر بھاسکر۔ جسے عرف عام میں چانکیہ جی کہا جاتا تھا۔ یہ شخص چانکیہ کی طرح مکار اور خونخوار تھا۔ آج تک اس کے ایریا میں گرفتار ہونے والا غیر ملکی جس پر اسے جاسوسی کا شک ہو جاتا تھا' اس کے ہاتھوں سے صحیح سلامت بچ کر نہیں جا سکا تھا۔ وہ اپنے گرفتار شدگان کو اذیتیں دے دے کر پاگل ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اکثر وہ سرحدی علاقوں سے تبلیغ میں آنے والے بے گناہ دیہاتیوں کو جو بے چارے اکثر راستہ بھٹک کر بھارتی علاقے میں داخل ہو جاتے تھے' اپاہج کر دیا کرتا تھا کیونکہ اس

کے نزدیک وہ تمام لوگ پاکستانی ہوتے تھے۔۔۔۔!! حال ہی میں اس نے ہمارے ایک "دوست" کو جس نے جیل سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تفتیش کے بہانے انٹروگیشن سنٹر میں طلب کیا اور سانپ سے ڈسوا کر شہید کروا دیا۔ کاغذی کارروائی میں لکھ دیا گیا کہ وہ طبعی موت مرا ہے!! میرا جی چاہتا تھا اسی وقت اسے جان سے مار ڈالوں۔ اس کی موت جہاں میرے لئے اعزاز تھا وہاں ان درجنوں بے گناہ سرحدی دیہاتیوں کی روحانی تسکین کا باعث بھی بن سکتا تھا جو اس کی ظالمانہ تفتیش کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

ایک مرتبہ پھر میں آشرم کی طرف جا رہا تھا۔ میجر بھاسکر کو ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد اب میری گھر واپسی کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ آشرم کے دروازے پر وہ آنے جانے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ میں بھی اس کی نظروں میں آئے بغیر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب وہ آشرم میں داخل ہوا تو میں نے سوامی دیانند کے خاص سیوا داروں کو اس کا خصوصی احترام کرتے دیکھا۔ وہ سیدھا مہاراج کے کمرہ خاص کی طرف گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ایک محافظ اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ باہر نکل آیا اور اس نے میجر بھاسکر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اب سوامی آنند کے متعلق مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ صرف بھارتی راسپوٹین ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ میں ان لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا جو اس کے کمرہ خاص کے باہر "بھجن کھتا" کر رہے تھے۔

ہنگامی صورت حال سے نمٹنے والا مخصوص چھوٹا سا زہر آلود خنجر نما چاقو میرا واحد ہتھیار تھا جو اکثر خطرناک مقامات پر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ ایک کاری وار اس بھیڑیئے کے لئے کافی ہے لیکن اتنے بھرے مجمع میں یہ کیسے ہو گا؟

میجر بھاسکر کو دیکھ لینے کے بعد اس کے خلاف میرے دل میں پہلے سے موجودہ نفرت دوچند ہو گئی تھی۔ قریباً بیس منٹ کے بعد وہ باہر نکلا۔ اس کے انتظار کی شدت سے میرے اعصاب تڑخنے لگے تھے اور یہ بیس منٹ میرے لئے بیس صدیاں بن گئے تھے۔ میں جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لئے بے تاب ہوا جاتا تھا۔ حسب روایت باہر نکلتے اور اندر داخل ہوتے وقت گروجی کی داسیوں نے اس کے ماتھے پر چندرا اور تلک لگایا تھا جس نے اس کے چہرے کی خونخواری اور بدنمائی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں پرانے دور کا کوئی شاہی جلاد قبر سے اٹھ کر واپس چلا آیا ہو۔۔۔۔ وہ آشرم سے باہر نکل رہا تھا اور میں دبے قدموں اس کے تعاقب میں تھا۔

اس اثناء میں' میں نے اپنا منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور فرار کے امکانات کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔ جیسے جیسے وہ باہری برآمدے کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ خنجر پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا

رہی تھی اور میں اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا۔ جب میجر بھاسکر برآمدے کے اس حصے پر پہنچا جہاں بجلی سپلائی کرنے والا مین سوئچ بورڈ لگا تھا۔ میں نے پھرتی سے ایک گملا اٹھایا اور سوئچ بورڈ پر دے مارا۔ دوسرے ہی لمحے لائٹ آف ہو گئی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اچانک پیش آ جانے والی صورت حال سے بوکھلا کر واپس پلٹا اور میری زد میں آ گیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں سلگی نفرت سمٹ کر میرے بازوؤں میں آ گئی تھی۔ میں نے ٹریننگ کا بہترین داؤ آزمایا اور اسے پھرتی سے کاٹ کر پھینک دیا۔ خنجر اس کے دل میں پیوست ہو کر اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ میں نے اسے باہر کھینچا' اوپر لوڈھی چادر میں اسے چھپا لیا۔ میجر بھاسکر مرتے ہوئے زخمی درندے کی طرح ڈکراتا رہا۔ ابھی وہاں کسی کی آنکھیں اس قابل نہیں ہوئی تھیں کہ اندھیرے میں حملہ آور کو پہچان سکیں۔ برآمدے میں بمشکل پانچ چھ مرد عورتیں موجود تھے لیکن وہ بھی ہماری طرف متوجہ ہونے سے رہے۔ اس کے ہلاک خون کی صرف چھینٹیں میری چادر پر گری تھیں اس کے علاوہ میرے کپڑے بالکل محفوظ تھے۔

میں اندازے سے چند سیکنڈ بعد ہی آشرم سے باہر آ چکا تھا۔ اس اثناء میں اندر کھلبلی مچ گئی تھی کیونکہ بھاسکر کی چیخ و پکار نے کچھ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ لوگ دیوانہ وار باہر کی طرف لپک رہے تھے اور دھکم پیل میں ایک دوسرے کو پاؤں کے نیچے روند رہے تھے۔ جب تک سوامی دیانند کے چیلے مشعلیں روشن کرتے' میں بھاگنے والوں کی بھیڑ میں وہاں سے کافی دور نکل گیا۔ اپنی چادر میں نے آشرم کے قریب ندی میں پھینک دی تھی جس کا تیز رفتار پانی اسے دور بہا لے گیا تھا۔ خود ایک موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لے کر سڑک تک پہنچا اور ایک لاری کے ذریعے لدھیانہ آ گیا۔۔۔۔ ابھی میں اس واقعہ سے غیر متعلق ہی رہنا چاہتا تھا۔

○○○

وہ رات میں نے لدھیانہ میں گزاری اور اگلے روز دوبارہ رائے کوٹ پہنچ گیا۔ راستے میں ایک اخبار میں' میں نے اس درندے کی موت کی خبر پڑھی تو مجھے اطمینان ہوا۔ اخبار میں صرف یہ لکھا تھا کہ آشرم میں بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے کچھ لوگ زخمی ہو گئے جب کہ ایک یاتری مارا گیا۔ سوامی جی کی طرف سے یہ بیان جاری ہوا تھا کہ ان کے کسی دشمن نے یہ شرارت کی ہے اور اس یاتری کی موت کا ذمے دار بھی اُن کا کوئی دشمن ہی ہے جسے وہ اپنی "گپت شکتی" کے ذریعے جلد منظر عام پر لے آئیں گے۔

اٹیلی جنس نے بڑی چالاکی دکھائی تھی اور میجر بھاسکر کو عام شہری ظاہر کیا تھا لیکن یہ خبر چھپ نہیں سکتی تھی کیونکہ اسی رات سیکورٹی حکام نے ضلع بھر کے سمگلروں کے اڈوں پر چھاپے

مارنے شروع کر دیئے تھے اور سرکردہ سمگلروں کی گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ خفیہ پولیس کو یقین تھا کہ میجر بھاسکر کا قتل ملکی یا غیر ملکی سازشوں کا نتیجہ ہے۔

میرے گھر پہنچنے تک یہ خبر سارے رائے کوٹ میں پھیل چکی تھی کیونکہ سوامی کے آشرم سے متعلق پہلے ہی بہت سی پراسرار باتیں لوگوں میں کہی سنی جاتی تھیں اور ایسی باتوں میں لوگ زیادہ ہی دلچسپی ظاہر کرتے تھے۔ میں نے گھر والوں کو یہی بتایا تھا کہ مجھے اس واقعے کا علم اخبار کے ذریعے ہوا ہے۔ بابو جی نے تو "خس کم جہاں پاک" کہہ کر اس پر سب سے زیادہ جامع تبصرہ کر دیا تھا۔

"کیا مطلب' کون تھا مقتول؟" میں نے بابو جی کے ریمارک پر حیرانگی سے پوچھا۔

"بہت برا آدمی تھا بیٹا۔۔۔۔ قصائی تھا۔۔۔۔ قصائی۔ اسے ایسی ہی موت مرنا چاہیئے تھا۔" انہوں نے مختصر سا جواب دیا اور میں ان کے ذرائع معلومات کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں شاید رات ہی میجر بھاسکر کے قتل کی اطلاع مل گئی تھی۔ میں ان کے "نکسلائیڈ" ہونے کی اطلاع کے بعد سے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا اعتماد اس حد تک حاصل کر لیا تھا کہ میرے متعلق وہ شک میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے لیکن انسانی ذہن کا کیا بھروسہ؟ کسی بھی لمحے بھٹک جائے۔ میں نے اس مسئلے کا حل بھی اب ڈھونڈ لیا تھا' لیکن ابھی مجھے وقت کا انتظار تھا۔۔۔۔!

میجر بھاسکر کی موت نے بھارتی انٹیلی جنس کو بوکھلا کر رکھ دیا۔۔۔۔ لدھیانہ اور سرحدی علاقوں میں بسنے والا شاید ہی کوئی مشتبہ شخص ان سے بچ پایا تھا۔ جس کسی پر بھارتی انٹیلی جنس کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ اس شخص کا کبھی ماضی بعید میں بھی پاکستانی سمگلروں سے تعلق رہا ہے' وہ اسے کھینچ کر امرتسر انٹروگیشن سنٹر میں لے جاتے تھے' جہاں پہلے ہی سینکڑوں کی تعداد میں مشتبہ سمگلر اور اس کے پیشے سے وابستہ دوسرے لوگ موجود ہوتے تھے۔ نووارد پر تشدد کا سلسلہ شروع ہو جاتا، لیکن وہ بے چارے کچھ جانتے تو بتاتے۔ وہ تو خود بھونچکے رہ گئے تھے۔ یقیناً وہ بھی دل ہی دل میں اپنے محسن کے شکر گزار ہو رہے ہوں گے جس نے انہیں ایک گھٹیا دشمن سے نجات دلا دی تھی۔

خطرناک صورت حال کے پیش نظر بھارتی سیکورٹی حکام کچھ زیادہ ہی چوکنے ہو گئے تھے اور مشتبہ مقامات پر انہوں نے کڑی نظر رکھنی شروع کر دی تھی۔ ان حالات میں مجھے کچھ عرصے کے لئے اپنی سرگرمیاں معطل کرنے اور صرف آرام کرنے کا حکم ملا۔ مناسب یہی تھا کہ میں فی الحال پردہ سکرین سے ہٹ جاؤں۔

○○○

میں لدھیانہ چلا آیا اور پرکاش کے ساتھ رہنے لگا۔ اسے میں نے یہی بتایا تھا کہ ماتا جی کے حکم پر میں نے فی الحال "سیر و سیاحت" بند کر دی ہے۔ پرکاش نے اس بات پر بھگوان کا شکر ادا کیا کیونکہ عرصے سے اسے میری ضرورت لاحق تھی اور اس کی وجہ تھی مالک مکان کی وہ لڑکی جس سے اس کا عشق زوروں پر تھا۔

سدرشنا کو پہلی نظر دیکھنے کے بعد ہی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے اور عموماً" بھارتی نوجوان ایسی ہی لڑکیوں کی فکر میں رہا کرتے ہیں' لیکن پرکاش میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی جو وہ خود اس پر فدا ہو گئی۔ اس کا مجھے کبھی علم نہ ہو سکا۔ پہلی مرتبہ جب وہ پرکاش کے ہمراہ مجھ سے ملی تو میں نے اس کی آنکھوں میں احترام کے جذبات موجزن دیکھے جو پرکاش کی "برین واشنگ" کا واضح ثبوت تھا۔ ظاہر ہے اس نے میرا غائبانہ تعارف سدرشنا سے بڑے بھرپور انداز میں کافی تعریف و توصیف کے ساتھ کروایا تھا۔ اسے پرکاش سے محبت تھی لیکن اس بات کا بھی اسے علم تھا کہ یہ بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھے گی کیونکہ اس کے والد کا سماجی رتبہ پرکاش کے گھر والوں سے کافی بلند تھا۔ وہ خوشحال کھتری گھرانے کی سپری تھی اور لدھیانہ میں اس کے والد کے درجنوں مکانات کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ چند دنوں کی ملاقات نے ہی اسے میری غیر معمولی صلاحیتوں کا معترف بنا دیا اور جب ایک روز اس نے مجھے اپنے گھریلو حالات بتائے اور اپنی تشویش ظاہر کی تو میں نے اسے یقین دلایا کہ میرے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی طاقت ان دونوں کے ملاپ کو ناممکن نہیں بنا سکتی۔

پرکاش کی تو بات ہی اور تھی۔ سدرشنا کو بھی میری یقین دہانی پر اعتماد ہو گیا تھا' جس کا ثبوت اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ میری یقین دہانی سے کھل اٹھا۔۔۔ اور اس نے خاصے جذباتی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے "بھیا" کہہ کر میرا ہاتھ مضبوطی سے دبایا۔

انسان لاکھ وحشی بن جائے' اپنی بہادری پر اپنے فہم پر جتنا جی چاہے گھمنڈ کرتا پھرے لیکن اپنی فطرت کے کمزور پہلو چھپائے نہیں چھپتے۔ قدرت کے سامنے بندہ مجبور محض ہے اور کچھ بھی نہیں۔ دست غیب موم کی گڑیا کی طرح بڑے بڑے شہ زوروں کو جس طرف چاہے پکڑ کر گھما دے۔ میں نے ہندو معاشرے میں خود کو رنگنے کا ڈھونگ رچایا تھا لیکن نئے نئے تجربات مجھ پر ہونے لگے تھے۔ میں لاکھ پہلو بچاتا مگر کب تک؟ فطرت سے فرار میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ ان مراحل پر مجھے اپنی ٹریننگ میں سکھلائے سارے اصول بے سود دکھائی دیئے۔ بس میرا اعتقاد تھا اور اپنے مشن پر ایمان جو سہارا دیئے رکھتا تھا اور میرے قدم مضبوطی سے اس راہ پر جمے ہوئے تھے۔

پُونم سے دوسرے تیسرے روز ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہم نے لدھیانہ کی تفریح گاہوں کے درجنوں درختوں پر اپنی محبت ثبت کر دی تھی۔ درختوں کے گیلے تنوں میں کئی دل تراشے تھے اور ان میں پرکاش اور پونم کو سمویا تھا۔ اپنی محبت کی امانت کتنی مرتبہ قدیم عمارات کی ان بوسیدہ دیواروں کو سونپی تھی جو پہلے ہی کشتگانِ محبت کے ناموں سے اٹی پڑی تھیں۔ شاید اس طرح ہم لاشعوری طور پر اپنی چاہت کو امر روپ دے رہے تھے۔ بظاہر پتھروں کے سنگلاخ سینوں میں اپنی محبت محفوظ کر کے ہم مستقبل میں ٹوٹنے والی اس قیامت سے لاشعوری طور پر مطمئن ہو بیٹھے تھے جو اپنے دامن میں بجلیاں سمیٹے ہمارے خرمن پر لپکنے کو بے تاب تھیں۔ جہاں پونم کو یہ وشواس تھا کہ کئی جنموں کے بعد ہماری آتما کا ملاپ ہوا ہے وہاں مجھے علم تھا کہ ایسے کئی جنم لینے کے بعد بھی پونم مجھ سے کبھی نہیں مل پائے گی' لیکن میں نے اپنے تئیں اپنے آپ کو وقت کے تیز دھارے کو سونپ دیا تھا جو محبت کی طغیانیوں میں مجھے بہائے لئے جا رہا تھا۔ یاس کے ساحلوں پر بنے ان باغوں میں گھومتے ہوئے جہاں کو نیلیں سندھیا کے گیت گاتی ہیں ہم نے اپنی محبت کی شدت کو محسوس کیا تھا۔ کئی جذباتی لمحے گزرے جب اپنی دھڑکنیں ایک دوسرے میں سموئی تھیں۔ وقت' حالات اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر ہم دونوں ایک دوسرے کے سنگ سنگ فضائے بیکراں کی وسعتوں میں اڑے چلے جا رہے تھے۔

اور پھر۔۔۔۔ ایک روز پُونم نے پرکاش کو راکھی باندھی تو سدرشنا نے بھی میرے ہاتھ میں راکھی کی زنجیر پہنا کر مجھے بھائی بہن کے مقدس رشتے میں جکڑ کر گویا مجھ پر ایک اور گرہ لگا دی۔۔۔۔ مجھ پر ان سب لوگوں کی محبت کی گرفت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر نئی گرہ میرے فرار کو ناممکن بناتی جا رہی تھی۔ پُونم' پرکاش' موسی' ماتا' باپو جی اور اب سُدرشنا۔۔۔۔ مَیں کہاں کہاں سے بچ کر نکل سکتا تھا۔ نینو اور سالگ رام مجھے پُونم سونپ کر کتنے مطمئن تھے' اس کا اندازہ کچھ مَیں ہی لگا سکتا تھا۔

تلوار کی دھار

قریباً" بیس پچیس روز چھٹی منانے کے بعد مجھے ایک مرتبہ پھر میدان عمل میں کودنے کا حکم ملا' اس مرتبہ میں گورداسپور جا رہا تھا--- پر کاش کو حسب سابق میں نے "بزنس ٹور" کا بہانہ تراشا تھا۔

گورداسپور اور بٹالہ کے درمیان دریائے بیاس کے کنارے دشمن نئی مورچہ بندیاں ترتیب دے رہا تھا جہاں انتہائی اہم نوعیت کے خطرناک ہتھیار نصب کئے جا رہے تھے---- مغربی سرحدوں پر بھارت کا پنجاب میں یہ پہلا دفاعی حصار تھا کیونکہ راوی عبور کرنے کے بعد بیاس تک کا علاقہ میدانی ہے اور کسی بھی تربیت یافتہ فوج کے لئے کھلی شکار گاہ کا کام دے سکتا تھا۔

دشمن کی منصوبہ بندی اچانک عمل میں آئی تھی اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے انتظار کیا جائے کیونکہ سرحدی اضلاع میں فوجوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی نقل و حرکت کسی بھی لمحے جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

سرد جنگ عروج پر تھی اور ان حالات میں لمحہ لمحہ کی خبر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ دشمن کی جنگی حکمت عملی پر کڑی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ خاص طور سے وہ شگاف ڈھونڈنے پڑتے ہیں جن کے ذریعے دشمن کے اندر گھسنے کے مواقع میسر آ سکیں۔

مشرقی پنجاب کے دفاع میں دریائے بیاس کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس پل کی جانبی بھارتی دفاع کی دھجیاں بکھیر سکتی تھی۔ دشمن نے دریائے بیاس پر "سری ہرگو بند پور" کے نزدیک ساحل کے ساتھ ساتھ میلوں تک اینٹی ایئر کرافٹ گنز کا سلسلہ پھیلا دیا تھا۔ ان کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ حملے کے سائرن پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی اور دریائے بیاس کے پل پر ایسا خطرناک "چھاتا" تن جاتا جس میں سے کسی ماہر ترین ہوا باز کا گزر بھی ممکن نہ ہو سکے۔ معاملہ اگر طیارہ شکن (اینٹی ایئر کرافٹ) توپوں کا ہی ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہمارے جیالے ہوابازوں کے لئے بھارتی دفاع کا غرور توڑنا کوئی مشکل بات نہیں تھی' لیکن بھارت نے حال ہی میں روس سے حاصل شدہ آٹو میٹک میزائل سسٹم بھی یہیں کہیں چھپا رکھا

تھا۔ جسے فوراً" ڈھونڈ نکالنا ضروری تھا۔

گورداسپور سے میں نے دو تین مرتبہ کپور تھلہ وغیرہ کی طرف بذریعہ بس اور ٹرین سفر کر کے ایک نظر طیارہ شکن توپوں کا جائزہ تو لے لیا تھا لیکن ابھی تک مجھے وہ میزائل کہیں نظر نہیں آئے تھے اور آخر ایک دن قریباً" شام کا وقت تھا جب میں "سری ہرگوبند پور" اتر گیا۔ جہاں یہ چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہے وہاں اپنی مذہبی اہمیت کے پیش نظر جو اسے سکھوں کے ایک گرو کی نسبت سے حاصل ہے' یہاں کے مشہور گردوارے میں لوگوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ واحد قابل ذکر مقام یہاں کی غلہ منڈی تھی جہاں نزدیکی دیہات کے لوگ اجناس کی خرید و فروخت کے لئے آتے تھے۔

شام سے رات تک میں اپنے بزنس کے بہانے سارے شہر میں گھومتا رہا لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔ مختلف مقامات پر لوگ جنگ سے متعلق باتیں تو کر رہے تھے' لیکن ان کی معلومات عام نوعیت کی ہی تھیں۔ انہیں اس حد تک ہی علم تھا کہ دریائے بیاس کے کنارے کنارے پل کے دونوں اطراف میلوں تک بھارتی فوج نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ جنگ ہونے والی ہے یا پھر وہی گھسا پٹا موضوع کہ: آج فلاں جگہ سے جاسوس پکڑا گیا ہے جو کھیتوں میں چھپا وائرلیس کر رہا تھا۔۔ مگر ابھی تک میزائلوں سے متعلق گفتگو سننے کو نہیں ملی تھی۔

رات کو میں ناکام و نامراد اس گردوارے میں سونے کے لئے چلا آیا جہاں مجھے ایک دکاندار کی مہربانی سے کمرہ مل گیا تھا۔ بادل نخواستہ مجھے "پنجہ" میں شرکت کرنا پڑی۔ رات کو مجھے کافی دیر گئے تک نیند نہ آئی۔ میرے ذہن پر ساری رات "میزائل سسٹم" سوار رہا۔ بڑی عجیب و غریب صورت حال پیش آگئی تھی۔ ابھی تک مجھے ان کا کوئی سرپیر نہیں ملا تھا جسے میں اپنی مہم کا نقطہ آغاز قرار دیتا۔ آدھی رات تک میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اچانک امید کی ایک کرن چمکی۔ میں نے سوچا کیوں نہ دریائے بیاس کے کنارے کشتی رانی سے لطف اندوز ہوا جائے' قسمت آزمائی کرنے میں آخر حرج ہی کیا ہے' میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح گردوارے سے ہی "کڑھا پرشاد" کھا کے میں سیدھا مقامی مارکیٹ پہنچا۔ یہاں ایک دکاندار کچھ زیادہ ہی مہمان نواز قسم کا مل گیا تھا۔

"ست سری اکال" میں نے دونوں باپ بیٹے کو دیکھتے ہی دانت نکال کر پرنام کیا۔

جواب میں انہوں نے بھی فتح بلائی۔ میرا حال دریافت کیا اور رات کے قیام کے متعلق اپنی تشفی کی۔

"مہاراج جی یہاں میرا کام تو ختم ہو گیا ہے لیکن آپ کے سلوک نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ آپ سے ملنے چلا آیا ورنہ میں تو واپس لدھیانہ جا رہا تھا۔" میں نے ان میں ہوا بھرنی شروع کی۔

"دھن بھاگ' دھن بھاگ" دونوں باپ بیٹا انکساری سے بولے۔

انہوں نے فوراً" چائے منگوائی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں لیکن اب افسوس ہو رہا ہے کہ آج سے پہلے آپ ایسے اچھے لوگوں کے درشن کیوں نہ ہوئے۔ میری تعریف پر وہ دونوں پھولے نہیں سما رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں' میں نے دریا میں کشتی رانی کرنے کی خواہش ظاہر کی اور انہیں بتایا کہ یہ میرا بہترین مشغلہ ہے۔ فوراً" بیٹا جس کا نام گجندر سنگھ تھا' تیار ہو گیا۔

"لیکن سنا ہے مہاراج جی آج کل اس طرف فوج نہیں جانے دیتی۔" میں نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

"اجی سینا کی....." گجندر سنگھ نے مکمل سکھ بننے کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوج کو موٹی سی گالی سے نوازا۔

"بڑی اچھا تھی مہاراج آپ نے پوری کر دی۔" میں نے انکساری سے جھکتے ہوئے کہا۔

"لالہ جی آپ تو بڑے بزدل لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ ڈر جاتے ہیں سینا سے۔" اس نے میرے ہندو ہونے پر چوٹ کی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی ہم لوگ ایک بس کے ذریعے بیاس کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں تفریحی مقام ہونے کی وجہ سے کالجوں کی کشتیاں بندھی تھیں۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ کشتیاں بھی موجود تھیں۔ ایک کشتی ہم نے کرائے پر حاصل کی اور ایک بوڑھے سے ملاح کو بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ میں نے جان بوجھ کر جنگ کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ دو تین منٹ تو بوڑھا ملاح ہماری گفتگو سنتا رہا۔ میں بھارتی سینا کی حمایت کر رہا تھا اور گجندر سنگھ سے مخالفت کر رہا تھا۔ جو اپنی مخصوص سکھوں والی ذہن میں ہر فقرے کا اختتام کسی گالی سے کرتا تھا۔ اس کی باتوں سے طیش کھا کر بوڑھا ملاح بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گیا۔ گجندر سنگھ نے پاکستانی فضائیہ کے ہاتھوں ۶۵ء میں اپنی فوج کی درگت بنتی دیکھی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں اسی کا تذکرہ کر رہا تھا جب ملاح نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"سردار جی وہ اور وقت تھا اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔"

"کیا ہے مہاشے جی۔" گجندر سنگھ نے اسے بھی چڑایا۔

جواب میں اس نے ان ہتھیاروں کی تفصیل بتانی شروع کر دی جن سے لیس بھارتی فوج کو

اس نے بیاس کے کنارے ڈیپلائے ہوتے دیکھا تھا۔۔۔۔ ہتھیاروں کی ساخت وہ ہاتھوں کی مدد سے سمجھا رہا تھا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر جب اس نے بڑے بڑے ٹریکٹروں پر لدے مختلف سازوسامان کے متعلق بتانا شروع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ وہ سامان اس نے دوسرے کنارے پر واقع ایک گاؤں کے نزدیک اترتے دیکھا ہے تو میں نے دو تین فقروں سے ہی ایسی فضا پیدا کر دی کہ گجندر سنگھ اس پر باقاعدہ جرح کرنے لگا۔

جواب میں ملاح نے بتایا کہ اس گاؤں میں اس کی لڑکی فلاں کے گھر بیاہی ہے۔ سرپنچ بھی اس کا واقف کار ہے۔ قدرت خود بخود میرے لئے راہ ہموار کر رہی تھی۔

قریباً" پندرہ منٹ تک گجندر سنگھ کی بحث کے بعد جب میں نے اندازہ لگا لیا کہ اب گجندر سنگھ سکھ پن کا مظاہرہ کرنے لگا ہے تو میں نے ملاح کو کنارے پر اتار دیا اور خود کشتی چلانے لگا۔ اب ہم نے موضوع بدل دیا تھا۔ مزید بحث گجندر سنگھ کے ساتھ خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی۔ وہ بہرحال سکھ تھا کسی بھی لمحے اس کا دماغ خراب ہو سکتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کشتی چلانے کے بعد ہم واپس کنارے پر چلے آئے۔ گجندر سنگھ کو میں نے یہاں سے رخصت کر دیا کیونکہ ہم نے دو مختلف سمتوں میں سفر کرنا تھا۔ جیسے ہی وہ دفع ہوا میں فوراً" اسی ملاح کی طرف پلٹا۔

ooo

ملاح ابھی دریا کے کنارے کھڑا تھا۔۔۔۔

"شما کرنا چاچا جی۔۔۔۔" میں نے گجندر سنگھ کے رویے کی معافی مانگتے ہوئے اس کے سامنے سکھوں کی روایتی کم عقلی کا رونا رویا۔ ملاح میرے اس حیران کن رویے سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے زبردستی بٹور ٹپ دس روپے دے دیئے اور ساتھ ہی ایک کہانی بھی سنا دی۔

میں نے اسے بتایا کہ میرا ایک بھائی گھر سے اپنے ایک دوست کے ساتھ پانچ ہزار روپے لے کر بھاگ آیا ہے۔ ہم لوگ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اس کا دوست جس نے اسے ورغلایا تھا پنجابی ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہاں گردوارے کے دیہاتوں میں ہی کہیں ان دنوں وہ دونوں یعنی میرا بھائی اور اسے ورغلا کر بھگانے والا اس کا دوست موجود ہیں۔ ظاہر ہے جب تک پیسے موجود ہیں وہ گلچھرے اڑائیں گے۔ اس کے بعد جو میرے بھائی کا حشر ہو گا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اگر نزدیکی دیہات میں مجھے کچھ واقف کار مل جائیں اور میری مدد ہو جائے تو میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ درخواست بھی کر دی تھی کہ اس معاملے کو وہ لوگ

اپنے تک محدود رکھیں۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں مہاراج جی' آپ جو جی چاہے اس ٹکانے میں کریں۔ یہ تو دھندا میرا شغل ہے۔ میں زمیندار ہوں۔ نزدیکی گاؤں میں میری زمین بھی ہے۔ اس نے اپنی امارت مجھ پر جتاتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اسے خوب خوب کھمن لگایا اور اس سے کہا کہ مجھے تو دیکھتے ہی دشواش ہو چلا تھا کہ میں اس کی مدد سے ضرور اپنے بھائی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دہلی آنے کی دعوت بھی دے دی اور اس وقت تک بضد رہا جب تک کہ اس سے "ہاں" نہ کہلوائی۔

بوڑھا ملاح مجھ پر توقع سے زیادہ ہی مہربان ثابت ہوا۔ اس کی ایک کشتی میں بیٹھ کر ہم دوسرے کنارے کی طرف چل دیئے۔ جہاں ہم لنگر انداز ہوئے وہاں ان حالات میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی لیکن فوجی شاید اسے جانتے تھے' اس لئے انہوں نے اس سے "رعایت" برتی۔ "کون ای چاچا نل" (کون ہے چاچا تمہارے ساتھ) ایک سکھ حوالدار نے اونچی آواز دے کر اس سے دور ہی سے پوچھا۔

"پردھنا اے اپنا سردار جی۔" ملاح نے مختصر سا جواب دیا۔

میری توقع سے بڑھ کر تیاریاں یہاں دیکھنے کو ملی تھیں۔ طیارہ شکن توپیں پہلے سے تیار شدہ کنکریٹ کے زیر زمین محفوظ بنکروں میں چھپی ہوئی تھیں' صرف ان کی گردنیں باہر جھانکتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہم دونوں ان کے بیچوں بیچ چلتے نزدیکی گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ میں کن انکھیوں سے صورت حال کا بھرپور جائزہ لے رہا تھا۔ راستے سے ملنے والے اکثر فوجی ملاح کے واقف تھے۔ جب وہ انہیں پرنام کرتا تو میں بھی فوراً" "جے ہند" کہہ کر ہاتھ اٹھا دیتا۔ قریباً" ڈیڑھ دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک جگہ کھیتوں کے کنارے کچھ لڑکے لڑکیاں کام کرتے دکھائے دیئے۔

ملاح نے ان میں سے ایک کو چُونی لال کے نام سے پکارا اور ایک نوجوان اس کی آواز پہچان کر آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر اس نے جھکتے ہوئے بوڑھے کے پاؤں چھو کر پرنام کیا اور حیرانگی سے مجھے دیکھا کیونکہ میں نے بغیر جان پہچان کے بڑی گرمجوشی سے اسے گلے لگا لیا تھا۔

"پردھنا ہے اپنا دیناولی سے آیا ہے۔" چاچا بولا۔

"پرکاش نام ہے میرا۔" میں نے اپنا تعارف بظاہر مکمل کروا دیا۔

ہم تینوں کھیتوں کے ایک کونے پر لگے رہٹ پر جا پہنچے جہاں بہت سی لڑکیاں کپڑے دھو رہی تھیں۔ سب نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ ملاح کو دیکھتے ہی سب نے "چاچا نمستے"

"چاچا رام رام" کہنا شروع کر دیا تھا۔ بوڑھا طلاح سب کے سلام کے جواب میں باری باری ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ یہاں بھی اس نے میرا تعارف بطور "پردھنا" ہی کروایا تھا۔ سب لڑکیوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے بھی باری باری "نمستے" کہا۔ میرے قیمتی لباس اور "پرکشش شخصیت" کو ان میں سے اکثر نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن یہ کوئی نئی یا چونکا دینی والی بات نہیں تھی۔ اب میں بھارتی عیاشوں کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔

رہٹ پر بنے ایک کمرے میں بیٹھ کر چاچا نے پہلے تو مجھے چائے پلائی' پھر کملا نامی ایک لڑکی کو میرے لئے "جل بھوجن" کا حکم دیا۔ جس نے اک ادائے دلربانہ سے میری سمت دیکھتے ہوئے تعمیل میں گردن ہلائی اور اپنی بے حجاب جوانی منصانتی' مستانی چال سے قیامت ڈھاتی تیز تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دی۔ چاچا نے چوٹی کو جو اس کا والد تھا' میری کملا میں صرف اتنے سے اضافے کے ساتھ شادی کہ میں اس کے ایک دوست کا بیٹا ہوں۔ شاید اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے یہ اضافہ کیا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے خوشی ہوئی۔ سارے بھارت میں میں نے ابھی تک ایسا فراخدل والد نہیں دیکھا تھا جیسا چاچا ملاح کو نصیب ہوا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بظاہر تو اس میں کوئی جسمانی نقص نظر نہیں آ رہا تھا۔ تین نقص بھی ٹھیک ہی تھے۔ پھر جلد ہی مجھے سمجھ آ گئی۔ اس کی دھرم پتنی کوشلیا سر پر لسی کا مٹکا اور ہاتھوں میں دونیاں پکڑے وہاں آئی تھی۔

الزنیاروں کی طرح اس کے انگ انگ سے نشہ پھوٹتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی اسے شادی شدہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اتنی خوبصورت بیٹی پیدا کرنے پر یقیناً ہندو ملاح کو فخر کرنا چاہیے تھا اور اسی دیوی کے دام الفت میں پھنسنے والا اس کا "داس" کیسے نہ بنتا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور کپڑے سمیٹے باہر چلی گئی جو اس نے صبح سے دھوپ میں سکھانے کے لئے پھیلا رکھے تھے۔

ان کی مزید توجہ حاصل کرنے کے لئے میں نے بھی وہی کھانا کھانے کی خواہش کی جو کوشلیا' چوٹی لال کے لئے لے کر آئی تھی لیکن چاچا نے مجھے شدت سے منع کر دیا۔ وہ کوئی پرانے دور کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ روایت کی جس کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ چاچا تھوڑی دیر کے بعد معذرت کر کے چلا گیا کیونکہ کشتیاں اکیلی تھیں۔ چوٹی لال کو اس کے جانے کے بعد میں نے بھگا دیا۔

"دیر ہی آپ کام کیجئے۔ میری وجہ سے....." میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یار کچھ اچھا نہیں لگتا۔" اس نے جھجکچاہٹ ظاہر کی۔

میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ "کسان کے لئے وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم تو شہری لوگ ہیں۔ چائے کا کپ پیتے ہوئے نکل چلے جائیں تو آدھا دن گزار دیتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

جواب میں وہ ہنس دیا اور میرا "دھنواد" کرتا ہوا مدھیاں اور لسی اٹھا کر دوبارہ کھیتوں کو چل دیا جہاں اس کے ساتھی اس کے منتظر تھے۔ اب تنہائی میسر تھی لیکن سوچنے کے مواقع حاصل نہیں تھے کیونکہ لمحوں بھر کی تیاریوں نے میرا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ ان کی "مہمت بازی" (جو یہاں کے دیہاتی دیہاتوں کی روایت بنتی جا رہی ہے) نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں ان کے مختلف ریمارکس کے جواب میں مسکراتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں کوشلیا کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ مجھے نزدیک آتے دیکھ کر اس نے اک ادائے خاص سے مسکراتے ہوئے کھڑے ہو کر مجھے خوش آمدید کہا۔

"بہت خوبصورت زندگی ہے آپ لوگوں کی۔ میں نے دیہاتی ماحول پہلی بار دیکھا ہے۔" میں نے گفتگو شروع کرنے کے لئے نظر اس کی طرف اچھال دی۔

"ہاں جی ایسا ہی ہے' اب تو شہروں اور دیہاتوں میں کوئی زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔" اس نے زمین پر جھکتے ہوئے کپڑا اٹھا کر اسے جھٹکا دیا جس نے اس کے جسمانی زاویوں کو بڑے خوبصورت انداز سے ابھار دیا۔ میرے دل و دماغ میں اک چھناکا سا ہوا۔ کوشلیا میں ہلا کی جنسی کشش تھی۔ میں نے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

"کیا کرتے ہیں آپ۔" اس نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"بزنس' کاروبار۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس اثناء میں کملا اس طرف آتی دکھائی دی۔

"اچھا آپ چل کر جل بھوجن کیجئے' کسی شے کی ضرورت ہو تو کملا موجود ہے' اسے کہہ دیجئے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"شکریہ!" میں نے مڑتے ہوئے کہا۔

"آیئے مہاراج جی بھوجن کیجئے۔" کوشلیا نے جو میرے قریب آ گئی تھی۔ بڑے نازو ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلئے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ میرے آگے آگے چل دی۔ کیا قیامت کی چال تھی ظالم کی۔ ہر قدم ایک نیا انداز لئے ہوئے تھا۔ پیچھے قدموں سے وہ میری راہنمائی کرتی ہوئی مجھے اس کمرے میں لے آئی جو شاید

ان لوگوں کا مہمان خانہ تھا۔ میں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا' اس نے میرے سامنے "تھالی" لگا دی اور خود بڑے مستانہ انداز میں جھکتی ہوئی ایک کونے میں رکھے ہوئے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ میں کھانے سے زیادہ چور نگاہوں سے اس کے بھرپور شباب کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب کبھی اچانک ہماری نگاہیں آپس میں ٹکراتیں تو شرم سے میں پانی پانی ہونے لگتا تھا لیکن وہ ڈھیٹ اپنی برقرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھورتی رہی۔

"دلی کے لوگ گونگے ہوتے ہیں کیا؟" قریباً تین منٹ تک میرے مسلسل خاموش رہنے پر اس نے اک ادائے مستانہ سے میرے سامنے کھڑے ہو کر کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں مَیں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"بہرے بھی ہوتے ہیں۔" وہ دوبارہ تنک کر بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں' اصل میں ڈرنا بھی تو پڑتا ہے آپ سے۔" میرے لئے اس سے گفتگو کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

"ہم آپ کو کھا نہیں جائیں گے۔" اس نے میرے سامنے سے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

ہاتھ دھونے کے لئے ہم دونوں اکٹھے ہی باہر نکلے تھے۔ رہٹ پر بیٹھی مٹیاروں کی خصوصی مسکراہٹ ہم دونوں سے متعلق کسی اور ہی بات کی چغلی کھا رہی تھی۔

کملا سے کام چل سکتا تھا لیکن اتنا وقت میرے پاس نہیں تھا کہ اس سے اپنے طوفانی عشق کا اظہار کر سکوں اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ وہ مجھے اتنا موقع ہی کہاں دیتی تھی۔ ہر بھارتی لڑکی پونم نہیں تھی' یہاں محبت کا نقطہ آغاز جسمانی مراسم تھے جو میرے نزدیک انتہائی مکروہ اور گھناؤنا فعل تھا۔ اپنے عظیم مقصد کے سامنے مجھے ایسی حرکتیں بڑی ہیچ اور گھٹیا دکھائی دیتی تھیں۔

قدرتی حسن سے لطف اندوز ہونے اور دیہاتی زندگی کا نظارا کرنے کے بہانے میں نے اردگرد کے کھیتوں میں بھی چکر لگائے تھے لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ شام کو مجھے کوشلیا نے کملا کے ساتھ گاؤں جانے کو کہا۔ یہ کٹائی کا موسم تھا اور انہیں فصلوں کا حساب چکانا تھا۔ چُونی لال اور اس کی واپسی میں کچھ دیر تھی۔ باقی لڑکیاں بھی کام ختم کر کے واپس جا چکی تھیں۔

ہم دونوں کھیتوں کے وسیع سلسلے میں چلتے گاؤں کی سمت روانہ ہو گئے۔ اس اثناء میں پنجابی جنی کو یقین ہو چلا تھا کہ میں "قابو" آ چکا ہوں۔

"بڑی فوج آ گئی ہے یہاں۔" میں نے اس کی ممکنہ گفتگو سے بچنے اور اپنے مطلب کی بات حاصل کرنے کے لئے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

"ہاں" اس نے بددلی سے مختصر سا جواب دے کر گویا اس موضوع کو بدلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"یہ تمہارے ہی گاؤں پر عاشق ہوئے ہیں یا اردگرد بھی۔" میں نے ذومعنی فقرہ کہہ کر ایک حد تک اس کی بھی تشفی کر دی۔

جواب میں کملا نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں' اردگرد بھی ڈیرے ڈال رکھے ہیں کمبختوں نے۔ پنجابی تو کچھ یہیں ہیں ورنہ اُس طرف تو بس گورکھے اور مدراسی ہی نظر آتے ہیں۔" اس نے میری معلومات میں اضافہ کرنا شروع کیا۔

"کیا مطلب' گورکھا اور مدراسی کیا بھارتی سینا کے جوان نہیں؟" میں نے اسے مزید کریدا۔

"جہنم میں جائیں سب ہمیں کیا۔ بڑے بڑے ٹرکوں نے کھیتوں کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔" وہ ناراض لہجے میں گویا ہوئی۔

"بھئی یہ تو ضروری ہے پھر اتنے ٹرک کہاں ہوتے ہیں۔ گاؤں کی سڑک سے بھی وہ گزر سکتے ہیں۔ عام سے ٹرک ہوں گے۔" میں نے اسے اس موضوع پر مزید بولنے کی دعوت دی۔

"عام سے! اتنے بڑے بڑے ٹرک تو نہ دیکھے نہ سنے۔ عام ٹرکوں سے تین تین گنا تو وہ لمبے تھے۔ پھر ان کے بے شمار ٹائر۔ ٹرکوں پر کمبختوں نے نجانے کیا کیا لاد رکھا تھا۔ موئے دریا کے کنارے تو مرے نہیں۔ گاؤں کی زمین پر قبضہ جما لیا——— ہائے رام بے چارے بشن سنگھ کی تو سونے جیسی زمین کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ کیسی شاندار فصل ہوئی تھی اس کی——— بتیری منتیں کیں اس نے کہ مجھے فصل کاٹ لینے دو پر کون مانتا ہے جی غریبوں کی بات——— اور "کالی" کا غضب پڑے "راکھشوں" پر کمبخت نزدیک تو کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے۔" اس نے خالص دیہاتی لہجے میں انہیں لتاڑتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے سینا کیا ہوئی یہ تو لٹیرے ہو گئے۔" میں نے دل ہی دل میں اتنی باتوں کا علم ہونے پر خدا کا شکر گزارتے ہوئے کملا سے کہا۔

"بس جی کیا بتاؤں گاؤں والیاں بھی تو "رام رام" ہی ہیں۔" وہ اب مجھے اپنے موضوع کی طرف لا رہی تھی۔

یہ نئی چنتا آن پڑی تھی۔ مجھے اپنے کام سے زیادہ مشکل کملا سے جان چھڑانا نظر آ رہا تھا——— گھر پہنچ کر اس نے میرا تعارف وہاں موجود ایک قریباً اندھی اور خاصی ادھیڑ عمر عورت سے کروایا۔ یہ اس کی ماں تھی جس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ میرے ساتھ رنگ رلیاں

منانے جا رہی تھی۔ مجھے اس بدنصیب بڑھیا پر بڑا ترس آیا۔ شام کے بعد کوشلیا بھی آ گئی۔ چُنی لال نے معذرت کر دی تھی کیونکہ آج اس کی "پتنی کی باری" تھی البتہ اس نے یہ ضرور کہلا بھیجا تھا کہ کل وہ میرے ساتھ میرے بھائی کی تلاش میں دو تین مشتبہ نزدیکی دیہات میں ضرور جائے گا اور پرماتما کی کرپا سے ہم دو تین روز میں اسے ڈھونڈھ کر رہیں گے۔

کوشلیا کے دو بچے تھے۔ دونوں اس کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے جاتے تھے۔ ابھی وہ سکول جانے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ نند اور بھابی دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر میری خدمت کر رہی تھیں۔ کملا سے اگر میں نے تعلقات استوار کر لئے تھے تو کوشلیا نے میری دلچسپی اپنی ذات کے متعلق محسوس کر لی تھی اور وہ اپنے گرفتار محبت سے بطور ہمدردی کم از کم اس کی خدمت تو جی بھر کے کر سکتی تھی۔ میں نے بھی دوپہر سے اب تک دو تین مرتبہ اس سے "دیر سے ملاقات" ہونے پر اپنی قسمت کو کوسا تھا۔ جس کے جواب میں وہ مسکرا کر رہ جاتی اور مجھے دینے کے لئے اس کے پاس اور تھا ہی کیا؟

کملا البتہ قابل داد تھی کہ اس نے اپنی بھابی کو کسی حرکت پر شک کرنے کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ میری طرف سے وہ پہلے ہی مطمئن تھی کیونکہ جس انداز میں مجھے اس سے عشق ہوا تھا۔ اس کے بعد کسی اور لڑکی پر میرا دل آ جانے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

○○○

رات کے پچھلے پہر جب گاؤں کے کسی نزدیکی کھیت پر کوئی اونچے سروں میں بانسری پر "مرزا صاحباں" الاپ رہا تھا عین اس وقت کملا نے مجھے قریباً جھنجھوڑتے ہوئے بیدار کیا۔ میرے منہ سے لاشعوری طور پر نکلنے والی ممکنہ چیخ یا آواز کے پیش نظر اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا تھا۔ میں چنی لال کے کمرے میں سو رہا تھا جب کہ وہ دوسرے کمرے میں اپنی ماں کے قریب سوئی تھی۔ تیسرے اور مکان کے آخری کمرے میں کوشلیا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ محو استراحت تھی۔ اصولاً مجھے اس وقت طے شدہ مقام پر ہونا چاہیے تھا جہاں ملنے کا وعدہ کملا سے میں نے کیا تھا۔ وہ اس جگہ قریباً دس پندرہ منٹ میرا انتظار کرنے کے بعد یہاں چلی آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں دبے قدموں باہر جا رہے تھے۔

کملا آگے آگے تھی اور میں پیچھے پیچھے۔ ہم دونوں خوفزدہ چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے بالآخر گاؤں کے باہر آ گئے' یہ جگہ خاصی محفوظ تھی۔ خدا کا شکر گزار کہ اس گاؤں میں کتے نہیں تھے۔ حال ہی میں محکمہ صحت نے ان کا صفایا کیا تھا ورنہ کوئی نئی مصیبت بھی پیش آ سکتی تھی۔ کھیت جن کا ذکر کملا نے کیا تھا' گاؤں سے قریباً دو تین فرلانگ دور تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ

رک گئی۔ مجھے بھی رکنا پڑا کیونکہ قریبی کھیتوں سے روشنی کا ایک منبع پھوٹ رہا تھا۔ شاید کوئی جیپ سٹارٹ ہو کر باہر نکل رہی تھی۔ کملا سہم کا مجھ سے چمٹ گئی اور میرے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ خیریت گزری کہ جیپ کا رخ ہمارے مخالف سمت تھا۔

جہاں ہم کھڑے تھے وہ کوئی گزرگاہ تھی جس کے محفوظ ہونے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اپنے منہ زور گھوڑے کی طرح لگام تڑوانے کے لئے بے تاب جذبات کو قابو کرتے ہوئے میں نے کملا کو وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اب ہم کھیتوں میں بنی کسی جھونپڑی کی تلاش میں تھے۔ میں نے کملا کو وہیں بٹھایا اور خود آگے چلا گیا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں کچھ دور تک دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں لیکن یہاں سے سوائے بڑے بڑے وہیکل اور طیارہ شکن توپوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی مجھے بمشکل تین منٹ ہی گزرے تھے جب میں نے اپنے کندھے پر کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو مصیبت سر پر سوار تھی۔

"کیا ہے یہاں؟" اس نے متجسس ہوتے ہوئے بیقراری سے پوچھا۔

"شش....." میں نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے واپس کھینچنا شروع کیا۔ قریباً پندرہ بیس گز چلنے کے بعد ہم رک گئے۔

"اپنی دال تو گلنے سے رہی۔ یہاں تو پہلے سے ہی....." میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا مطلب؟ کون ہے؟" اس کا تجسس بڑھا۔

"ایک کو میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ وہی دیوی جی ہیں جو کنویں پر کچھ زیادہ ہی باتیں کر رہی تھیں---- وہ کالی قمیص شلوار والی۔"

"جیتو۔" اس نے فوراً کہا۔

"ہم تو مجھے آتا نہیں' صبح پہچان کر بتا دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے یہ سب۔" اس نے اپنی سکھیوں کے لئے انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کئے اور ایک مرتبہ پھر میری جان کو آ گئی۔ اب میں سب کچھ بھول بھلا کر اس سے جان بچانے کی فکر میں تھا۔ بمشکل تمام کافی خطرناک مراحل طے کرنے کے بعد میں اگلی رات تک چھٹی لینے میں کامیاب ہو سکا۔ اس اثناء میں اس کے والہانہ لمس نے میری رگوں میں شرارے بھر دیئے تھے۔ میں پگھل جاتا اگر میری مضبوط قوت ارادی ایک مضبوط چٹان کی طرح اس کے اور میرے درمیان دیوار نہ بن گئی ہوتی۔ ایمان اور جان بچ جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

گھر واپس پہنچ کر چارپائی پر لیٹ گیا' لیکن نیند کہاں؟ آج کی رات کے ضیاع کا رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ کم از کم اس گاؤں کی کسی لڑکی کے ذریعے مقصد کا حصول ناممکن دکھائی دیتا تھا۔

میں نے آنے والی رات تک کچھ نہ ہو سکنے پر اکیلے ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور نیند کی آغوش میں پناہ لے لی۔

صبح مجھے کوشلیا نے بیدار کیا۔

"بہت گہری نیند آئی تھی؟" اس نے چائے کا ایک کپ میرے سرہانے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں رات کو تارے گنتے رہیں تو صبح نیند ہی آئے گی۔" میرے جواب سے وہ جھینپ سی گئی اور مجھے "جنگل اشنان" کا کہہ کر باہر چلی گئی۔ ناشتہ کر کے میں بھی ان کے ساتھ ہی کھیتوں میں چلا آیا۔ چُونی لال جو صبح صادق کے وقت کنویں پر سویا تھا۔ اسے بیدار کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور کملا اور کوشلیا کے نزدیک کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دونوں حسب سابق کپڑے دھونے میں لگ گئی تھیں۔ پھر کوشلیا اور اس کے بچے تو "ناکہ" دیکھنے کھیتوں میں چلے گئے اور وہ بلائے جان وہیں رہ گئی۔

ooo

دس گیارہ بجے کے قریب چُونی لال بیدار ہو گیا۔ اس نے رات گھر نہ آنے پر اپنے "پردھنے" سے معافی مانگی اور اشنان کرنے چلا گیا۔ کملا اور کوشلیا کا لایا ہوا ناشتہ کرنے کے بعد وہ تیار ہو گیا اور ہم دونوں اپنے جعلی بھائی اور اس کے آوارہ دوست کی تلاش میں قریبی دیہات کی طرف چل دیئے۔ شام گئے تک ہم مختلف دیہاتوں کی خاک چھانتے رہے لیکن گم شدہ افراد کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔ اس اثناء میں چُونی لال میری امید بندھاتا رہا کہ جلد یا بدیر بالآخر ہم انہیں ڈھونڈھ نکالیں گے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اس کے ایک دوست کے ڈیرے پر کھایا جہاں مجھے "ماتا ویشنو کے درشن کی انی" دکھانے پر شراب سے تجلت مل سکی ورنہ تو وہ لوگ مجھے لٹا کر پلانے پر تل گئے تھے۔

واپسی پر میں نے چُونی لال سے گورداسپور جانے اور وہاں قسمت آزمائی کرنے کی اجازت طلب کی۔ وہ بضد تھا کہ میں دو چار روز اور قیام کروں۔ کم از کم چاچا سے ملے بغیر تو نہ جاؤں لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ میں دو ایک روز میں واپس آؤں گا اور اس کے ہاں قیام کروں گا اور وہی سے خود آ کر اسے اور بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ایسے محسن کی سیوا نہ کرنے سے میرا دھرم بھرشٹ ہو سکتا تھا۔

واپسی پر ہم کھیتوں کے بجائے سیدھے گھر چلے آئے۔ خیریت گزری کملا ابھی تک کھیتوں سے واپس نہیں آئی تھی۔ غالباً میری آمد کی منتظر تھی۔ میں نے چُونی لال کو گاؤں کے باہر بڑی مشکل سے واپس جانے پر مجبور کیا ورنہ وہ تو مجھے کم از کم ٹمبو چڑھانے تک میرے ساتھ رہتا

چاہتا تھا۔ واپسی پر جب وہ خاصا دُور چلا گیا تو میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا کیونکہ اس پر لوگوں کی آمدورفت تھی۔ ایک ذیلی راستے سے میں گاؤں کی طرف چل دیا۔ "پرکاش اینڈ پرکاش انڈسٹری" کے تمام کاغذات میں نے پہلے ہی جلا کر راکھ کر دیئے تھے' اب میرے پاس قابل شناخت کوئی چیز باقی نہیں تھی۔--- میرا مشن شروع ہو چکا تھا۔

گاؤں کے ایک کونے میں بنے سانسیوں کے اڈے سے میں نے ایک ربڑ کا بلیڈر شراب سے بھروایا' اسے اپنے کپڑے کے تھیلے میں ڈالا۔ اب میں ایک غیر قانونی حرکت کا مرتکب تھا اور ناجائز طریقے سے ایک خفیہ اڈے سے شراب خرید کر دوسرے کسی گاؤں یا شہر میں فروخت کرنے جا رہا تھا۔ دن کو ممکنہ تلاشی کے پیش نظر میں نے رات کے وقت سفر اختیار کیا تھا۔ یہ تھا میرا نیا بھیس---!

شام ڈھلے میں گاؤں کے پرلی طرف واقع ان کھیتوں کے نزدیک کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا تھا جن سے کچھ فاصلے پر یہ مورچہ بندیاں کی گئی تھیں۔ اس سے آگے جانا فی الحال ناممکن تھا۔ وہیں ایک کملو کے کھیت میں میں نے ڈیرے ڈال دیئے اور رات کی تاریکی کا منتظر ہو گیا۔

تقریباً" دو گھنٹے میں وہاں چھپا رہا۔ میرا ذہن اس دوران میں مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ کبھی پُونم' کبھی سدرشنا اور کبھی اپنا پیارا ملک جہاں عزیز و اقارب دیدہ دل فرش راہ کیے میرے منتظر تھے۔ ان کے دعاؤں کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ مجھے یہاں بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ میرا ایمان تھا کہ جب تک میری قوم اپنے سپاہیوں کے لئے دعاگو ہے' اُن پر آنچ نہیں آئے گی۔ دشمن کا بے شمار اسلحہ اور بے تحاشہ جنگی جنون میں نے اپنی آنکھوں سے نظارہ کیا تھا--- وہ اپنی دانست میں میرے پاکستان کو مٹانے کے وہم میں مبتلا تھا۔

ہم بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے اور بقاء کی جنگ لڑنے والے ہارا نہیں کرتے!!

مختلف جیپوں کی جلتی بجھتی روشنیاں مجھے وہاں ہونے والی نقل و حرکت کا احساس دلا رہی تھیں۔ جب چاروں طرف سناٹا چھا گیا اور کافی دیر تک کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس اندھیرے میں نہ چمکیں تو میں نے بھی اللہ کا نام لے کر قدم اس طرف بڑھا دیئے۔ میں بڑی احتیاط سے کھیتوں کے بیچوں بیچ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتا اس طرف گامزن تھا کیونکہ یہ خطرہ تلوار کی طرح ہر وقت میرے سر پر لٹک رہا تھا کہ دشمن نے یہاں "مائنز" یعنی بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہوں گی۔ جن پر کسی بھی وقت میرا انجانے میں پڑنے والا قدم کوئی قیامت ڈھا سکتا تھا۔ ذرا سا دباؤ کسی بارودی سرنگ پر پڑتا اور میرے پرخچے اڑ جاتے۔

پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا میں کچھوے کی رفتار سے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے

جیسے میں اس کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا' میرے خون کی گردش میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ ایسے مواقع پر رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا۔ کاش میں کمانڈو ہوتا اور دشمن کو تس نہس کر کے رکھ دیتا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ مجھے اندھیرے میں دو تین لالٹینیں جلتی نظر آ رہی تھیں۔ جو مختلف خیموں کے باہر ٹنگی تھیں۔ ان خیموں میں ان اسلحہ جات سے متعلق عملے کا قیام تھا یا پھر وہ کیموفلاج کرنے کے لئے گاڑے گئے تھے۔

میں اب منزل پر پہنچ چکا تھا۔ مختلف نصب شدہ آلات نے ایک خطرناک اسلحہ کی موجودگی کا انکشاف مجھ پر کر دیا تھا۔ جدید ترین اور انتہائی موثر آٹومیٹک میزائل سسٹم یہاں نصب تھا۔ یہ وہ روسی میزائل تھے جو دشمن نے حال ہی میں حاصل کئے تھے اور جن کے خودکار نظام فائرنگ سے کسی حملہ آور طیارے کے بچ نکلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتے تھے۔ جیسے ہی حملہ آور طیارہ ریڈار کے مخصوص علاقے میں داخل ہوتا' وہ ایک خودکار نظام کے ذریعے اس کی اطلاع فوراً" میزائل کے فائرنگ سرکٹ کو کر دیتا تھا جو طیارے کو فائرنگ رینج میں لے آتا۔ جیسے ہی طیارہ فائرنگ کی حدود میں آتا' ایک اور خودکار نظام کے ذریعے خود بخود فائرنگ بٹن حرکت میں آ جاتا۔ نصب شدہ میزائل اپنے ہینگر سے نکل کر اس کے تعاقب میں لپکتا اور چند لمحوں میں طیارے کو جا لیتا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا اور پائلٹ کو اس کی اطلاع اس وقت ہوتی تھی جب اس کا طیارہ نشانہ بن چکا ہوتا۔

میں رینگتا ہوا اپنے ہدف کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ قریباً" دس پندرہ منٹ تک میں وہاں موجود مختلف چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنے مطلب کی تمام اطلاعات مجھے حاصل ہو چکی تھیں۔ اب میں مخالف سمت میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کامیابی پر خوشی کے مارے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور میں کافی حد تک لاپرواہ سا اس پگڈنڈی پر رواں دواں تھا جو مجھے پکی سڑک تک لے جاتی۔

ابھی بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ ہی چل پایا تھا جب اچانک "ہالٹ" کی دو تین آوازیں وقفے وقفے سے گونجیں۔ میں گشتی پارٹی کے جو رات کو ایسے علاقوں میں ہیزوں کے لئے نکلتی ہیں' ہتھے چڑھ گیا تھا۔ چاروں طرف سے آنے والی آوازوں نے مجھے گھیرے میں پھنس جانے کا یقین دلا دیا تھا۔ اگر میں ایک قدم بھی آگے بڑھاتا تو درجنوں گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتیں سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا اور فوراً" ہاتھ اٹھا دیئے۔

"کون ہے؟" گورکھا لہجے میں کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں' تھیلا میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔

"کیا ہے یہ؟" دوسری آواز سنائی دی اور آنے والے نے مجھے زوردار لات رسید کر دی۔ بے خیالی میں' میں الٹ کر پرے جا گرا۔ آنے والے نے تھیلے میں سے شراب کا بھرا ہوا بلیڈر نکال لیا۔ اس اثناء میں تین چار مسلح فوجیوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"کدھر جاتا تھا۔" اس گورکھے حوالدار نے پوچھا جس نے مجھے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا تھا۔

"صاب غریب آدمی ہے' بال بچوں کی روٹی کے لئے ذرا سا دھندا کرتے ہیں۔ شہر جا رہا تھا۔" میں نے شراب سے بھرے بلیڈر کی طرف اشارہ کیا کیونکہ تھیلا اٹھانے والے نے اسے سونگھ کر اس میں شراب کی موجودگی کی اطلاع کر دی تھی۔

"ابے تیرے غریب کی ایسی کی تیسی۔" حوالدار نے میری پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔

"اٹھ سالے ابھی تیرا دھندہ کرتے ہیں۔" اس نے حکم دیا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر کھڑا ہو سکوں' ایک اور زوردار لات میری پیٹھ پر پڑی اور میں منہ کے بل پرے جا گرا۔

"مسخری کرتا ہے سالا۔" ایک نائیک بولا اور اس نے بھی میرے پہلو میں لات جما دی۔

دوسرے سپاہیوں نے بھی اس کارِ خیر سے محروم رہنے میں عار سمجھتے ہوئے مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں نے اپنا سر کہنیوں میں چھپا لیا۔ قریباً" پانچ چھ منٹ بعد جب میں مار کھاتے کھاتے ادھ موا ہو چکا تو انہوں نے میرے بازو کندھے پر رکھی چادر سے پیچھے کی طرف باندھ دیئے اور مجھے دھکے مارتے ہوئے اپنے کیمپ کی طرف چل دیئے۔

ooo

اچانک پیش آنے والی صورت حال نے مجھے چکرا دیا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود اور دشمن سر پر مسلط۔ ظالموں نے اس بیدردی سے پیٹا تھا کہ بدن کا رواں رواں فریادی بن گیا۔ خصوصاً" پسلیوں پر پڑنے والی ضربات سے اٹھنے والی ٹیسیں تو جان نکالے دیتی تھیں لیکن سوائے صبر کے اور چارہ تھا ہی کیا؟

مجھے وہ دھکے دیتے ہوئے اپنے کیمپ کی طرف لے جا رہے تھے اور جیسے ہی میں چلتے چلتے لڑکھڑاتا' ایک زوردار لات ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھے رسید کر دیتا۔ تکلیف اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے میرا خون کھولنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا ان میں سے ایک آدھ کو تو مار ڈالوں خواہ اپنی جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں' لیکن یہ سب کچھ جذبات کی حد تک ہی صحیح دکھائی دیتا

تھا۔

چیخنا چلانا میرے منصب کو زیب نہیں دیتا تھا' لیکن مجھے خود کو ایک گھٹیا درجے کا جرائم پیشہ شخص ثابت کرنے کے لئے یہ سب کچھ کرنا بہرحال ضروری تھا۔ یہ میرے صبر کے امتحان کا بہترین وقت تھا اور مجھے خود ہی اپنا ممتحن بننا تھا۔ میری آزمائش کی گھڑی آگئی تھی اور اب یہ میری اداکارانہ صلاحیتوں پر ہی منحصر تھا کہ میں ان لوگوں کو اپنے متعلق مزید سوچنے کا موقع دوں یا وہ مجھے معمولی سا جرائم پیشہ شخص ہی جانیں۔

کرب و اذیت کے ایک لامتناہی سلسلے سے گزار کر بالآخر وہ موذی مجھے اپنے کمانڈنگ افسر کے پاس لے آئے۔ اس دوران میں پل بھر کے لئے بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہا تھا اور "ہائے ہائے" کا ورد کرنے کے ساتھ ساتھ میری نظریں مسلسل وہاں موجود اسلحہ جات پر لگی ہوئی تھیں۔ تمام جزئیات میرے ذہن میں نقش ہوتی جارہی تھیں۔۔۔۔

ابھی رات کے بمشکل بارہ بجے تھے۔ خیریت گزری کہ کمانڈنگ افسر کو سوتے سے نہیں جگانا پڑا ورنہ وہ بھی اپنی نیند میں خلل پڑنے کا غصہ مجھ ہی پر نکالتا۔ میرے بازو کھول دیئے گئے تھے۔

"کون ہے یہ؟" اس نے کڑکدار آواز میں میری بجائے ان موذیوں سے پوچھا جو مجھے یہاں تک گھسیٹتے ہوئے لائے تھے۔ خیریت یہ گزری کہ وہ پنجابی تھا ورنہ اس سوال کی نوبت کافی دیر بعد آتی۔

بجائے میرے صیادوں کے اس کا جواب میں نے دیا اور اپنی تمام تر اداکارانہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے' گڑگڑا کر اس کے پاؤں پکڑ لئے: "مہاراج جی دیا کرو' مہاراج جی دیا کرو۔" میں نے اس کے پاؤں سے لپٹتے ہوئے گھگھیانا شروع کر دیا۔

"سر! یہ کھیتوں میں گھوم رہا تھا۔" ایک حوالدار بولا۔

اس کے ساتھ ہی مجھ سے برآمد شدہ شراب کا بلیڈر انہوں نے سامنے رکھ دیا۔

"لوہ شٹ اپ۔ یہ تمہارا کام ہے یا پولیس کا۔" اس نے انہیں انگریزی میں ڈانٹ پلانے کے علاوہ دو تین مہذب گالیوں سے بھی نواز دیا۔

"اٹھو' اٹھو! کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے مجھے ٹھوکر مارے بغیر حکم دیا۔

میں ڈرتا ڈرتا کھڑا ہوا۔

چند لمحوں تک وہ مجھے گھورتا رہا۔ شاید وہ میری Face Reading کر رہا تھا مگر اسے یہاں سوائے خوف' گھبراہٹ اور بزدلی کے اور کیا مل سکتا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔" اس نے مجھے نارمل لہجے میں پوچھا۔

"جی صاحب' مہاراج جی۔" میں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"کیا کام کرتے ہو؟" اس نے میری رہائش اور گھربار کے متعلق پوچھنے کے بعد کہا۔

"مائی باپ چھوٹا موٹا دھندا کر لیتے ہیں۔" میں نے بدستور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ایک بھرپور نظر اس نے پھر مجھ پر ڈالی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اس نے اسی حوالدار کو حکم دیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت پولیس کو سونپ آئے۔ میری جیب سے نکلنے والے پیسے اس نے مجھے لوٹانے کا حکم دیا تھا اور بلیڈر بھی پولیس کے حوالے کرنے کو کہا گیا۔ میں نے بہتیرے ہاتھ جوڑے' التجائیں کیں کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے لیکن اس نے میری کسی بات پر کان نہ دھرے اور حوالدار کو مجھے لیجانے کا حکم دیا۔ حوالدار آہستگی سے میرا بازو پکڑ کر باہر لے آیا۔

ایک بلا تو ٹل گئی تھی اب دوسری مصیبت کا سامنا تھا۔۔۔۔ میں نے سکھ کا سانس لیا' مجھے یہ تو اطمینان ہو چکا تھا کہ اب پولیس مجھے جاسوس نہیں سمجھے گی' کیونکہ میں آرمی تفتیش بھگت کر ان کے پاس آ رہا تھا۔ "یہاں تو جھوٹ بولنے سے جان بچ گئی تھی پولیس کو اپنی شناخت کیسے کرواؤں گا؟ باؤ جی کا ایڈریس تو بتانے سے رہا۔" یہ تھے وہ خیالات جو رہ رہ کر مجھے پریشان کر رہے تھے پھر دوسری بات یہ بھی تھی کہ پولیس کے چکر میں پڑ کر پندرہ بیس دن اور ضائع ہو جاتے' جب کہ یہ اطلاعات جو میں نے حاصل کی تھیں اتنی اہم نوعیت کی تھیں کہ ان کا فوراً محفوظ ہاتھوں میں پہنچنا ضروری تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرا جسم بھاگنے کے قابل رہ ہی نہیں گیا تھا لیکن بھاگنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔۔۔۔ اگر پولیس کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ میں ڈاج کر رہا ہوں تو وہ میری اصلیت تک پہنچ سکتے تھے' پھر یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ بھارتی پولیس ہر نئے ملزم کا استقبال کپڑے اتار کر کرتی ہے اور یہ صورت میری شناخت کرنے میں کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہنے دیتی۔۔۔۔

ooo

تھوڑی دیر بعد حوالدار ایک ڈرائیور کے ساتھ مجھے جیپ میں تھانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہاں سے نزدیکی تھانہ سری ہرگوبندپور کا ہی ہو سکتا تھا جو کم از کم پندرہ بیس کلومیٹر دور تھا اور رات کے پچھلے پہر اس لہلہاتی فصلوں سے بھرپور علاقے میں بھاگنے کے کئی مواقع میسر آ سکتے تھے۔ حوالدار کو شاید میری بزدلی کا یقین ہو چکا تھا' کیونکہ اس مرتبہ اس نے میرے ہاتھ نہیں باندھے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ اس نے مجھے اس قابل جانا ہی نہیں تھا' کیونکہ

جب سے گرفتار ہوا تھا میں مسلسل "ہائے ہائے" اور "شاکرو مہاراج جی" کی گردان سنا رہا تھا۔ میری جیب میں قریباً ڈھائی سو روپے کیش موجود تھا جو اس نے مجھے واپس لوٹا دیا تھا۔

ڈرائیور تو غیر مسلح تھا لیکن حوالدار کے پاس ضرور آٹومیٹک رائفل تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ لوڈ نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے' وہ کسی جاسوس یا فوجی بھگوڑے کو نہیں ایک تھرڈ کلاس مجرم کو پولیس کے حوالے کرنے لے جا رہا تھا۔

جیپ ابھی کیمپ سے تھوڑے فاصلے پر ہی پہنچی تھی کہ ایک ترکیب سوجھی۔ حوالدار اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جیپ پر چھت نہیں تھی اور میدان جنگ میں استعمال ہونے والی جیپوں کی طرح یہ چاروں طرف سے کھلی تھی۔ حوالدار نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتا کبھی کبھی مڑ کر دیکھ لیتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ جاتا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو سو روپے نکال لئے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"مہاراج جی اگر آپ نے ضرور ہی مجھے پولیس کے حوالے کرنا ہے' تو یہ رکھ لیجئے۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میری رقم سینا کے کام آئی ہے۔ پولیس تو فوراً میرے پیسے چھین لے گی۔" یہ فقرہ میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں بولا تھا تاکہ ڈرائیور بھی سن لے۔ اس نے جیپ چلاتے چلاتے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ حوالدار شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

"رشوت دیتا ہے سالے۔" اس نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"مہاراج جی رشوت دو سو روپے کی تو ہوتی نہیں۔" میں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

دو چار فقروں کے تبادلے کے بعد حوالدار بالکل ہی پگھل گیا۔

"بھائی' ہماری تمہاری کوئی دشمنی تو ہے نہیں۔ میں تو تمہیں چھوڑ دیتا لیکن اب تو بات افسروں کے علم میں آ چکی ہے۔"

"کوئی بات نہیں مہاراج جی' کبھی ہمارے ڈیرے پر آیئے' آپ کی اور سیوا بھی کریں گے۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

ڈرائیور اس اثناء میں مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھتا رہا تھا۔ "رکھ لیجئے حوالدار صاحب بے چارے کا من خوش ہو جائے گا۔" اس نے حوالدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور اس نے ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوسرا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

پہلا مرحلہ تو بخیر و خوبی طے پا گیا اب شراب کی باری تھی۔ میں نے ان سے صرف دو گھونٹ پینے کی درخواست کی تھی جو انہوں نے مان لی۔ لیکن جب بلیڈر کا منہ کھلا اور اس کی سک نتھنوں میں گھسی تو ان کے منہ میں بھی پانی آ گیا۔ وہاں کوئی برتن تو تھا نہیں۔ میری منت

سماجت پر پہلے حوالدار نے دو تین لمبے لمبے گھونٹ بھر لئے' پھر ڈرائیور نے۔ اپنی باری آنے سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر بلیڈر حوالدار کی طرف بڑھا دیا اور دوبارہ دونوں نے یہی عمل دہرایا۔ جب میں نے اندازہ لگا لیا کہ کام ہو چلا ہے تو بلیڈر خود تھام لیا اور منہ دوسری طرف کر کے نیچے جھکتے ہوئے کچھ شراب بہا کر باقی بلیڈر پھر انہیں تھما دیا۔

سانسیوں کے گھر کی نکلی پہلے توڑ کی شراب نے چند منٹ کے اندر ہی ان کے دماغ گرم کر دیئے۔ رہی سہی کسر ہوا نے پوری کر دی اور دونوں اب باقاعدہ نشے میں جھومنے لگے تھے۔ ڈرائیور نے تو اونچی آواز سے گانا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔ ابھی تک ہم کھیتوں کے سلسلے میں ہی سفر کر رہے تھے اور اس سڑک تک نہیں پہنچے تھے جو سری ہرگوبند پور کو جاتی ہے۔

دوسرا مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے پا گیا۔ پھر میں نے ایک خاصے لمبے کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک پہنچ کر ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے کو کہا۔

"مہاراج جی ذرا پیشاب کروں گا۔" میں نے شرابیوں کے سے لہجے میں بات کی۔

"میں بھی کروں گا۔" ڈرائیور کو مکمل چڑھ گئی تھی۔ وہ میرا انتظار کئے بغیر جھومتا ہوا نیچے اتر گیا۔ حوالدار جس نے اس اثناء میں قریباً دس بارہ بیڑیاں پھونک ڈالی تھیں' لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔

"ابے بھاگ نہ جانا۔"

"کیا بات کرتے ہو حوالدار جی۔ اب تو یہ اپن کا یار ہے اور بھاگے تو گولی مار دینا سالے کو۔" میری بجائے ڈرائیور نے نشے سے لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا اور میرا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ پھر ہم دونوں بدمست شرابیوں کی طرح جھومتے گاتے قریبی کھیت میں جا گھسے۔ حوالدار نے موقع غنیمت جان کر بچھے کچھے بلیڈر سے منہ لگا لیا۔۔۔۔ اسے کچھ زیادہ ہی مزا آنے لگا تھا۔

ooo

کھیت کے ایک کونے پر تو ڈرائیور بیٹھ گیا اور دوسرے سرے سے میں اندر جا گھسا۔ پھر اندر ہی اندر بلی کی طرح پنجوں کے بل چلتے چلتے میں کھیت کے دوسری طرف جا نکلا اور اس کے بعد تو جیسے مجھے پر لگ گئے۔۔۔۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ میں نے قریباً تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا۔ نجانے اس وقت اتنی طاقت مجھ میں کہاں سے عود کر آئی تھی کہ یا تو یہ حال تھا کہ درد اور تھکاوٹ نے مجھے بڑھال کر رکھا تھا یا اب یہ عالم تھا کہ اپنی جسمانی تکالیف سے بے نیاز ہو کر میں پوری طرح مائل بہ پرواز تھا۔۔۔۔ اس اثناء میں البتہ میں نے اس بات کا ضرور خیال رکھا کہ میری سمت درست رہے۔ میں کھیتوں کے اندر ہی اندر کس طرف جا رہا ہوں' اس کا مجھے علم

نہیں تھا۔

اپنے کندھے پر رکھی چادر کو میں نے مضبوطی سے کس کر دہاتیوں کی طرح باندھ لیا تھا۔ غنیمت یہ گزری کہ راستے میں کسی سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ دیہاتوں سے بچ کر سفر کروں کیونکہ کسی دیہات کے نزدیک قافلہ آنے کی صورت میں مجھے چور سمجھا جاتا اور ان دیہاتوں کی روایت تھی کہ وہ چور کی ٹانگ یا بازو توڑنے کے بعد پولیس کے حوالے کرتے تھے' اس سے پہلے نہیں۔

ذرا سکون میسر ہوا تو زخم ہرے ہونے لگے۔ چپے کرب نے سر اٹھایا اور میں ٹوٹنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ماہر لوہار نے میرے جسم پر ہتھوڑے برسائے ہوں۔ خصوصاً" پسلیوں کی تکلیف تو بے حال کئے دیتی تھی۔ زخموں سے ٹیسیں اٹھتیں تو یوں لگتا جیسے اب جان گئی کہ گئی۔ بہرحال میں نے ضبط کا دامن تھامے رکھا اور بغیر رکے اپنا سفر بھی جاری رکھا۔ راستے میں آنے والے ایک ٹیوب ویل پر کسی نے بگڑی سکھانے کے لئے ڈال رکھی تھی' اسے میں نے گلے میں ڈال لیا اور طلوع سحر کے قریب سر پر باندھ لیا۔ اب میں مکمل سکھ نظر آ رہا تھا کیونکہ پچھلے آٹھ دس دن سے میں نے داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔

خدا کا شکر یہ ہوا کہ میرے چہرے پر ماریپیٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ جسم کے گرد میں نے چادر لپیٹ رکھی تھی' اس کے علاوہ بھی قمیص پر پہنی جرسی نے میلے کپڑوں کو کسی حد تک چھپا لیا تھا۔ ایک کنویں سے میں نے منہ ہاتھ دھوئے۔ اپنے کپڑوں پر تنقیدی نظر دوڑائی اور اطمینان کر لینے کے بعد نزدیکی گاؤں کے گردوارے کی سمت چل دیا جہاں سے گرنتھی کے پاٹھ کی آواز آنے لگی تھی۔

گردوارے میں حسب توفیق بہت سی متجسسانہ نظروں نے میرا خیر مقدم کیا۔ کڑھا پرشاد "چھکنے" ہوئے ایک دو سرداروں نے میرا جغرافیہ بھی پوچھا جو میں نے انہیں مطمئن کرنے کی حد تک بتا دیا۔ زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور گردوارے کے لنگر سے چائے پی کر چل دیا۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ کون سا گاؤں ہے نہ ہی ڈر کے مارے ابھی تک کسی سے گاؤں کا نام پوچھا تھا۔ بجائے عام راستوں کے میں نے پگڈنڈیوں پر سفر کرنا مناسب جانا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کھیتوں کے اتفاقی سلسلے میں گم ہو کر بالآخر میں دوپہر کے وقت ایک سڑک پر جا پہنچا۔ اپنے صبر و ضبط کا میں نے خوب خوب امتحان لیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک کونے میں ایک سائیکلیں ٹھیک کرنے والے اور بلی نے مل کر ایک درخت کے نیچے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ موقعہ

مناسب جان کر میں نے یہاں داڑھی سے نجات حاصل کی کیونکہ اس حلیے میں گھر جا کر میں خواہ مخواہ ان لوگوں کو شک میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ بلی کو تشویش کا موقعہ دیئے بغیر میں اس کے ہاتھ پر روپے کا نوٹ رکھ کر آگے روانہ ہو گیا۔

سڑک پر لگے ایک سنگ میل سے مجھے علم ہوا کہ یہ سڑک بٹالے کو جاتی تھی۔ تقریباً" ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر میں ایک جگہ بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ پگڑی کو اب پٹکے کی شکل میں میں نے گلے میں لٹکا لیا تھا اور باری الذکر میں' میں کوئی براہمن زمیندار دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً" پندرہ منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد ایک لاری کی شکل دکھائی دی جو مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دیا' لاری قریب آ کر رک گئی۔ میں نے بٹالہ کا ٹکٹ لیا اور کونے والی ایک سیٹ پر ٹک گیا۔ ذرا سکون میسر آیا تو کئی سوئے ہوئے فتنے جاگ اٹھے۔ زخموں کی تکلیف تو تھی ہی اب بھوک پیاس بھی جان کو آ گئے۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ لاکھ ضبط کے باوجود پلکیں خود بخود جھکی جاتی تھیں۔ اپنی تھکن جسمانی کمزوریوں پر قابو پانے کے لئے مجھے خود سے لڑائی لڑنا پڑی اور ذہن و جسم کی اس کشمکش میں بٹالہ بس سٹینڈ قریب آ گیا۔

بس کے رکتے ہی میں نے قریبی میڈیکل سٹور کا رخ کیا اور اسپرین کی گولیاں خرید کر نزدیکی ہوٹل میں جا گھسا۔ جب چائے کے ساتھ گولیاں اور بند زہر مار کیا تو کسی حد تک میرے اوسان بحال ہوئے۔ اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو چھٹی حس بھی جاگ اٹھی اور میری پھسلتی ہوئے نگاہیں بالآخر اس "ہدایت شریف" پر مرتکز ہو گئیں جو ٹنگی باندھے جانے کب سے مجھ پر نظریں جمائے قریبی میز پر براجمان تھا۔

شاید بس میں ہی اس نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اب کسی "کارنامے" کی امید لئے میرے پیچھے پیچھے یہاں چلا آیا تھا۔ اس کی تشکک نظریں ہی اس کی پہچان کے لئے کافی تھیں۔ ذرا دم کو جسمانی اور ذہنی قوت سے نجات ملی تھی کہ اب نئی الجھن آن پڑی۔

ooo

بات یہ نہیں تھی کہ میری گرفتاری کا خطرہ تھا کیونکہ پوچھ گچھ پر میں کسی کو بھی اپنے نام اور ایڈریس سے مطمئن کر سکتا تھا لیکن ایمرجنسی ہونے کی وجہ سے اور خصوصاً" ایسے سرحدی اضلاع میں اس کے بعد جو حوالات کا لمبا سلسلہ شروع ہوتا تھا "شاہ" یہاں کس کے پاس آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کوئی مقامی شناخت؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ بہرحال فوج کو دھوکہ دے کر بھاگا تھا اور دشمن کو کمزور جاننا میرے پیشے کے اصولوں کی نفی کرنے کے مترادف تھا۔

میں ایسے حالات ہی کیوں پیدا ہونے دوں کہ کوئی میرے متعلق چہ میگوئیاں کرتا پھرے؟ یہ تھی اصل میں وہ سوچ جس نے مجھے یہاں سے بھاگنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں ہوٹل سے پانچ دس منٹ کے بعد ہی باہر چلا آیا۔

اب مزید دردِ سر مول لینے کے لئے میں تیار نہیں تھا۔ فوراً" پٹھانکوٹ والی بس کا ٹکٹ خرید کر میں اس میں سوار ہو گیا کیونکہ پٹھانکوٹ سے مجھے ذرا زاد راہ مل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے معلومات بھی جلد از جلد حاصل کرنا تھیں ـــــ اس مرتبہ مجھے اگلے دروازے کے قریب ہی جگہ ملی تھی۔

جیسے ہی بس حرکت ہوئی اور میرے منہ سے سستے بھون والی مالی دی۔ کے الفاظ ہی بمشکل نکل پائے تھے جب وہی منحوس صورت ڈرائیور کے سر پر لگے شیشے میں ابھری۔ شاید بے چارہ مایوس ہو کر گورداسپور لائن واپس جا رہا تھا۔ اس اچانک صورت حال سے خواہ مخواہ میری ہنسی نکل گئی۔ شاید اس نے بھی مجھے بس میں دیکھ لیا تھا کیونکہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات جو اس کے چہرے پر اچانک ملاقات سے ابھرے تھے' ان کی ایک جھلک تو میں نے بھی دیکھ لی تھی۔

مجھے فوری فیصلہ کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اب میرے پاس پیسے بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے اور پٹھانکوٹ جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا کیونکہ اب تو اس کا میرے متعلق شک یقین میں بدل چکا ہو گا۔ مجھے نہ صرف اس سے پیچھا چھڑوانا تھا بلکہ پیسے بھی حاصل کرنے تھے۔ بخار کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی تھی اور لدھیانہ پہنچنے سے پہلے میں بیمار ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کنڈیکٹر والی سیٹ کھول کر وہ اس پر بیٹھ گیا۔ بس اوور لوڈ تھی۔ اس کے اور میرے درمیان آٹھ دس سواریاں کھڑی تھیں۔

جیسے ہی بس اڈے سے نکل کر سامنے والی ٹریفک سے بھری پری سڑک پر پہنچی' میں چلایا۔

"اوہ میرا بیگ رہ گیا۔" اور اپنے آگے کھڑی سواریوں میں سے تیزی سے جگہ بناتا دروازے تک جا پہنچا۔ بس ٹریفک میں انتہائی کم رفتار سے چل رہی تھی' میں پھرتی سے نیچے اتر گیا لیکن خالی ہاتھ نہیں۔

دروازے پر لٹکے ہوئے ایک اپ ٹو ڈیٹ سردار کی پتلون کی پچھلی جیب سے ایک بٹوا بھی ساتھ لیتا گیا تھا ـــــ!

جیسے ہی میں نیچے اترا' اڈے کی طرف جانے والے ایک خالی سائیکل رکشہ کو پکڑنے کے لئے مجھے خاصی دوڑ لگانی پڑی۔ میں اچھل کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

"یار ذرا جلدی اڈے تک چلنا' میرا بیگ رہ گیا ہے۔" میں نے سائیکل رکشہ کے ڈرائیور کو کچھ پوچھنے کا موقع دیئے بغیر بڑی پریشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میرے چہرے پر اڑنے والی ہوائیاں اور تیز رفتاری سے بھاگ کر رکشہ میں بیٹھنے کی وجہ سے رکشہ ڈرائیور کو بھی میری حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں زیادہ تیزی سے چلانا شروع کر دیں ـــــ صرف ایک دفعہ گردن موڑ کر میں نے دیکھا۔ بس رکی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ گدھا منہ اٹھائے چاروں طرف دیکھ رہا ہو گا۔

اس مرتبہ مجھے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ میرا اعتماد بڑھ گیا لیکن حد سے زیادہ نہیں۔ "خدا کی مدد کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں اور اس کی مدد کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان انتہائی کوشش نہ کر گزرے۔" میرے ایک شفیق استاد کا دہرایا یہ فقرہ میرے لاشعور میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکا تھا۔

اڈے کے باہر ہی اس کے ہاتھ پر دو روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے میں اسے سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیئے بغیر نیچے اتر گیا ـــــ اس دفعہ میں اڈے میں داخل نہیں ہوا بلکہ اڈے سے باہر ہی امرتسر کی طرف جانے والی ایک بس میں سوار ہو گیا۔ ایک مکھوں والی کنگھی' نیم برہنہ بدن والی ایک لڑکی کی تصویر اور پچاس روپے۔ یہ تھا وہ اثاثہ جو اس اپ ٹو ڈیٹ سکھ نوجوان کے بٹوے سے برآمد ہوا تھا۔ بٹوے سے میں نے سائیکل رکشہ میں ہی نجات حاصل کر لی تھی اور کنگھی اور تصویر کو جوں کا توں اسی میں رہنے دیا تھا۔

مسلسل بھاگ دوڑ' ذہنی پریشانی اور رات والی مار نے مجھے جسمانی طور پر بری طرح تھکا ڈالا تھا لیکن میری قوت ارادی اور اپنے مشن کی صداقت پر یقین نے عزم و عمل کا ایک ایسا حصار میرے گرد تان دیا تھا جس سے اندر گھسنا کسی بھی ذہنی یا جسمانی کمزوری کے لئے ناممکن تھا۔

ٹھنڈی چھایا

سہ پہر کے وقت میں امرتسر میں موجود تھا ـــــ سب سے پہلے میں نے اپنی اطلاعات منقل کیں' پھر ایک ہوٹل میں کھانا کھا کر لدھیانہ کے لئے بجائے کسی بس کے گاڑی میں سوار ہو گیا جہاں ایک قلی کی مہربانی سے مجھے تھرڈ کلاس کا ایک برتھ لوگھنے کے لئے مل گیا۔

ـــــ رات کے قریباً" گیارہ بجے جب میں لدھیانہ پہنچا تو بخار سے میرا جسم پھک رہا تھا۔ درد کے مارے انگ انگ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا! کیونکہ جیسے ہی گاڑی میں دوران سفر میں نے ذرا سی کمزوری دکھائی' بخار نے آن دبوچا۔ اب ہر طرح کا خطرہ قریباً" ٹل چکا تھا۔

ایک رکشہ کے ذریعے میں گرتا پڑتا پرکاش کے پاس پہنچا۔ اسے نیند سے بیدار کیا اور بے جان سا ہو کر اسی کے بستر پر گر گیا۔ قریباً" نیم بے ہوشی کے عالم میں مَیں نے اسے یہ قصہ سنایا تھا کہ "دوران سفر رات کے وقت ہماری بس کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا کیونکہ میں نے کچھ "بہادری" کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا۔ اس لئے مار مار کر انہوں نے میرا بھرکس نکال دیا۔

لمبے روٹ پر چلنے والی بسوں کا لٹ جانا کوئی اچنبھے والی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے واقعات اخبارات میں پڑھنے کو اکثر مل جاتے تھے اور ان دنوں تو گورداسپور کے گردونواح میں "شریمان" ڈاکو کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آئے روز وہ کسی نہ کسی بس کی سواریوں کو اپنا نشانہ بنائے رکھتا تھا۔ اس کی خنڈہ گردی کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہاتھوں لٹنے کے بعد لوگ اس کے خلاف پولیس میں رپٹ لکھوانے سے بھی ڈرتے تھے۔

ظاہر ہے میں بھی اسی کا شکار بنا ہوں گا ـــــ!

میں ساری زندگی بھی چاہوں تو پرکاش کا اس رات کا قرض نہیں چکا پاؤں گا۔ رات کو بارہ بجے کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر لینا اسی کا کام تھا۔ نجانے آدھی رات کے وقت وہ کسی میڈیکل سٹور والے کو جگا کر دوائیاں لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے دو تین انجکشن لگا دیئے۔ جن کی وجہ سے میں چوٹوں کے زہریلے اثرات سے بچ گیا۔ میری آنکھ تو رات کے آخری پہر لگ گئی تھی لیکن پرکاش نے ساری رات آنکھ نہیں جھپکی۔ میں اُسے سونے کی درخواست کرتا رہا لیکن

میرے ضد کرنے کے باوجود وہ ساری رات ایک کرسی میرے سرہانے بچھا کر میری تیمارداری میں مصروف رہا۔

صبح میں جب نیند سے بیدار ہوا تو خاصا افاقہ محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کی دوائی کھانے سے بے تحاشہ پسینہ آگیا تھا جس سے بدن کافی ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جسم پر مختلف جگہ البتہ تشدد کے نشانات نیلے پڑ گئے تھے۔ خیریت یہ گزری کہ سوجن نہیں آئی تھی ورنہ بیماری کا وقفہ خاصا طویل ہو سکتا تھا۔ مجھے افاقہ ہوتے دیکھ کر پرکاش کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم ناشتے سے فارغ ہو گئے' وہ نیچے کارخانے میں چلا گیا جب کہ میں اوپر والی منزل کے واحد رہائشی کمرے کے باہر دھوپ میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر گزرے واقعات کا تجزیہ کرنے لگا۔

اور پھر گزشتہ چند روز کے اخبارات میرے ہاتھ میں آگئے۔

میجر بھاسکر کے قتل نے "را" کے ہیوانوں میں زلزلہ بپا کر دیا تھا۔ بھارتی سیکورٹی نظام سے متعلق قریباً" ساری ایجنسیاں جو خصوصاً" پنجاب میں کام کر رہی تھیں' انہیں یقیناً اپنے غیر محفوظ اور بودے پن کا احساس ہونے لگا ہو گا کیونکہ سرحدوں کے اتنے اندر آکر ایک اہم آفیسر کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔

عام اطلاعات کے مطابق بھارتی سیکورٹی افسران یہ بات تو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ یہ کسی غیر ملکی جاسوس یا کمانڈو کا کارنامہ ہے۔ ان کے خیال میں یہ تو ممکن تھا کہ پلانگ پاکستانی انٹیلی جنس نے تیار کی ہو لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے مقامی "ہمدردوں" کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اب ان ہمدردوں کا سراغ لگانا ہی انہوں نے اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا تھا اور اس سلسلے میں پنجاب بھر میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کو بروئے کار لاتے ہوئے مشرقی پنجاب کی پولیس نے قریباً" سارے ہی نامور سمگلروں کو نظربند کر دیا تھا۔ سرحدوں پر "بی-ایس-ایف" (بارڈر سیکورٹی فورسز) کی گشت بڑھ گئی تھی اور کیمپی ہیڈ کوارٹروں سے محفوظ دستے کافی تعداد میں سرحدوں پر پھیلا دیئے گئے تھے۔ "ہوم گارڈز" جو سرحدی دیہات کے تربیت یافتہ نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ اسے بھی جدید اسلحہ سے لیس کر دیا گیا تھا۔ سرشام ہی یہ لوگ اپنی مقرر کردہ ڈیوٹیوں پر پہنچ جاتے۔ ہوم گارڈز زیادہ تر اپنے اپنے دیہاتوں کے اردگرد ہی گشت لگایا کرتے تھے۔ مقامی باشندے ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے دیہاتوں کو سرحد کی طرف سے آنے والے خفیہ راستوں کا علم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کم از کم ان کے دیہات کی حد تک سرحدوں کے آر پار آنے جانے والوں کی محفوظ پناہ گاہیں کونسی ہو سکتی ہیں۔

ان اقدامات کے نتیجے میں اور تو کیا فائدہ پہنچا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سرحدوں کے آر پار

مویشیوں کی چوری اور سمگلنگ کی وارداتوں میں خاصی کمی واقع ہو گئی۔ سوائے ان لوگوں کے جو سرحدی محافظوں سے ساز باز کر کے ان کی خدمت میں شروع سے خطیر نذرانہ پیش کرتے آ رہے تھے اور کسی کو سرحدوں کے نزدیک پھٹکنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ دشمن کے بنے ہوئے جال میں نقب لگانے کی بجائے ہم نے اسے یہیں مصروف رکھا اور اپنے "لانچنگ پیڈ" تبدیل کر لئے۔ دشمن تلملا کر رہ گیا۔

میجر بھاسکر کے قتل کے بعد سے میں نے مہاراج یا کلب کے نزدیک پھٹکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ابھی تک اس سلسلے میں باجو جی کی طرف سے کسی کا متوجہ نہ ہونا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ سوامی جی نے مجھے آشرم میں واقعی نہیں پہچانا تھا یا اگر انہوں نے مجھے پہچان بھی لیا تھا تو ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا ہو گا۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔ "کیوں نہ بھارتی انٹیلی جنس کو اس شک میں مبتلا کر دیا جائے کہ میجر بھاسکر کے قتل میں سوامی دیانند کا ہاتھ بھی تو ہو سکتا ہے؟" ایک مسکراہٹ خود بخود میرے ہونٹوں پر پھسلتی چلی گئی۔ اس طرح وہ شیطان ہمارے خلاف بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس سکتا تھا اور ایک مرتبہ مشتبہ ہونے کے بعد کم از کم یہ ضرور ہوتا کہ بھارتی انٹیلی جنس کے سوامی کے ساتھ "دوستانہ" مراسم ختم ہو جاتے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک خاصے بڑے "حساس علاقے" میں ہمیں کھل کر کام کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا کیونکہ جاسوس بہرحال انسان ہوتا ہے۔ حکومتی اداروں کے بچھائے ہوئے خطرات سے بچ نکلنا تو اس کے لئے ممکن ہو سکتا ہے لیکن اتنی معصومیت اور مکاری سے پھیلائے "پھندے" سے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

اپنے ان دوستوں کے ذریعے جن کی رسائی متعلقہ افسران تک ممکن ہو سکتی تھی میں نے تفتیش پر مامور افسران کے کان میں یہ بات پہنچانے کے طریق کار پر غور کرنا شروع کیا اور میرا ذہن کڑی سے کڑی ملاتا بالآخر زنجیر کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔

بے چارہ سوامی——!

ooo

ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے قریب دھرا اخبار دوبارہ اٹھا لیا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ابھی اخبار آنکھوں سے لگایا ہی تھا' جب اوپر والی سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے یہی سمجھا کہ پرکاش ہو گا کیونکہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میری خیریت دریافت کرنے اوپر آجاتا تھا بلکہ کارخانے کے باقی ملازمین بھی جلوس کی شکل میں کچھ دیر پہلے مجھے "شبھ

کامنائیں ارپن" کر چکے تھے' لیکن یہ کیا!! ایک سے زیادہ قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چور کی داڑھی میں تنکے کے مصداق میں چوکنا ہو گیا لیکن آنے والوں کی شکلوں پر نظر پڑتے ہی سکھ کا ایک لمبا سانس میرے منہ سے خارج ہوا۔ آگے پرکاش تھا اور اس کے پیچھے پونم اور سدرشنا۔ دونوں شاید کالج سے آ رہی تھیں۔

سفید ساڑھی پر پونم نے سرخ سویٹر پہن رکھا تھا۔ ناگن زلفیں بل کھا کر شانوں پر پھیلتی چلی گئی تھیں۔ وہ روایتی ہندو صلاؤں کی طرح جوڑا کم ہی باندھا کرتی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کے گالوں کا رنگ تپ کر گلابی ہو رہا تھا۔ اس کی پلکوں کے اجالے گندمی آنکھوں کی جوت جگا رہے تھے۔ وہ اسپرا جس نے ہمالیہ کے دامن میں بیٹھے تیاگی کی صد سالہ تپسیا کو ایک ہی جھٹکے دکھا کر غارت کر دیا تھا' شاید دوسرا جنم لے کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پروقار چال میں قرنوں پرانی کسی حسن کی ملکہ کا وقار سمٹ آیا تھا' وہ پاربتی تھی' جو آکاش سے دھرتی پر گھٹ ہو کر اپنے پریم پجاری کو اپنے درشن دینے آن براجی تھی۔ میرا روں روں مسرت سے بلبلا اٹھا۔ اسے دیکھتے ہی میری شریانوں میں انبساط کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اک وجدانی کیفیت' اک ان دیکھا نشہ مجھ پر طاری ہو گیا۔ میں نے اپنا دامن دل وا کیا اور وہ میری دھڑکنوں پر چلتی چلی آئی۔

"کیا ہو گیا؟" اس نے پریشانی سے کہا۔

"دیر جی؟" سُدرشنا کے لہجے میں چھپی محبت کا ایک اپنا تقدس تھا۔

"کچھ نہیں' بس یونہی۔" میں نے دونوں کو مختصر جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پرکاش کو پونم کی مجھ سے محبت کی گہرائی کا کسی حد تک ضرور احساس تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پونم کو مطمئن کرنے کے بعد میرے پاس لایا ہو گا۔ پھر بھی ہم دونوں ہی کچھ پریشان سے ہو گئے۔

"ذرا معاد یر بننے لگے تھے بھائی صاحب۔" اس نے مذاق میں پونم اور سدرشنا کا استفسار ٹالنا چاہا۔

"اصل میں بات یہ ہے بھئی کہ فلمیں دیکھ کر اپن پر بھی ہیرو کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔" میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور ایک مرتبہ پھر انہیں مطمئن کرنے کے لئے وہی کہانی دہرا دی۔

"زیادہ چوٹیں تو نہیں لگیں۔" دونوں نے ایک سوال مختلف کیفیتوں کے ساتھ بیقراری سے پوچھا۔

"اگر ایسا ہوتا تو آپ کو درشن دینے کے لئے یہاں نہیں ہسپتال آنا پڑتا۔" میں نے فضا کو حتی المقدور سنجیدہ بنانے سے گریز کیا۔

"بھگوان نہ کرے۔"

"پرماتما نہ کرے۔" بے ساختہ دونوں کے منہ سے باری باری نکلا۔

میں نے قریباً سارے جسم پر کمبل لوڑھ رکھا تھا۔ چہرہ چونکہ ڈاکٹر کی مہربانی سے سوجن سے محفوظ رہا تھا اس لئے دونوں کو صورت حال کی سنگینی کا احساس نہ ہو سکا لیکن جتنی دیر وہاں سدرشنا اور پرکاش بیٹھے رہے' پونم کو ایک پل قرار نہ آیا۔

اصل میں وہ دونوں ہمیں اپنے کالج کے میلہ بازار میں لے جانے کے لئے آئی تھیں۔ میں نے تو تینوں کو بھیجنا چاہا لیکن سدرشنا اور پرکاش بھی بادل نخواستہ میرے ضد کرنے پر گئے تھے جب کہ پونم وہیں رہ گئی تھی۔

"ایک بات پوچھوں پرکاش بابو؟" پونم نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔

"ہوں۔" میں نے حسب معمول کہا۔

"آپ یہ لالبلی زندگی آخر کیوں گزارتے ہیں۔ جو کام پرکاش بھیا کرتے ہیں' وہ آپ کیوں نہیں کرتے؟ انہیں باہر شہروں میں جانے دیا کیجئے نا۔ آپ یہاں کے معاملات سنبھال لیجئے۔ بابو جی بھی آپ کی بات مانتے ہیں اور کسی کی تو سنتے نہیں۔ ان کے قریب رہنے سے ممکن ہے وہی اب سیاست سے باز آ جائیں ورنہ تو حکومت اب خاصی سختی کرنے لگی ہے۔ آپ کم از کم میرا نہیں تو ماتا جی کا ہی خیال کیجئے۔" اس نے قریباً روہانسی آواز میں کہا۔

"اگر تمہیں اس واقعے نے زیادہ متاثر کر دیا ہے تو میں بھاگ کر دکھا سکتا ہوں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ معمولی سا حادثہ تھا بس مجھ سے برداشت نہ ہوا کہ کوئی مجھے کمزور جان کر میرے پیسے چھین لے۔ پھر یوں بزدلوں کی طرح زندگی گزارنا مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔" میں نے اپنی جذباتی کیفیت دبانے کے لئے لفظوں کی آڑ لینا چاہی لیکن بے سود۔۔۔۔ اس کے لہجے میں سمٹی اپنائیت نے مجھے پگھلا دیا۔

پونم نے اس مرتبہ پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ انمول موتی یوں لٹا دیئے جائیں۔ شاید لاشعوری طور پر میری خواہش یہ رہی تھی کہ پونم اس وقت تک انہیں محفوظ رکھے جب یہ سوتے فشک پڑ جائیں گے۔ وہ رونا چاہے گی اور رو نہ پائے گی۔ وہ میری چارپائی پر بیٹھی تھی' میں بے اختیار ہو کر اٹھا۔ اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے اسے مخاطب کیا لیکن میری اس حرکت کا ردعمل شدید تھا۔ پونم نے آنسوؤں سے بھیگی لاچار سی مسکراہٹ سے میری سمت دیکھا اور مجھ میں سما گئی۔ آنسوؤں کا سیل رواں اس کی شبنمی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ میں نے اسے تشفی دینا مناسب نہ جانا کیونکہ ان لمحوں

کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اپنا غبار نکال لے۔ جانے کب تک وہ مجھ سے لپٹی میری دھڑکنوں میں سمائی رہی۔ جی تو چاہتا تھا یہ لمحے امر ہو جائیں لیکن ہائے رے مجبوری! میں نے اسے خود سے علیحدہ کر کے اس کے چاند چہرے کو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں رکھ کر اونچا کیا۔

"ایک بات کہوں پونم۔" میں نے اس کے مخصوص لہجے میں اسی کو مخاطب کیا لیکن وہ خاموش رہی۔

"تم کبھی کبھی اس طرح آنسو ضرور بہایا کرو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں تیرنے والے گلابی ڈوروں میں سے ابھرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھوں کی خطرناکی بڑھ جاتی ہے۔" میں اس کی استفسارانہ نظروں میں پھر ڈوب گیا اور اس کے لہجانے کی ادا نے مجھے مار ڈالا۔

"اچھا اپنی آنکھیں پونچھ ڈالو' کہیں چلتے ہیں۔"

"کہاں ——؟" اس کی آنکھوں نے فتنے جگاتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں دھرتی اور آکاش گلے ملتے ہیں۔" میں نے فلمی لہجے میں کہا اور پونم کی ہنسی نے فضا میں نقرئی گھنٹیاں بجا دیں۔

"لیکن یہ ٹھیک نہیں' آپ آرام کیجئے نا!" اس نے ہنسی روک کر کہا۔

"ہے بھگوان' یہ خوبصورت کنیا ہم سے پیچھا چھڑانے کے لئے کیسے چھل کرتی ہے۔" میں نے دونوں آنکھیں بند کرتے ہوئے پنڈتوں کے سے لہجے میں کہا۔ ایک مرتبہ پھر پونم کھلکھلا اٹھی۔

OO.O

میری صحت تو اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ میں چہل قدمی کرتا پھروں لیکن چارپائی کا ہو کر رہنا بھی مجھے منظور نہیں تھا۔ کپڑے بدل کر میں پونم کے ساتھ آہستہ آہستہ نیچے چلا آیا اور ہم دونوں رکشہ میں بیٹھ کر ایک خوبصورت سنیک بار میں جا پہنچے۔ سنیک بار کے رومانٹک ماحول میں بیٹھے میرا ماضی' حال اور مستقبل سب کچھ مختلف میزوں کے گرد بیٹھے نوجوانوں کے جو اپنی اپنی "پونم" کے ساتھ اس گوشہ عافیت میں چلے آئے تھے' سگریٹوں کے اٹھتے دھوئیں کے مرغولوں میں کہیں کھو گیا تھا —— یہاں صرف میں تھا اور پونم کے سنگ کی خوبصورت مہک' جس نے میرے گرد حصار تان کر سارے رنج اور کلفتیں بھگا دی تھیں۔ میرے پہلو میں برگد کی وہ ٹھنڈی چھایا بیٹھی تھی جس کے دامن میں پناہ لے کر درماندہ پنچھیوں کے راہرو اپنی ترشنا بجھاتے تھے۔ اس کا قرب محبتوں کا پیامبر تھا۔ وہ محبت کی "گیتا" تھی جس کے لئے رام نے بن باس لیا تھا۔ اس کی تلاش میں صدیوں سے نجانے کتنے "تپ دھاری" ہمالیہ کی ترائیوں میں بھٹک رہے تھے۔ وہ تبت کی دیوداسیوں کا حسین گیت تھی جسے آنے والے مسافروں کی یاد میں گایا جاتا تھا۔ راجہ اندر کے دربار کی وہ حسین ملکہ سلون کی چاندنی بن کر میرے من میں اتر گئی تھی۔ خیام کی اس حسین رباعی کے ساتھ بیٹھ کر پی جانے والی کافی جام حیات بن جاتی تھی' وقت کا احساس مٹ جاتا تھا اور گھڑیوں کی گردش رک جاتی تھی۔

"بہت وقت ہو گیا' گھر بھی جانا ہے۔ ماتا جی پریشان نہ ہوں۔ میں نے انہیں کالج سے سیدھے گھر آنے کو کہا تھا۔" بالآخر وہ مجھے مرتی مارتی دنیا میں واپس لے آئی۔

ہم دونوں اٹھے' بس اڈے تک میں اسے رکشے میں چھوڑ آیا۔ میں نے اس سے "بینتی" کی تھی کہ وہ گھر میں کسی کو میری حالت سے آگاہ نہ کرے' پھر پونم اپنی خوشبوئیں ہمراہ لئے رائے کوٹ چلی گئی اور میں اسی رکشہ میں پرکاش کے پاس آ گیا۔

پرکاش اور سدرشنا بینا بازار سے واپس آ چکے تھے اور میرے ہی منتظر تھے۔ دونوں اوپر کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے کو "داد عشق" دے رہے تھے۔

"آپ کا تو شریمان جی سیدھا سا علاج تھا۔ میں نے تو جھک ہی ماری۔" پرکاش نے میز پر رکھی جوں کی توں دوائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا مہاراج جی۔" میں نے مئودب لہجے میں پوچھا۔

"پونم دیدی!" بجائے اس کے سدرشنا نے کہا اور ہم تینوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔ دونوں تھوڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے' پھر پرکاش اسے چھوڑنے چلا گیا۔

تین چار روز تک میں نے صرف آرام کیا۔ روزانہ پونم اور سدرشنا آجاتیں اور ہم دونوں پرکاش اپنی اپنی دنیاؤں میں کھوئے رہتے۔

OOO

میجر بھاسکر کے قتل کے متعلق ہماری سکیم کامیاب رہی اور تفتیشی افسران کو یقین کی حد تک اس بات کا گمان گزرنے لگا کہ ضرور اس سوامی کے بچے کا میجر بھاسکر کے قتل میں کوئی ہاتھ ہے۔ اپنے مقامی دوستوں کی مدد سے ہم نے ایسا جال پھیلایا کہ جس سے بھارتی سیکورٹی کے ہاتھ ایسے شواہد آ گئے جن کی رو سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سوامی دیانند کا باڈر سمگلروں کے ساتھ ضرور کوئی خفیہ رابطہ ہے۔ اس کے علاوہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ انہیں سوامی دیانند اور میجر بھاسکر کے درمیان لڑکیوں کے معاملے میں چلنے والی خفیہ رقابت کا علم ہو جائے۔ جب یہ باتیں اعلیٰ افسران کے کانوں تک پہنچیں تو انہوں نے فوری اقدام کے طور پر اپنا "دست شفقت"

مہاراج کے سر پر سے اٹھالیا؟

سوامی ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہو گیا؟

ہماری پلاننگ دراصل اتنی بے داغ تھی اور منصوبہ بندی اتنی شاندار کہ دور دور کی کوڑی لانے والے مخبر بھی بھونچکے رہ گئے اور حالات کا علم "بھگوان" کو اُس وقت ہوا جب وہ ہاتھ سے نکل گئے۔ سیکورٹی والوں نے اسے وارننگ دیئے بغیر اس سے رابطہ ختم کر لیا اور مہاراج دیانند سوامی زخمی ناگ کی طرح سر پٹختا رہ گیا۔

کھیل اب صحیح معنوں میں دلچسپ ہو گیا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس اور سوامی دیانند کے آپس میں الجھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ میدان ہمارے لئے کافی حد تک صاف ہے! میری ذمہ داریاں بھی ساتھ ہی بڑھ گئیں۔ اب مجھے اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر دو محاذوں کو بیک وقت سنبھالنا تھا۔ ایک طرف تو مجھے ایسے حالات پیدا کرتے رہنا تھا کہ بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس سوامی دیانند کے خفیہ معاملات اور میجر بھاسکر کے قتل میں الجھی رہے' دوسری طرف اس علاقے میں کام کرنے والے ایجنٹوں کی راہنمائی اور ممکن حد تک حفاظت بھی میرے ذمے آن پڑی تھی۔ میرا زیادہ وقت لدھیانہ کے گرد و نواح اور رائے کوٹ وغیرہ میں ہی گزرتا تھا۔

اپنے زخمی ہونے کے قریباً پندرہ بیس روز بعد میں راجکمار سے ملنے اس کے مَیس پہنچ گیا کیونکہ اس کی "پُرخلوص اور پُراصرار" دعوت مجھے اچھی طرح یاد تھی اور ایسے دوستوں کی تو ہمیں اکثر ضرورت رہا کرتی تھی۔ ہوائی اڈے کے نزدیک میں کافی دیر بعد پھٹکا تھا کیونکہ اس اثناء میں پے در پے ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جنہوں نے میری آمدورفت اس طرح خاصی کم کر دی تھی۔

میں جان بوجھ کر لوقات کار میں ہوائی اڈے پر پہنچا۔ گارڈ روم پر میں نے فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار کا نام بمعہ ٹریڈ لکھوایا اور ملاقاتی کے خانے میں دوست کی بجائے رشتے دار کا اندراج کروا دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی گارڈ روم کے فون پر اس سے میرا رابطہ ہو چکا تھا۔ اتفاق سے وہ اپنے آفس میں ہی موجود تھا۔ اس نے مجھے بھلایا نہیں تھا۔ شاید اسی لئے مجھے اپنے نام کے ساتھ اپنا تعارف نہیں کروانا پڑا۔ میرا نام سنتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"اوہ تھینک یو---- سر!" اس نے فون پر ہی میری آمد پر میرا مشکور ہونا شروع کر دیا۔

"ارے ارے یہ کیا---- اتنی دور سے شکریہ وصول ہونے سے رہا۔"

"اوہ سوری! اچھا میں اردلی بھیج رہا ہوں۔"

"او۔کے!" مَیں نے اگلی بات سنے بغیر فون بند کر دیا اور گارڈ روم کے ایک کونے میں سلیقے

سے سجائے ایک صوفے میں دھنس کر اس کے اردلی کا منتظر ہو گیا۔ اس کا آفس یہاں سے دو تین فرلانگ دور تھا کیونکہ مجھے لینے کے لئے اس نے ایک جیپ بھیجی تھی۔ جیپ سے ایک سکھ کارپورل اتر کر اندر آیا۔ اس نے میرا نام پکار کر میری بابت دریافت کیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں ایئربیس کے رن وے کے نزدیک سفر کرتا ہوا اس برانچ کی طرف جا رہا تھا جہاں میرا "کزن" فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار "آن ڈیوٹی" تھا---- جیپ اس کے آفس سے جو ہوائی اڈے کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی۔ اپنے دفتر کے باہر وہ میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور "ہیلو" کا نعرہ لگاتے ہوئے مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ میں نے بھی اس سے کچھ کم گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"کیسے بھول پڑے اس طرف شریمان جی۔" اس نے دفتر میں ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کو کہتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

"اس طرف "بھول" کر کون آ سکتا ہے۔ گارڈ روم والے گھسنے دیں گے کیا۔" میری بات پر اس نے قہقہہ لگا کر داد دی۔

"میں تو سمجھا تھا آپ لوگ شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ کیا نام تھا ان شریمتی جی کا.....؟"

"پونم!"

"ہاں ہاں وہ دیوی جی تو شاید برا مان گئی تھیں۔" بھلا پُونم کے حوالے کے بغیر ہماری دوستی ہی کیا تھی۔

"ارے نہیں مہاراج ایسی بھی کیا بات۔ بس عورتیں ذرا ایسی ہی ہوتی ہیں۔" ہم دونوں نے خواہ مخواہ دانت نکال دیئے۔

راجکمار نے اپنے اردلی کو کنٹین سے چائے لانے کا حکم دے دیا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ بڑے خوش قسمت ہیں جو ایسی خوبصورت لڑکی آپ کی پتنی بننے والی ہے۔"

"تھینک یو۔" سوائے اس کے اور میں کیا کہہ سکتا تھا۔

بمشکل میں نے گفتگو کا رخ بدلا ورنہ اس کے تو دل و دماغ پر پُونم ہی چھائی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ میں اسے مطلب کی بات کی طرف لے آیا لیکن اتنی معصومیت سے کہ اسے بظاہر یہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ میرے استفسار کئے بغیر سب کچھ بولتا چلا جا رہا ہے۔

فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار کا تعلق گراؤنڈ سٹاف سے تھا اور وہ ٹیکنیکل سٹاف کا آفیسر تھا۔ جس

کے ذمے جہازوں کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کے فرائض ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا آفس بھی رن وے سے کچھ فاصلے پر ایک ورکشاپ کے کونے میں بنا ہوا تھا۔ اس ورکشاپ میں عموماً جہازوں کو پرواز سے پہلے یا پرواز کے بعد چیکنگ وغیرہ کے مراحل سے گزارنے کے لئے لایا جاتا تھا۔ میں کمال سادگی سے راجکمار کے منہ سے جہازوں کی مختلف خصوصیات اگلوا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ممکنہ حملے کے پیش نظر اڈے کے دفاعی انتظامات' مختلف محکموں کی کارکردگی اور اپنے فائیٹرز کی قوت حملہ اور قوت دفاع سے مجھے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ قریباً" ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ میرے بڑھتے ہوئے اشتیاق کے پیش نظر مجھے اپنی ورکشاپ میں اپنے ہمراہ لے جا رہا تھا۔ اس نے اتنی تفصیل سے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ میری جگہ کوئی مبتدی بھی ہوتا تو بھارتی ایئرفورس کے کسی مقابلے کے امتحان میں ضرور بیٹھ جاتا۔

ورکشاپ کیا تھی' اچھی خاصی گراؤنڈ ہی کہہ لیجئے۔ جس پر لوہے کی چادروں کے شیڈ ڈال کر ان پر خاکی اور سبز رنگ کر کے انہیں کیموفلاج کیا گیا تھا۔ ہوائی اڈے میں "پلینٹ فارم" کا جدید نظام کارفرما تھا اور رن وے سے اپنے "ٹیکسی ٹریک" پر سفر کرتا ہوا ایئرکرافٹ مختلف مراحل سے گزر کر چند منٹ کے اندر اپنے مخصوص ہینگر میں پہنچ جاتا تھا جس کے بعد مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے درجنوں ایئرمین اس کے مختلف حصوں سے چمٹ کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔

قریباً" آدھ گھنٹے تک میں نے راجکمار کے ساتھ گھوم پھر کر ورکشاپ کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس اثناء میں سوائے اس کے کہ میں خود ایئرکرافٹ میں داخل نہیں ہوا' شاید ہی کوئی ایسا مرحلہ رہ گیا تھا جس سے میں نہ گزر سکا۔ بسا اوقات تو مجھے خود پر رشک آنے لگتا تھا لیکن پھر میرا پرتشکر دل بارگاہ ایزدی میں جھک جھک جاتا' جس کی لامحدود کرمفرمائیوں کے طفیل میرے راستے کی تمام مشکلات ایک ایک کر کے ہٹ جاتی تھیں اور بظاہر مشکل بلکہ ایک حد تک ناممکن کام میرے لئے آسان اور ممکن بن جاتا تھا۔

راجکمار ڈیوٹی سے آف ہو کر مجھے ساتھ لئے میس میں چلا آیا جہاں دوپہر کا کھانا میں نے اس کے ساتھ کھایا اور اگلے تین چار روز کے بعد اس سے کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے واپس آ گیا۔ واپسی پر میں سیدھا رائے کوٹ ہی چلا آیا تھا' چونکہ اگلے روز چھٹی تھی۔

ooo

اس روز پڑوس میں شادی تھی اور ان لوگوں نے جگہ کی تنگی کے پیش نظر ہمارا گھر بھی مستعار لے رکھا تھا۔ بارات کسی دوسرے شہر سے آنے والی تھی۔ شادی کی تقریبات تو پچھلے

ایک ہفتے سے شروع ہو چکی تھیں لیکن اپنے جوبن پر وہ آج پہنچی تھیں کیونکہ اگلے روز بارات آنے والی تھی۔ یہ لڑکی جس کا نام شوبھا تھا' بابو جی کے ساتھ والے گھر میں رہتی تھی اور ایک کلرک کی بیٹی تھی۔ شوبھا چونکہ پونم کی بچپن کی سہیلی تھی اس لئے اس کی شادی میں بھی پونم کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا تھا۔ اس کے شدید اصرار پر میں بھی آج ہی آ گیا تھا ورنہ تو مجھے شور شرابے سے "وحشت" ہوتی تھی۔

گھر پر بابو جی اور ماتا جی حسب معمول بحث میں مصروف تھے۔ بابو جی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے جب انہیں ہندو دھرم پر چوٹ کرنے کا موقعہ مل سکے اور خوش قسمتی سے انہیں یہ مواقع میسر آتے رہتے تھے' چونکہ میرے مطالعے اور مشاہدے کی حد تک تو میرے علم میں یہی بات آئی تھی کہ ہندوازم کسی باقاعدہ نظام حیات کا نہیں بلکہ بے شمار اور انتہائی فضول رسومات کے ایک مجموعہ کی شکل ہے۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے کوئی نہ کوئی تہوار اور اس کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی "پوجا" دیکھنے کو ملتی تھی۔ شادی بیاہ کی تو اتنی بے شمار اور عجیب و غریب رسمیں دیکھنے کو آتی تھیں کہ بے اختیار ان لوگوں کی عقل پہ ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ یہ تمام فضول رسومات جو ان موقعوں پر انجام پاتی تھیں وہ ہندو دھرم کا باقاعدہ حصہ تھیں اور ان سے دامن بچانے والا "ناستک" اور دھرم کا باغی کہلاتا تھا۔ اگر یہ رسومات صرف معاشرے کا حصہ ہی ہوتیں تو ممکن ہے "سماج سدھار" قسم کے پروگراموں کی آڑ لے کر کوئی غریب آدمی ان سے جان چھڑوا سکتا لیکن "دھارمک" کا لیبل چسپاں ہونے کے بعد کسی کا ان سے بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔

ہندو دھرم جہاں بابو جی کی کمزوری تھا وہاں ماتا جی کی چڑ اور اب تو بابو جی کے ہاتھ یہ دلچسپ مشغلہ آ گیا تھا کہ وہ ایسے کسی نہ کسی موقعے کے منتظر رہتے' پھر ماتا جی کے سامنے چھوٹی سی بات کہہ کر جواب میں ان کی لمبی چوڑی تقریر سن لیتے۔ دونوں بوڑھوں کی ایک بات قابل ستائش تھی کی طبیعتوں میں اس قدر بُعد المشرقین رکھنے کے باوجود وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے اکتائے نہیں تھے۔ کبھی ان کے درمیان تلخ کلامی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ بس یہی ہوتا کہ بابو جی کہتے اور ماتا جی کی سُن بھی لیتے۔

"اچھا اچھا بابا جانے دو۔ جو تم کہتی ہو وہی صحیح ہو گا۔" بابو جی نے مجھے آتے دیکھ کر بحث ختم کرنا چاہی۔

ماتا جی بھی میرے "نمسکار" پر چونکیں اور آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"کیا بات ہے صاحبزادے کچھ کمزور دکھائی دے رہے ہو" بابو جی نے میرا جائزہ لیتے ہوئے

کہا۔ ان کا کہنا کسی حد تک بجا بھی تھا کیونکہ پچھلے حادثے کے بعد سے میں بھی نقاہت سی محسوس کرنے لگا اور علاج پر بھی خاص توجہ نہیں دی تھی اس لئے کچھ کمزوری باقی رہ گئی تھی۔

"فی الحال تو ایسی کوئی بات نہیں---- آئندہ کے لئے البتہ....." میں نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ سامنے سیڑھیوں سے اجنتا کی مورت اس طرف آ رہی تھی۔ آج اس نے اپنی زلفیں سلیقے سے باندھ کر ان میں شادی کی رسم کی مناسبت سے چنبیلی کے پھولوں کا گجرا ٹانک رکھا تھا۔ سفید پھولوں کے حسن کو اس کی گھنیری زلفوں نے چار چاند لگا دیئے تھے—— اپنی نیلی ساڑھی کا پلو سنبھالتی وہ "وشنو کنیاؤں" کی طرح نپے تلے قدموں سے میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ جب اس نے اک ادائے دلربانہ سے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر "نمستے" پکارا تو مجھے بنگال کی وہ جوگنیں یاد آ گئیں جو صرف "ناگ پوجا" کے روز اپنا جوبن دکھاتی ہیں۔ بنگال کی ساحرہ نے اپنی پلکوں کے اجالے مجھ پر بکھیرتے ہوئے میری خیریت دریافت کی اور جب گہری نظروں سے میرا جائزہ لے چکی تو اچانک اس کے خوبصورت چہرے پر تشویش کے آثار ابھرے۔ بابو اور ماتا جی اس اثناء میں رسوئی میں چلے گئے تھے "آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی تک تو تھا لیکن شاید اب رہ نہ سکوں۔" میں نے گمبھیر لہجے میں اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا لیکن پھر سنبھل گیا کیونکہ دروازے سے اس کی سکھیاں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی نچلے حصے میں مہمانوں کا قبضہ تھا۔

پونم نے میرے کمرے میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ میرے آرام میں کسی کی خلل اندازی اسے کب گوارا تھی۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور پونم اندر چلی آئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے آئی تھی لیکن میں نے معذرت کر دی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہیں لیٹا رہا۔ پونم نے بھی زیادہ تکرار نہ کی' اسے میری "عادات" کا احترام کرنا آ گیا تھا۔ یہ بابو جی اور پونم کے استفسار کا اثر تھا یا پھر میری حد سے بڑھتی ہوئی لاپرواہی کہ اب واقعی مجھے اپنا جسم ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اصل میں' میں لدھیانہ میں ہی ایک دو دن کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دوائی سے جان چھڑا لی تھی جب کہ انہوں نے کم از کم دس روز تک لگاتار دوائی استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

پہلے سر بھاری بھاری سا محسوس ہوا' پھر تپش کا احساس ہونے لگا اور قریباً ایک گھنٹے کے بعد بخار مجھ پر غالب آ گیا۔ آہستہ آہستہ یہ نوبت آئی کہ میری کنپٹیاں درد سے پھٹنے لگیں۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پہل تھی۔ لڑکیاں ڈھولک پر شادی بیاہ کے گیت گا رہی تھیں۔ اس سے پہلے پونم کی آواز کا گداز میں نے صبح پوجا کے وقت اس کی بھجن کتھا میں دیکھا تھا لیکن اس کی

آواز کا لوچ اور رچاؤ آج محسوس ہو رہا تھا۔ گیت کے بول اس کے ہونٹوں سے پھسلتے تو فضائیں گنگنا اٹھتیں۔ سر اور لے کا حسین سنگم بنی وہ اپنی سکھیوں کے بیچ درمیان دلہن کے سامنے ڈھولک کی تھاپ پر جدائی کے گیت گا رہی تھی۔ یوں تو تمام بھارتی لڑکیاں ہی کلاسیکل ناچ اور گانے بجانے پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں' اگر نہیں تو کم از کم معمولی گانا بجانا انہیں ضرور سیکھنا پڑتا ہے کیونکہ یہ ان کی روز مرہ کی عبادات میں شامل ہے۔

اگر میں پونم تک اپنی بیماری کی خبر پہنچا دیتا تو اس کے "ناچ" سے محروم ہو جاتا جس کا مظاہرہ اس نے تھوڑی دیر بعد کرنا تھا۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے سے نکلا اور بازار میں پہنچ گیا۔ ایک میڈیکل سٹور سے میں نے اپنی دانست کے مطابق کچھ دوائیاں خرید کیں اور اپنے کمرے میں آ کر انہیں نگل کر لیٹ گیا۔ دوائیاں خاصی تیز اور زود اثر تھیں۔ مجھے کم از کم تھوڑی دیر کے لئے درد سے نجات مل گئی۔

ooo

شام ڈھلتے ہی پونم میرے کمرے میں دوبارہ آئی۔ اس نے "کلاسیکل ناچ" کے لئے مخصوص سنگھار کر رکھا تھا۔ میری کوئی بات سنے بغیر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر نیچے لے آئی اور پہلے سے میرے لئے مخصوص کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ اس کا "گرو" جو شکل سے گدھا زیادہ اور گرو کم دکھائی دیتا تھا' اپنی اگردوں کے درمیان براجمان تھا۔ پونم نے مجھے اس کمبخت کے پاؤں چھونے کو کہا جو یہاں کی روایت تھی۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں اس کے "پاؤں لاگوں" میں نے "گرو مہاراج" کہہ کر اسے نمسکار ضرور کر دیا۔ اس سے زیادہ کی امید پونم کو بھی نہیں تھی' وہ بے چاری اسی پر خوش ہو گئی۔

وہاں موجود قریباً" سبھی لوگوں کی آنکھیں پونم پر لگی تھیں۔ کبھی کبھی وہ رشک اور حسد کی ملی جلی نگاہوں سے مجھے بھی دیکھنے لگتے کیونکہ میں اس کا مگنیتر تھا۔ پونم نے ہندو آداب محفل کے مطابق سب سے پہلے میرے پاؤں چھوئے' پھر بابو جی' ماتا جی اور موسی کے۔ اس کے بعد ہاتھ باندھ کر ایک خاص ادا سے اپنے جسم کو بل دیا اور اپنے گرو مہاراج سے جھکتے ہوئے اجازت طلب کی۔ "آگیا" ملنے پر اس کی ایک سکھی نے اس کے پاؤں میں گھونگھرو باندھے۔ پونم نے جھک کر گرو کے پاؤں چھوئے۔ اب وہ بجلیاں گرانے کے لئے تیار تھی۔ گرو نے ناچ کا "توڑا" کہنا شروع کیا اور اس کی دوسری شاگردوں نے طبلے اور ہارمونیم سنبھال لئے۔ پونم نے تیزی سے ہاتھ باندھتے ہوئے بل کھایا اور طبلے کے بول اس کے گھنگھروؤں کی جھنکار میں ناچنے لگے۔

وہ "کتھک" تھا یا "بھرت ناٹیم" اس کا تو مجھے علم نہیں' مجھے تو صرف یہ محسوس ہو رہا تھا

جیسے ساری دھرتی کا لوچ اور ردم اس میں سما گیا ہو۔ اس کے لچکیلے بدن کا انگ انگ شاعری کر رہا تھا۔ فضاؤں کو اس کے تاؤ بھاؤ نے اسیر کر لیا تھا۔ سے کا پنچھی اس کے قدموں کی حرکات کے ساتھ ساتھ محو پرواز تھا۔ ہر طرف اک سناٹا' اک سکوت طاری تھا۔ سب لوگ مبہوت اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ جب وہ گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ اپنے جسم کو بل دیتی تو سانسیں سینوں میں اٹک اٹک جاتیں۔ قریباً" آدھ گھنٹہ تک ماحول اس کے طلسم کا شکار رہا۔ جب رقص ختم ہوا' چند ثانیے تک تو یوں لگتا تھا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر سب بے اختیار اسے داد دینے لگے۔ اس کے گرو جی نے اٹھ کر اسے "کلیان" دیا۔ اس محفل کو تو رات ڈھلنے تک جاری رہنا تھا' میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور نڈھال سا بستر پر گر پڑا۔ میرا جسم بخار میں پھنکنے لگا تھا۔

خاصی دیر تک میں اسی کیفیت کا شکار رہا۔ میری آنکھوں کی پتلیوں میں پونم ناچتی رہی۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب نچو میرے لئے کھانے کی "تھالی" لے کر آیا۔ میں نے اسے "تھالی" واپس لے جانے اور چائے لانے کو کہا۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ نچو نے شاید پونم کو بتا دیا تھا کیونکہ اس کے جانے کے بمشکل دو تین منٹ کے بعد ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور پونم اندر آ گئی۔

"کیا ہوا' کیا بات ہے آپ نے کھانا....." اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "ارے آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔" وہ میری تکلیف پر تڑپ اٹھی۔

"تم جیسے مسیحا ہوں تو بخار کہاں۔" میں نے اس کے مہندی لگے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

پونم کی آنکھوں سے میری آنکھیں ٹکرائی اور مجھ پر سحر طاری ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے مجھے خود سے الگ کیا اور میرے جسم کے گرد کمبل لپیٹ کر خود کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی۔ پونم کی واپسی پرکاش اور چائے کے ساتھ ہوئی تھی۔ پرکاش شادی میں شرکت کے لئے آیا تھا' ویسے بھی اگلے روز چھٹی تھی اور چھٹی والا دن وہ رائے کوٹ میں ہی گزارا کرتا تھا۔

"کیا حالت بنا دی ہے ان کی۔" اس نے بجائے میرے کہنے کے براہ راست پونم سے پوچھا۔

"آپ ہی سمجھا دیتا انہیں۔" پونم کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"اچھا! میں سمجھاؤں۔" پرکاش نے کچھ اس انداز سے پونم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ بے اختیار میرے ساتھ اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پرکاش اور پونم کے ساتھ ان کے ایک محلے دار ڈاکٹر کے گھر جا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ان کے رنگ میں بھنگ ڈالی۔ ڈاکٹر نے جو ڈاکٹر کم اور قصائی زیادہ دکھائی دیتا تھا' لٹا کر مجھے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پھر انا ڑیوں کی طرح انجکشن بازو میں لگا دیا۔ کچھ کڑوی کسیلی دوائیاں اور گولیاں میرے پلے باندھیں اور نہایت انکساری اور احسان جتلاتے ہوئے کہ کیونکہ وہ اپنی گھر پر مریض نہیں دیکھتا تھا' ہمیں رخصت کر دیا۔

قصائی ڈاکٹر کی دوائی نے اثر دکھایا۔ مجھے خاصا افاقہ محسوس ہونے لگا۔ پونم اور پرکاش نے شادی میں شرکت کم اور میری تیمارداری زیادہ کی تھی۔ پونم تو خصوصاً" سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہی۔

برآت آئی' "ہون" سلگایا گیا' پنڈت نے دو چار الٹے سیدھے اشلوک پڑھے اور وداع ہو گیا۔ پونم شوبھا سے یوں گلے مل کر روئی جیسے وہ اس کی سگی بہن ہو۔ کتنا فراخ دل تھا اس کا---- جس میں ایک عالم کا درد سمایا تھا۔ اس نے غم دنیا کو غم ذات بنا لیا تھا۔ شوبھا کو رخصت کر کے وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی----! اصل میں یہ اس کا بہت بڑا المیہ تھا کہ جس سے وہ محبت کرتی' اسے ٹوٹ کر چاہنے لگتی تھی اور اس کی محبوب شخصیت خود پونم کے وجود کا حصہ بن کر رہ جاتی تھی۔

بابُو جی

پانچ چھ روز کے بعد مجھے پیغام ملا کہ جسونت ایک مشن لے کر مجھے ملنے آ رہا ہے۔ جسونت کو میں نے کبھی بھی بھلایا نہیں تھا۔۔۔۔ اس جیسے دلیر اور جانثار ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا لطف کچھ میں ہی جان سکتا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ اس سے دوبارہ ملاقات ہو۔

موگا کے بس سٹینڈ پر میں اس کا منتظر تھا۔ میں مقررہ وقت سے قریباً" آدھ گھنٹہ پہلے موگا پہنچ گیا تھا۔ موگا سے میری بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں لیکن فی الحال وہی ایک گوشہ عافیت ہمیں اس علاقہ میں میسر تھا ورنہ تو ہر جگہ شکاری کتے ہمارے تعاقب میں تھے۔ اس مرتبہ جس حیثیت میں' میں یہاں آیا تھا کس کی مجال تھی کہ مجھ پر شک کر سکے۔ کیونکہ اب میں ایک معزز "بھارتی ناگرک" تھا۔ وقت مقررہ سے صرف تین چار منٹ قبل میں مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ گیارہ بج چکے تھے لیکن جسونت کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خدشات سر اٹھانے لگے۔ تربیت کے مطابق جیسے ہی طے شدہ وقت ملاقات پورا ہوا' میں نے فوراً" اس جگہ سے پرے ہٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس طرح میں کسی محفوظ گوشے میں کھڑا ہو کر مزید کچھ منٹ تک حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں بمشکل اپنی جگہ سے گھوما ہی تھا جب اچانک کسی کے ہاتھ کا دباؤ مجھے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کا خالص انگریزی لہجے میں فقرہ سنائی دیا۔

"ہائے پرکاش۔۔۔۔!"

میں یک لخت گھوما اور دوسرے ہی لمحے حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لے کر نووارد سے "ہائے جسونت" کا نعرہ لگا کر لپٹ گیا۔ اس مرتبہ جسونت کا حلیہ دیکھ کر مجھے بھی اس کے جسونت ہونے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دھاریوال سوٹنگ کا بہترین سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ چہرے پر سنہرے فریم کی گہرے شیشوں والی عینک اور سر کے بالوں کا رنگ سیاہ کے بجائے ہلکا سنہری۔ راجپوتوں کے مخصوص انداز میں گھنی اور بل کھاتی مونچھیں۔ داڑھی کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ انگلی میں پہنی سونے کی بھاری انگوٹھی اور اسی مناسبت سے ہاتھ پر بندھی

قیمتی گھڑی۔ اس کے کسی ریاست کے ولی عہد ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔

اس کا یہ روپ میرے لئے حیران کن نہیں چونکا دینے والا بھی تھا۔ میرے پچھلے تمام اندازے جو اس کے متعلق میں نے لگائے تھے' غلط ثابت ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے میں اسے ایک ان پڑھ اور محض سمگلر نما جاسوس ہی جان سکا تھا کیونکہ اس نے پچھلا مشن میرے زیر کمان کیا تھا لیکن اب اس کا یہ روپ دیکھ کر مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ تو کوئی بہت ہی اعلیٰ پائے کی چیز ہے۔ کم از کم مجھ سے خاصا سینئر ایجنٹ۔ بڑی بے تکلفی سے اس نے میرا حال دریافت کیا اور ہم دونوں اپنی دانست میں موگا کے سب سے بہترین ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

"شریمان جی میرا شبھ نام جسونت نہیں ٹھاکر رگھبیر سنگھ ہے۔ جسونت تو عزیز و اقارب مجھے پیار سے کہتے ہیں' آپ چونکہ میرے بچپن کے دوست ہیں۔ بیکانیر میں ہم اکٹھے ہی میٹرک تک پڑھے تھے' اس کے بعد میں تو یورپ چلا گیا جب کہ آپ انڈیا میں ہی دھکے کھاتے رہے۔ یہ الگ بات کہ آپ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنا کاروبار رکھتے ہیں۔" اس نے ہوٹل میں بیٹھتے ہی اپنا تعارف کروا دیا۔ میں ٹکر ٹکر اس کے منہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"ونڈر فل!" میرے منہ سے بے اختیار اس کی توصیف میں نکلا۔

"مجھ سے کچھ کہلا" اس نے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"آپ تو مہاراج میری توقعات سے بھی زیادہ بڑے جاسوس نکلے۔" جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

ٹھاکر رگھبیر سنگھ نے مجھے مشن کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ تیسرے روز اس کی دہلی میں موجود "گرل فرینڈ" کے پتا جو ونگ کمانڈر تھے اور ایک اہم نوعیت کی کانفرنس میں شرکت کرنے والے تھے۔ اس کانفرنس سے متعلق اہم فیصلوں کے انہوں نے نوٹس تیار کرنے تھے---- یہ نوٹس ٹھاکر کے خیال کے مطابق (چونکہ پچھلے ہفتے سے وہ ونگ کمانڈر اس کی زیر نگرانی تھا اور ٹھاکر کی اس کے گھر میں آمد و رفت بھی تھی) اس کے بریف کیس میں ہوں گے۔ ہم نے ان کی نقل تیار کرنی تھی' وہ بھی اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ دشمن کو اس حرکت کا علم نہ ہونے پائے۔

دوسری صورت میں دشمن ہشیار ہو جاتا اور اپنے تمام منصوبے تبدیل کر دیتا۔ خواہ اس کے لئے اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑتا۔ میں چونکہ دستاویزات کی فوٹو کاپی کا "ماہر" تھا اس کے علاوہ ٹھاکر رگھبیر سنگھ کو جو حقیقتاً مجھ سے اعلیٰ درجے کا ایجنٹ تھا' میری صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور بقول اس کے پچھلا مشن تو صرف "ٹرائل مشن" تھا جس میں اس نے مجھے "پرکھنا" تھا۔ چونکہ میں اس کے معیار پر پورا اتر چکا ہوں' اس لئے اس کی خواہش کے مطابق اس کے ساتھ

"منسلک" کر دیا گیا ہوں۔

دو جاسوس جب مل کر کام کرتے ہیں تو اصل میں وہ اپنی زندگی کے خطرناک ترین مرحلے میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ ایک آدمی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے تئیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا اور غلطی بھی ہوئی تو اس کا خمیازہ اسے اکیلے ہی بھگتنا پڑے گا لیکن دونوں کے اکٹھے کام کرنے میں صورت حال ذرا نازک قسم کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایجنٹ کی معمولی سی غلطی دوسرے کو بھی اس کے ساتھ ہی لے ڈوبتی ہے گو کہ ایک دوسرے پر اعتماد کئے بغیر اکٹھے کام کرنا ممکن نہیں ہوتا' اس کے باوجود دونوں جاسوس اپنے ذاتی تحفظ کے لئے اور اپنی ٹریننگ کے مطابق بھی اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو اپنے Safe House اور اپنے متعلق کسی بھی ایسی بات سے آگاہ نہیں کرتے جو ایک کی گرفتاری کی صورت میں دوسرے کے لئے پریشانی کا باعث بن سکے۔ حتیٰ کہ انہیں ایک دوسرے کو اپنا اصلی نام بتانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ دوران تربیت ہی جاسوس کا مزاج کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے لاکھ محبت کرنے کے باوجود سوائے اپنی ضرورت کے اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اگر ٹھاکر مجھے اپنی گرل فرینڈ کے گھر "کارنامہ" کرنے لے جا رہا تھا تو صرف اس لئے کہ اس کے بعد اسے پردہ سکرین سے ہٹ جانا تھا۔ ویسے بھی اس نے اپنا تعارف ونگ کمانڈر کی بیٹی سے ایک سیلانی آدمی کے روپ میں کروایا تھا۔ اس کا کوئی خاص ٹھکانہ نہیں تھا۔ آج یہاں' کل وہاں۔ اگر ونگ کمانڈر کی بیٹری اس کی دوست بنی تھی تو صرف اس کی دولت اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے' کیونکہ اعلیٰ سوسائٹی کی بھارتی صلاؤں کو ایسے "پرنس" کی تلاش رہتی تھی جن کی معیت میں کسی کلب میں بیٹھ کر وہ اپنی ہجولیوں میں نہ صرف رعب گانٹھ سکیں بلکہ انہیں جلا کر خاک بھی کر سکیں۔ ظاہر ہے اس مقصد کے لئے اس کی فرینڈز کو ٹھاکر رگھبیر سنگھ سے زیادہ اہم شخصیت اور کون سی ملتی۔ مہاراجہ بڑودہ تو اس کا دوست بننے سے رہا۔

ooo

تھوڑی دیر بعد ہی ہم واپس لدھیانہ جا رہے تھے جہاں سے ایئر انڈیا کے ایک فوکر فرینڈ شپ جہاز میں بنگلی ایئر ہوسٹسوں کی مہمانداری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم قریباً شام کے قریب دہلی ایئرپورٹ پر لینڈ کر گئے---- اس اثناء میں میرے جسم پر بھی ایک قیمتی سوٹ منتقل ہو چکا تھا۔ ٹھاکر تو پائپ سے جی بہلا رہا تھا' جب کہ مجھے بادل نخواستہ "قیمتی سگار" کا سہارا لینا پڑا۔ ایک ہی سگار نے چاروں طبق روشن کر دیئے تھے۔ میں نے ٹھاکر سے معذرت کرنا چاہی تو اس نے صرف اتنا کہہ کر میری تسلی کر دی۔

"شریمان آپ کسی گردوارے میں بھجن کھتا سننے نہیں جا رہے۔ دلی میں بطور اہم شخصیت (VIP) قیام فرمانے جا رہے ہیں۔"

دلی کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پہلے ہی ایک شاندار ڈبل بیڈ روم ٹھاکر رگھبیر سنگھ کے نام بک ہو چکا تھا' جیسے ہم ایئر انڈیا کی آرام دہ بس سے اتر کر لاؤنج میں داخل ہوئے۔ ایک پتلون بردار شر-میتی جی تیزی سے ہماری طرف بڑھیں۔

"ہائے ٹھاکر' ہاؤ آر یو!" وہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ٹھاکر سے بغلگیر ہو گئیں۔

ٹھاکر نے جواب میں "فائن" کہتے ہوئے اس سے بھی کچھ زیادہ ہی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"مائی فرینڈ مسٹر پرکاش ٹھوترہ!" اس نے پرکٹی کے الگ ہوتے ہی اس سے میرا تعارف کروایا۔

"مینا چکرورتی۔" ونگ کمانڈر کی سپری نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے ماتھے پر گری بالوں کی لٹ کو جھٹکا دے کر الگ کیا۔ اس جھٹکے نے جہاں اس کے تمام اعضاء کو ہلا کر رکھ دیا تھا' وہاں میں بھی دہل کر رہ گیا تھا۔

"کم ان ڈارلنگ۔" اس نے ٹھاکر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

ہمارے بریف کیس ایک باوردی شوفر نے اٹھا لئے تھے۔ مینا چکرورتی نے ہماری راہنمائی پارکنگ ایریا میں کھڑی ایک قیمتی مرسیڈیز کار کی طرف کی۔ مئودب شوفر نے ہمارے بریف کیس ڈگی میں رکھے اور بڑے احترام سے کار کے دروازے کھول کر ہمیں اندر بٹھایا۔ ٹھاکر اور مس چکرورتی تو پیچھے ہی بیٹھے تھے' میں دل پر پتھر رکھ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار فراٹے بھرتی ونگ کمانڈر کے شاندار بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔

نجانے ٹھاکر نے ان کو کس چکر میں پھنسا رکھا تھا۔ اس گھر کا تو ایک ایک فرد اس پر مرمٹا جا رہا تھا۔ کیا نوکر اور کیا مالک۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اس کی وجہ بھی سمجھ آ گئی کیونکہ جیسے ہی مینا چکرورتی ٹھاکر اور میرے لئے چائے کا انتظام کرنے باہر گئی' ان کے نوکروں کی آمد شروع ہو گئی۔ ٹھاکر کو ہر آنے والا جھک کر پرنام کرتا اور جواب میں دس بیس روپے وصول کر کے اسے دعائیں دیتا چلا جاتا۔ یہ حضرت خاصے منجھے ہوئے کھلاڑی دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے تو مجھے بھی مات کر دیا تھا۔

"انکل" سے ملنے کی ٹھاکر کو شدید خواہش تھی جو ابھی تک "میٹنگ" سے واپس نہیں آئے تھے۔ اسی لئے اس نے ہوٹل جاتے ہوئے بھی مینا چکرورتی سے بار بار درخواست کی تھی کہ وہ "انکل" کے آتے ہی انہیں مطلع کر دے۔ جب اس نے ٹھاکر کو "پپا" کے آنے تک

ٹھہرنے کو کہا تو اس نے معذرت کر دی کیونکہ ہوٹل میں بہت سے لوگ اس کے منتظر تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہی شوفر ہمیں ہوٹل چھوڑنے جا رہا تھا۔۔۔۔ ٹھاکر اور مس چکرورتی نے ایک دوسرے کو خاصی گرمجوشی سے رخصت کیا تھا۔ ہوٹل والے بھی ٹھاکر کے پہلے ہی سے منتظر تھے۔ جیسے ہی ہماری گاڑی ہوٹل کے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھی' خادموں کی ایک فوج ظفر موج ہم پر ٹوٹ پڑی۔ قریباً سبھی پاؤں چھو کر ٹھاکر جی کو پرنام کرتے اور اپنی جیبیں بھرتے تھے۔ کمرے تک ایک خوبصورت ویٹرس نے ہماری رہنمائی کی۔

"کوئی خدمت جناب!" جاتے جاتے اس نے اپنے سارے خطوط نمایاں کرتے ہوئے ٹھاکر سے دریافت کیا۔

"نو" ٹھاکر جی نے "تھینک یو" کہنا بھی گوارہ نہ کیا۔

"مسٹر پرکاش آپ سگار نوش نہیں فرما رہے۔" اس کے جاتے ہی ٹھاکر نے میری توجہ اس طرف مبذول کروائی۔ واقعی اب تک میں نے بمشکل آدھا سگار پیا تھا۔

"میں نے تو کر دیا' لیکن جس ونگ کمانڈر کے ہاں آپ ڈنر اور "کاک ٹیل پارٹی" اڑانے جا رہے ہیں' انٹیلی جنس اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے اور وہاں "معافی" کی گنجائش تو شاید نہیں ہوتی۔"

"اچھا یار اب شرمندہ نہ کرو۔" میں نے سگار بادل نخواستہ سلگا لیا۔ اب میں کسی عادی سگار نوش کی طرح کش لے رہا تھا۔ ٹھاکر جی کا پائپ اس اثناء میں سلگتا ہی رہا تھا۔

ابھی بمشکل آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو انکل۔" دوسری طرف سے آواز پہچانتے ہی ٹھاکر نے نعرہ لگایا اور مجھے بھی آنکھ ماری۔

"کیوں نہیں! کیوں نہیں دراصل کچھ معاملات نمٹانے تھے اس لئے....." اس نے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد جواب دیا۔

"او کے' ہم آ رہے ہیں۔" ٹھاکر جی نے تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد اک شان بے نیازی سے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

اب وہ ریسپشن سے مخاطب تھے۔

"ٹیکسی کا بندوبست کرو۔"

چند منٹ کے بعد ہی ایک باوردی بیرے نے ہمارے بریف کیس اٹھائے اور ہمیں ٹیکسی تک پہنچا دیا۔

ڈرائنگ روم میں ہمارا استقبال مس چکرورتی اور ان کے پیارلور ممانے کیا۔

"مسٹر پرکاش لھوترہ اینڈ مسٹر اونکار چکرورتی ملٹی انکل۔" ٹھاکر رگھبیر سنگھ نے ہم دونوں کا تعارف کروایا۔ تھوڑی دیر تک گپ شپ لگتی رہی' اس اثناء میں ٹھاکر اور میری نظریں بے چینی سے اس بریف کیس کا جائزہ لیتی رہی تھیں جو ایک میز پر بڑے سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ مسز چکرورتی کو کلب جانا تھا' وہ رخصت ہوئیں تو ونگ کمانڈر صاحب کو بھی ضروری کام یاد آ گیا' کیونکہ وہ "بچوں" کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ٹھاکر نے اس دوران میں مجھے ٹارگٹ کی نشاندہی کر دی تھی۔ جو کچھ تھا اسی بریف کیس میں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے تالے کھولنے کی خصوصی تربیت حاصل تھی لیکن کسی بریف کیس کو کھولنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ خدا کا شکر گزرا کہ بریف کیس بھارتی تھا اور نمبر سسٹم کے بجائے لاک سسٹم اس میں نصب تھا۔ ونگ کمانڈر صاحب کی واپسی کسی بھی وقت متوقع تھی' کیونکہ ٹھاکر کے اعزاز میں وہ خصوصی کاک ٹیل بناتے تھے اور دونوں ڈنر اکٹھے ہی کرتے تھے۔ آج تو ٹھاکر کا یارغار بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس لئے یہ خوشی دوچند ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں وہ انتظامات کا جائزہ لینے ہی گئے تھے جب کہ حقیقی مقصد یہ تھا کہ ٹھاکر اور ان کی صاحبزادی کو فرصت میسر آ سکے۔

سگار نے میرے گلے کا ستیاناس کر دیا تھا۔ مجھے اپنا مشن آسان اور مزید سگار نوشی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ ونگ کمانڈر کے جاتے ہی ٹھاکر نے میرے کندھے کو چھو کر مخصوص اشارہ کیا اور خود مس چکرورتی کا ہاتھ تھام کر بڑے مستانہ انداز میں اپنے پہلو میں لئے باہر نکل گیا۔ میں نے اس سے پہلے ہی ٹھیٹھ کلاسیکل میوزک سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا تھا جو ٹھاکر کی کمزوری تھی۔ اسی لئے وہ اپنی ڈارلنگ کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ڈرائنگ روم کو دو دروازے آتے تھے' ایک تو پہلے ہی لاک تھا' دوسرا میں نے کر دیا۔ تمام پردوں اور کھڑکیوں کا میں نے چند سیکنڈ ہی میں پھرتی سے جائزہ لے لیا۔ اگلے ہی لمحے میرا کام شروع ہو چکا تھا۔ میری تمام حسیات سمٹ کر میرے ہاتھوں میں آ گئی تھیں۔ قریباً ایک منٹ کے بعد اپنی بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ میں نے بریف کیس کھول لیا۔ ایک فائل جس پر "ٹاپ سیکرٹ" کے بڑے بڑے حروف ٹائپ تھے میرے سامنے تھی۔ دوسرے ہی لمحے میرا ننھا سا کیمرہ حرکت میں آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ضرور بے قابو تھیں لیکن میرے کام کی تربیت اور تنظیم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جب قریباً پانچ منٹ کے بعد میں نے فراغت پائی تو بریف کیس کی ہر چیز جوں کی توں اپنی جگہ موجود تھی۔ دنیا کا ماہر ترین فنگر پرنٹ ایکسپرٹ بھی میری انگلیوں کے نشان وہاں نہیں پا سکتا تھا۔ کام مکمل ہوتے

ہی میں نے دروازے کا لاک کھول دیا۔ ابھی بمشکل سکھ کا لمبا سانس مکمل ہی ہوا تھا کہ ٹھاکر اور اس کی محبوبہ اندر آ گئے۔ اس نے اندر آتے ہی حسب توقع ٹیپ کا سوئچ آف کر دیا۔

"یار کبھی ان کو چھٹی بھی دے دیا کرو۔ دفتر' گھر' گاڑی ہر جگہ یہی تمہارے پیچھے لگے رہتے ہیں۔" اس نے ایک آرام دہ صوفے پر مینا چکرورتی سمیت ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک ہی شوق پالا ہے جیون میں اور وہ بھی آپ کو پسند نہیں۔ واہ ری قسمت۔" میں نے بھی سرد آہ بھری۔

ابھی تک میں نارمل نہیں ہوا تھا۔ خوشی کے مارے واقعی میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ ہمارا پروگرام کچھ دوسرا تھا۔ ٹھاکر نے رات کے پچھلے پہر کو اس کام کے لئے منتخب کیا تھا اور باقاعدہ ایک سکیم ہم نے اس سلسلے میں کافی بحث و تمحیص کے بعد مرتب کی تھی۔ جیسے ہی مینا ایک فون اٹینڈ کرنے کے لئے اپنے بیڈ روم میں گئی۔ میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اسے اپنی کامیابی سے مطلع کیا۔ ٹھاکر نے پھٹی پھٹی اور حیرت زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے تو وہم گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ چند لمحے اس کے دل و دماغ میں کشمکش جاری رہی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے واضح آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ پھر فرط محبت سے بے قابو ہو کر اس سے اور تو کچھ نہ بن پڑا' اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر انہیں چوم لیا۔

"پرکاش تم واقعی ایک عظیم انسان ہو۔" اس کی جذبات سے بھری آواز سنائی دی۔

"آپ سے زیادہ نہیں۔" میں نے اندر آتی مس چکرورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔ خوشی ہمارے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ مس چکرورتی حیرت سے ہمیں قہقہے لگاتے دیکھتی رہی۔

○○○

رات کو ڈنر سے کچھ ہی دیر قبل حسب پروگرام میری طبیعت بگڑنے لگی اور ٹھاکر رگھبیر سنگھ نے اس اندیشے کے پیش نظر کہ میری موجودگی رنگ میں بھنگ نہ ڈال دے' مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ ونگ کمانڈر مسٹر اونکار چکرورتی کے دو تین اور دوست اپنی بیگمات کے ساتھ ٹھاکر رگھبیر سنگھ کے اعزاز میں دی جانے والی پارٹی میں تشریف لے آئے تھے۔ میرے ہوٹل پہنچنے کے تقریباً بیس منٹ بعد ہمارا تیسرا ساتھی مجھ سے فلم وصول کرنے ٹھاکر نے بھیج دیا تھا۔ مخصوص کوڈز کے بتلانے اور اپنی شناخت کے بعد میں نے فلم اس کے حوالے کر دی اور سکھ کا سانس لیا۔ اب

مجھے شدت سے نتیجے کا انتظار تھا کیونکہ کیسرے کے دھوکہ دینے کا خطرہ بھی موجود رہتا تھا۔

ٹھاکر کی واپسی گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ اس کے آنے کے چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی' میں نے بے چینی سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے ہمارے ساتھی نے "اوکے" کہہ کر فون بند کر دیا۔ میری محنت رنگ لائی تھی۔ ٹھاکر نے گرمجوشی سے مجھے گلے لگا لیا۔ ہم دونوں کی حالت قریباً ایک جیسی تھی۔ صبح اس نے مجھے بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا۔ میتا چکرورتی اور ٹھاکر دونوں ہی مجھے ہوائی اڈے پر رخصت کرنے آئے تھے۔ میں سارے راستے مس چکرورتی کی مہمان نوازی سے محرومیت کا رونا روتا آیا تھا۔ جب کہ وہ خود ٹھاکر کے بہترین دوست کو "مس" کرنے پر مجھ سے زیادہ متاسف تھی۔

لدھیانہ کے بجائے میں نے گھر جانا بہتر سمجھا اور ہوائی اڈے سے سیدھا رائے کوٹ آ گیا۔ جہاں پونم بے چینی سے میری منتظر تھی۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے شریمان جی؟" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑے شکایت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"تم سے بچ کر کہاں جا سکتا ہوں؟" میں نے اس کی جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے جواب دیا اور پونم کے گالوں پر حیا کی سرخی ناچ گئی۔ وہ دوپٹے کے پلو کو انگلی سے مروڑتی میری طرف دیکھے بغیر واپس بھاگ گئی۔

بستر پر گرتے ہی میں نیند کی آغوش میں سما گیا۔

○○○

میری آنکھ قدموں کی دھڑدھڑ کی آواز سے کھلی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فوج کا پورا بریگیڈ اندر گھس آیا ہو۔ میرا ذہن فوراً کل کے واقعات کی طرف پلٹا۔ یہاں ایسی کوئی مشتبہ چیز موجود نہیں تھی جو میری شناخت کروا سکے۔ نیچے صحن سے چیخ و پکار کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ میں نے بستر سے اٹھنے میں چند ہی سیکنڈ لگائے تھے اور ابھی بمشکل کھڑکی تک ہی پہنچا تھا کہ دروازہ ٹوٹ کر اندر گرا۔ دوسرے ہی لمحے کسی نے مجھے گریبان سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ پولیس کا کوئی تھانیدار تھا۔

کمرے میں تین چار سپاہی اس کے ساتھ ہی گھس آئے تھے۔ مجھے سیڑھیوں سے دھکیلتے ہوئے وہ صحن میں لے آئے جہاں گھر کے تمام مکینوں کے گرد پولیس کے جوان رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

نیند میری آنکھوں سے یوں اڑی جیسے میں کبھی سویا ہی نہ تھا۔ یہی حال گھر کے دوسرے

لوگوں کا تھا' ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ خوف اور دہشت کے مارے ان کے منہ سے کوئی بات بھی ٹھیک سے نہیں نکل پاتی تھی۔ ہاں ایک بابو جی ایسے ضرور تھے جو بالکل پرسکون نظر آ رہے تھے۔ میں نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی طور پر بھی حالات سے نمٹنے کے لئے تیار تھا لیکن صورت حال چونکہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس لئے مجھے فی الحال "خوفزدہ" ہی رہنا تھا۔

چھوٹے سے مکان سے پولیس جونکوں کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ منڈیروں پر بھی چوکنی بردار سپاہی رائفلیں تانے نظر آ رہے تھے۔ چند ہی منٹ میں اڑوس پڑوس کے مکانوں سے بھی روشنیاں باہر جھانکنے لگیں——— اس طوفان بدتمیزی نے ہمسایوں کو بھی جگا دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ ایک دفعہ پولیس کو دیکھ لینے کے بعد دوبارہ اس طرف دیکھنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

"کون ہو تم؟" اسی تھانیدار نے جو مجھے دھکے دیتا ہوا یہاں تک لایا تھا' خاموشی کا سکوت توڑتے ہوئے بڑے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

"میرا بیٹا ہے' مجھ سے بات کرو۔" میری بجائے بابو جی نے کڑکدار آواز سے تھانیدار کو اپنی طرف مخاطب کیا۔

ان کا لب و لہجہ میرے لئے اچنبھے کی بات تھی۔ آج تک میں نے انہیں کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموش رہا۔

"لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تمہارا صرف ایک بیٹا ہے۔" تھانیدار کے عقب میں کھڑے ایک سفید وردی پوش نے خفیہ پولیس کے مخصوص لہجے میں پرکاش پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اطلاعات کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہیں۔ زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں' اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔" بابو جی کی آواز یقیناً سارے محلے میں گونج رہی ہو گی۔

"مسٹر مہاویر پرشاد ہم تمہیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کر رہے ہیں۔" اسی تھانیدار نے بحث سے بچنے یا کسی مصلحت کے پیش نظر بابو جی سے کہا۔

"تم بہت بزدل ہو' مجھ سے بوڑھے آدمی کو پکڑنے کے لئے اتنے ہنگامے کی کیا ضرورت تھی؟" بابو جی کے طنز نے تھانیدار کو کاٹ کر رکھ دیا۔

"مسٹر پرشاد آپ ہمارے بجائے یہ بحث کورٹ میں کیجئے گا۔" اس نے یہ فقرہ مسکراتے ہوئے شاید ماحول کی تلخی کو کم کرنے کے لئے کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ بابو جی کوئی اور بات کریں۔ اس نے وارنٹ گرفتاری نکال کر انہیں دکھا

دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن اس بدتمیزی کے لئے تمہیں جواب دہی کرنا پڑے گی۔" انہوں نے پولیس کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پولیس کی اس طرح آمد نے ماحول خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔ گھر میں کوئی بھی بابوجی کی اس طرح ڈرامائی انداز میں گرفتاری کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا—— ماتا جی کی حالت تو خصوصاً" بہت خراب ہو رہی تھی۔ جب انہوں نے بابوجی کی گرفتاری کا سنا تو اچانک صدمے سے لڑکھڑا گئیں لیکن میں نے انہیں مضبوطی سے تھام لیا۔

بابو جی نے انہیں حوصلہ دیا۔ پونم ماتا جی کو میرے اشارے پر اندر کمرے میں لے گئی' پرکاش ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا اور مسکراتے ہوئے حوصلہ دینا چاہا۔ اس اثناء میں بابوجی ہمارے نزدیک آ گئے' انہوں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا لیا۔

"بیٹا تمہارے ہوتے ہوئے مجھے اس بات کا کبھی احساس نہیں ہوا کہ میرے بعد یہ گھر سونا رہے گا۔" انہوں نے ہم سے الگ ہوتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"بابو جی!" میں بمشکل اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ میرا گلا رندھ گیا۔ بابوجی کے بھرپور اعتماد نے مجھے خاصا جذباتی کر دیا تھا۔

"پرکاش اسے میرے سمان جانتا۔" انہوں نے اس مرتبہ پرکاش کو مخاطب کیا جس کی آنکھوں سے آنسو کسی بھی لمحے چھلک جانے کو تیار تھے۔

"چلئے۔" انہوں نے پولیس والوں کو مخاطب کیا۔

بابو جی آگے آگے چل دیئے' ان کے پیچھے پیچھے پولیس والوں کے ساتھ میں' پرکاش اور پونم بھی ایک جلوس کی شکل میں جا رہے تھے۔ پونم ماتا کو موسی جی کے حوالے کر کے خود باہر آ گئی تھی۔ دروازے کے باہر گلی کی نکڑ تک ہم بابو جی کے ساتھ گئے جہاں پولیس کی ایک وین ان کی منتظر تھی۔ اس اثناء میں انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کی چال میں ایک خودداری' ایک بھرپور اعتماد جھلکتا تھا۔ ایسا بھرپور اعتماد جو کسی عظیم مقصد کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں خود بخود در آتا ہے۔ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو اپنی مرضی کے مطابق غیر معینہ مدت تک نظربند رکھ سکتی تھی اور بھارتی جیلوں میں کئی ایسے نظربند بھی موجود تھے جو ۱۹۴۲ء سے آج تک نظربند چلے آ رہے تھے۔ خصوصاً" کسی کے مکمل باغی ثابت ہو جانے کے بعد تو دس پندرہ سال سے پہلے اس کی رہائی کے امکانات بہت کم ہوتے تھے اور یہ اتنی

لمبی مدت تھی کہ شاید ہی زندگی ان سے وفا کرتی۔ سانس کی وہ ڈور جو عرصے سے اٹکی ہوئی تھی اسے کوئی بھی جھٹکا چند ثانیوں میں توڑ سکتا تھا اور اس کے بعد شاید اس گھرانے کا تانا بانا بکھر کر رہ جاتا کیونکہ ایک بابو جی کی ذات ہی تھی جس نے اب تک سب کو ایک محور پر جمع کر رکھا تھا۔ ان کی موجودگی میں کبھی موسی جی کو اپنی بیوگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ گھر کا ہر فرد خود کو محفوظ جانتا تھا۔ لیکن اب کیا ہو گا——؟

بابو جی نے اپنی دانست میں تو مجھے اپنی جگہ دے کر بلا اپنے گلے سے اتار دی تھی لیکن میں کیا کر پاؤں گا!! یہی تھا وہ سوال جس نے مجھے فوراً" ڈسنا شروع کر دیا۔

وین کے نزدیک جا کر وہ مڑے۔ پونم پر شاید ان کی نظر اب پڑی تھی۔ انہوں نے پونم کو دیکھتے ہی اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ پونم "بابوجی" کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں سر جھکائے ان کے قریب کھڑے تھے۔ بابو جی نے مجھے اپنے نزدیک بلا کر اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"بیٹا تم میں حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مجھے یہ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن اس بات کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں کہ میں تمہیں "آشیرباد" دینے کے لئے تمہارے درمیان موجود رہوں گا لیکن....."

ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے تڑپ کر کہا۔

"بابو جی بھگوان کے لئے ایسے شبد منہ سے نہ نکالئے۔ ہم آپ کی رہائی کے لئے آخر تک لڑیں گے بابو جی——" میرے لہجے میں نجانے کیا بات تھی جو بابو جی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہم تینوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے وین میں سوار ہو گئے۔

مجھے علم تھا کہ پولیس والے بھی یہ نہیں جانتے کہ انہیں کہاں لے جایا جائے گا۔ اس لئے ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم پژمردہ واپس آ گئے۔ ماتا جی مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بمشکل میں نے انہیں دلاسہ دے کر چپ کروایا۔ صبح تک ہم سب نچلے کمرے میں بیٹھے رہے۔

ooo

صبح ہوتے ہی محلے داروں کی آمد شروع ہو گئی۔ بابو جی کے تعلقات عموماً" محلے داروں سے خوشگوار ہی رہا کرتے تھے۔ قریباً" سبھی محلے دار ان کی گرفتاری پر اظہار افسوس کر رہے تھے اور ان کی رہائی کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔ میں نے گھر کی فضا کو مزید سوگوار رکھنا مناسب نہ سمجھا اور پرکاش اور پونم کی مدد سے لوگوں کا شکریہ ادا کر کے واپس بھیج دیا—— بیشتر سب نے

بڑی بے دلی سے زہر مار کیا تھا۔۔۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی میں اور پرکاش پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

خوش قسمتی سے ابھی تک باجو جی تھانے میں موجود تھے۔ تھانیدار نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے ہمیں اجازت دے دی کہ ہم باجو جی کو ہاسٹہ کروا دیں۔ پرکاش کو میں نے ہاسٹہ لینے بھیج دیا اور خود حوالات کی سلاخوں کے نزدیک بیٹھ کر باجو جی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ بالکل نارمل دکھائی دے رہے تھے۔ پرکاش کے جاتے ہی وہ اچانک خاموش ہو گئے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ میں حیرانگی سے ان کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اچانک بولتے بولتے کہیں کھو گئے تھے۔ پھر سوچ کے گہرے ساگر سے ابھرتے ہوئے چند سیکنڈ بعد ہی انہوں نے اپنے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ تمام تھانے کے ملازمین اپنے اپنے کام میں مصروف تھے' کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ صرف تھانے میں اپنے کام سے آنے والے لوگ کبھی کبھی حوالات کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک نظر ہماری طرف دیکھ لیا کرتے۔ "پرکاش بیٹا ذرا نزدیک ہو جاؤ۔" باجو جی کی آہستہ اور پرسکون آواز سنائی دی۔ میں سلاخوں کے بالکل نزدیک ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔

"بیٹا وہ راز جو آج تک میں نے تمہاری ماتا کو نہیں بتایا تھا' آج تمہیں بتانے لگا ہوں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ مجھے تم پر اتنا اندھا وشواش کیوں ہے حالانکہ میری سیاسی تربیت اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی پر اس حد تک اعتماد کروں۔ بیٹا وقت بہت کم ہے اور باتیں بہت زیادہ' میں مختصر بات کروں گا۔ یہاں سب کی نظروں میں' میں ایک کمیونسٹ پارٹی کا ورکر ہوں۔ حقیقت میں میرا تعلق نکسل بازیوں سے ہے....."

"اور پولیس آپ کو امریک سنگھ والے معاملے میں شاید پکڑ کر لائی ہے۔" مجھے بھی وقت کی کمی کا احساس تھا اور اس سے مناسب موقع بھی کبھی میسر نہ آتا۔

"تم..... تمہیں یہ کیسے معلوم؟" باجو جی حیرت سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔

"باجو جی مجھے شما کر دیجئے۔۔۔ میں نے اس روز آپ کی خفیہ میٹنگ سن لی تھی اور جالندھر میں امریک سنگھ کے ہاتھوں پولیس کپتان کی موت کا نظارہ بھی کیا تھا۔"

"میں نہ کہتا تھا کہ ضرور تم میں کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے تم پر....." انہوں نے میری طرف اس مرتبہ تحسین اور حیرت بھری ملی جلی نظروں سے دیکھا۔

"باجو جی کاش میں آپ کو بتا سکتا' میں کتنا بیقرار ہوں۔ نکسلا بیڈز سے ملنے کے لئے۔۔۔ میں آپ کا مشن جاری رکھنا چاہتا ہوں باجو جی۔" میرے اعتماد بھرے لہجے نے ان کے چہرے پر

خوشی کی لہر دوڑا دی۔

بوڑھا کامریڈ چند لمحوں کے لئے پھر کہیں کھو گیا۔ اس مرتبہ جب وہ جاگا تو میرے سامنے باجو جی کی بجائے "نکسل باڑی" بیٹھا تھا۔

"پرکاش بیٹے میرا مقصد اتنا عظیم ہے کہ اس کے سامنے بڑی سے بڑی قربانی بھی ہیچ نظر آتی ہے۔ تم میری توقعات سے بڑھ کر ذہین ثابت ہوئے ہو۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ تمہیں بھی اس آگ میں جھونک دوں جس کا ایندھن میں خود بن چکا ہوں' لیکن میرا من گواہی دیتا ہے کہ تم عظیم انقلاب کے لئے بہت کچھ کر سکو گے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس راز کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھنا۔ میں تمہیں اپنی کونسل میں بھیج رہا ہوں اور خود مطمئن ہو کر جیل جا رہا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے "سنگھٹن" کو بہادر کامریڈ مہیا کر کے اپنا خلاء پورا ہی نہیں کیا بلکہ تحریک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔" ایک فون نمبر انہوں نے مجھے زبانی یاد کرنے کے لئے کہا۔ جہاں ایک مخصوص شخص کے بولنے پر ایک مخصوص "کوڈ ورڈ" دہرانے کے بعد مجھے اگلی ہدایات ملنی تھیں۔ بات مکمل کرنے کے بعد باجو جی نے سلاخوں میں سے دونوں ہاتھ باہر نکال کر میرا ہاتھ مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا۔

"پونم کے ساتھ یہ شاید بہت بڑی زیادتی ہو گی لیکن میری بیٹی مجھے شما کر دے گی۔" ان کے چہرے سے مسرت پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی۔

پرکاش واپس آ گیا تھا۔ ہم دونوں بھی اسے دیکھتے ہی اپنی دنیا میں واپس آ گئے۔

تھانے سے واپسی پر ہم نے کمیونسٹ پارٹی کے مقامی دفتر کا رخ کیا' جہاں ایک ہنگامی اجلاس باجو جی کی اچانک ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ ہمارا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کیا گیا۔

یہیں میں نے اس روز خفیہ میٹنگ میں نظر آنے والے دو تین چہرے بھی دیکھے۔ وہ لوگ باجو جی کی گرفتاری پر سخت احتجاج کر رہے تھے اور اس سلسلے میں ایک جلسے اور جلوس کا پروگرام بھی طے پا رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ "اس طرح تو خواہ مخواہ ہی۔ آئی۔ڈی کو اپنے پیچھے لگانے والی بات تھی۔" پھر اس ہنگامے کا فائدہ ہی کیا تھا؟ تین ماہ سے پہلے تو باجو جی کی واپسی ناممکن تھی۔۔۔ بھارتی آئین کی کوئی دفعہ ایسی نہیں جو انہیں رعایت دلا سکتی۔

میں اور پرکاش ایک کونے میں ان کے بھاشن سن رہے تھے۔ بالآخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سب لوگ مجھے باجو جی کے والد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ باجو جی نے انہیں بتایا تھا کہ میں ان کے ایک آنجہانی دوست کا بیٹا ہوں اور اکیلا ہونے کے کارن ان کے ہاں منتقل ہو گیا ہوں۔ میں نے ان

لوگوں سے درخواست کی کہ وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔ ان کے جلسے جلوس سے اور تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا البتہ باجوجی کی جیل یاترا ضرور لمبی ہو جائے گی۔ اس طرح تو ممکن ہے وہ تین ماہ بعد واپس گھر لوٹ آئیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہنگامے کرنے کے بجائے ایک کمیٹی ترتیب دے کر اعلیٰ افسران سے ملیں اور باجوجی کی پرامن سرگرمیوں پر گرفتاری کی وجہ دریافت کریں۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جائے تو بہتر ہے۔ ابھی تو کسی کو اس بات کا بھی علم نہیں کہ انہیں کس الزام کے تحت نظربند کیا گیا ہے۔ میری بات میں انہیں کچھ وزن محسوس ہوا اور تھوڑی سی ردوقد کے بعد وہ لوگ ایک کمیٹی ترتیب دینے پر آمادہ ہو گئے جس نے چندی گڑھ جاکر ہوم سیکرٹری سے ملاقات کرنا تھی۔

باجوجی گو کہ کمیونسٹ پارٹی کے مقامی لیڈر تھے لیکن رائے کوٹ میں موجود دوسری سیاسی جماعتوں کے ورکر بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ میں نے اس بات کو ان کے حق میں استعمال کرنے کے لئے دوسری جماعتوں کے چیدہ چیدہ ورکروں سے بھی ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو خالص انسانی نقطہ نظر سے دیکھیں اور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کریں۔ میری کوششوں سے بالآخر مختلف جماعتوں کے سات سرکردہ افراد کی کمیٹی ترتیب پا گئی جس نے ہوم سیکرٹری اور پولیس جنرل سے مل کر اس معاملے میں ہماری ہر ممکن مدد کا وعدہ کر لیا۔

یہاں سے مطمئن ہو کر قریباً" دوپہر کے وقت ہم گھر پہنچے۔ پرکاش پر میری شخصیت کا یہ پہلو آج پہلی مرتبہ کھلا تھا۔۔۔۔ میں نے جس چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کر یہ سارا معاملہ طے کیا تھا' اس پر وہ عش عش کر اٹھا۔ جب گھر پہنچ کر فہم سے نڈھال ماتا اور موسی جی کو اس نے میرے تازہ کارنامے سے آگاہ کیا تو ان کے پژمردہ چہرے کھل اٹھے اور باری باری مجھے گلے سے لگا کر انہوں نے میری درازیٔ عمر کی دعا مانگی۔ میری فراست پر قریباً" سارے ہی گھر والے میرے گرویدہ ہو رہے تھے۔۔۔۔ سالگ رام کو نجانے کیسے باجوجی کی گرفتاری کی اطلاع ملی تھی۔ وہ بھی تین چار گھنٹے کی چھٹی لے کر آ گیا تھا۔ جب پرکاش نے اسے صبح سے اب تک کی روداد بڑھا چڑھا کر بیان کی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ تنہائی میسر آتے ہی وہ مجھ سے گویا ہوا۔

"بھیا میں آپ کو اتنا بھی نہیں جانتا' جتنا باجوجی جانتے ہیں۔۔۔۔ جب مجھے ماتا جی سے پونم اور آپ کی نسبت کا علم ہوا تو میں خاموش رہا کہ ایک اجنبی کے ہاتھ اپنی بہن کا ہاتھ دے دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ بزرگوں کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوئے۔ آپ ہمارے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا بدلہ اس جنم میں تو شاید ہم میں سے کوئی نہ دے

پائے۔"

"چھوڑو یار تم کس چکر میں پڑ گئے' اپنی نوکری کی سناؤ۔" میں نے اس کی تقریر کو درمیان سے اچک لیا اور اسے اپنے مطلب کی طرف لے آیا۔

اس کے بعد تقریباً" دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے دوران سالگ رام نے مجھے ہوائی اڈے پر ہونے والی ایک ایک بات سے آگاہ کر دیا۔ وہ میرے بغیر پوچھے ہی مجھے سب کچھ بتاتا رہا اور میں بظاہر لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی معمولی سے معمولی بات کو بھی ذہن نشین کرتا چلا گیا۔

دراصل ہنگامی حالات کی وجہ سے افواج کی نقل و حرکت اتنی تیزی سے ہو رہی تھی اور مختلف تبدیلیاں اتنی جلدی عمل میں آ رہی تھیں کہ آج کی اطلاع دو تین روز پرانی دکھائی پڑتی تھی۔ میرے لئے اپنے ٹارگٹ سے مسلسل "ان ٹچ" رہنا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی تازہ ترین معلومات کی جستجو میں رہتا تھا' جن کا ایک بہترین ذریعہ کارپورل سالگ رام اور فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار تھے۔ بہت سی ایسی باتیں جنہیں جاننے کے لئے جاسوس کو سر دھڑ کی بازی لگانا پڑتی تھی اور جنہیں دوسرے ایجنٹ جان جاکھوں کے بعد جان پاتے تھے وہ مجھے "بونس" میں مل جاتی تھیں۔ ممکن ہے کسی حد تک اس بات میں میری تربیت اور چالاکی کو دخل بھی ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کے بغیر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ ایسے مواقع پر میرا دل بے اختیار جذبہ تشکر سے بھر جاتا اور میرا ایمان اس پر اور پختہ ہونے لگتا کہ۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والوں کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

نیٹو کو باجوجی سے کچھ زیادہ ہی انس تھا۔ وہ بے چارہ خاصا پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بھی بہلایا اور وعدہ لیا کہ وہ کل سے ضرور سکول جائے گا۔ ماتا اور موسی جی اب کافی مطمئن ہو گئی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے ہمارے ساتھ کھانا کھا لیا۔ سالگ رام کی چھٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے گرمجوشی سے بغلگیر ہو کر چلا گیا۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی: ایسے خطرناک حالات میں سے زیادہ "قوم" کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہو' میں خود اس سے وقتاً" فوقتاً" ملتا رہوں گا!

جواب میں وہ قوم کو بڑی نستعلیق قسم کی گالی سے نواز کر مسکراتا ہوا بس میں سوار ہو گیا جو اسے ہوائی اڈے تک لے جا رہی تھی۔

شام تک گھر والے قریباً" نارمل ہو چکے تھے۔ پرکاش بھی میرے کہنے پر لدھیانہ چلا گیا۔ میں رائے کوٹ ہی رہ گیا کیونکہ مجھے "رہائی کمیٹی" کے ساتھ اگلے روز چندی گڑھ جانا تھا۔ پونم کو میں نے اس اثناء میں سب کچھ سمجھا دیا تھا اور اس سے وچن لے لیا تھا کہ وہ نہ تو خود پریشان نظر

آئے گی اور نہ ہی ماتا جی' موسی اور نیٹو کو غمگین ہونے دے گی۔ رات تک میں نے گھر کی نفسیاتی فضا اتنی بدل دی کہ وہ لوگ بابوجی کی گرفتاری کو معمول کے واقعات کا ہی ایک حصہ سمجھنے لگے تھے۔

ooo

رات کافی دیر گئے تک پونم میرے کمرے میں موجود رہی۔ ہم دونوں سب کچھ بھول کر مستقبل کے سنہرے خوابوں کے تانے بانے بنتے رہے۔ پونم ان خاکوں میں ایسے ایسے حسین رنگ بھرتی تھی کہ ایک دفعہ تو سب کچھ بھول کر ان پر یقین کرنے کو جی چاہنے لگتا تھا لیکن حقائق کی تلخیاں مجھے ہر دفعہ ایسے حسین مواقع پر اپنی دنیا میں واپس لے آتیں اور مجھے یہ سب کچھ کسی اور ہی عالم کا حصہ دکھائی دینے لگتا--- پونم' اس کے قرب کی مہک' مستقبل کے سنہرے سپنے' سب کچھ راکھ کی طرح یوں اڑ جاتے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ میں حقائق کی دنیا میں لوٹ آتا جہاں میرے پیارے ملک کی لاکھوں سہاگنیں پونم کا روپ دھار کر مجھے پوچھنے لگتیں کہ میں نے انہیں بھلا تو نہیں دیا؟

جاسوس اپنے ملک کی آنکھیں ہوتا ہے اور جن کی سرحدوں کی نگہبان آنکھیں جاگتی ہوں اس کے مکینوں کو ہی سکھ کی نیند سونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں ان کے اس سوال کا جواب اپنے ضمیر سے مانگتا تو ایک طمانیت اور قلبی اطمینان کی کیفیت مجھ پر چھا جاتی۔ میرا ضمیر مطمئن تھا' میں نے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا تھا--- میرے دیس کے باسی تو میرے وجود کا حصہ بن گئے تھے اور اپنے ایمان کی حد تک میں ان کی حفاظت کرتا تھا۔ میرے جیتے جی ان پر آنچ آجائے' اس بات کا تصور ہی میرے لئے اندوہناک تھا۔

اگلے روز میں اور محکمے کے دوسرے چھ سرکردہ افراد چندی گڑھ روانہ ہو گئے جہاں دوسرے روز بمشکل ہمیں ہوم سیکرٹری سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ کافی دیر تک سرکھپانے کے بعد اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ اگر بابوجی کے خلاف ایک زیر تفتیش اطلاع' جو اس نے ہمیں بتانے سے انکار کر دیا تھا صحیح ثابت نہ ہوئی تو انہیں تین ماہ کے بعد رہا کر دیا جائے گا لیکن تین ماہ سے پہلے ان کی رہائی ناممکن ہے۔ وہ زیر تفتیش اطلاع کیا تھی' مجھے اس کا علم پہلے ہی تھا لیکن کمیٹی کے دوسرے ارکان نے بالآخر سنٹرل انٹیلی جنس بیورو سے رابطہ قائم کر کے اس کا پتہ لگوا لیا--- سی۔ آئی۔ بی کے مطابق بابوجی کا تعلق انتہا پسند کمنسل باڑیوں سے ہے لیکن اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ان کے خلاف ابھی تک کوئی بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ ان نے نکسلا ہیڈ ہونے کی وجہ سے وہیں کمیٹی کے ارکان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک نے ان کی حمایت سے

بالکل انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ کسی انٹیلی جنس کے ٹاؤٹ نے محض اپنے نمبر بنانے کے لئے بابوجی کے خلاف جھوٹی اطلاع دے دی ہے جو تفتیش کے بعد بھی کبھی سچی ثابت نہیں ہو گی تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

دو روز کے بعد ہم رائے کوٹ واپس آ گئے اور میں نے گھر والوں کو یقین دلا دیا کہ بابوجی تین ماہ کے بعد رہا ہو جائیں گے۔ انہیں لدھیانہ جیل میں رکھنے کی ہماری درخواست ہوم سیکرٹری نے منظور کر لی تھی اور ہفتے میں دو مرتبہ ملاقات کی اجازت بھی مل گئی تھی جو ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے بھارتی اعلیٰ انتظامیہ کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور مجھے حیرانگی اس بات کی تھی کہ آخر یہ نظام چل رہا ہے تو کیسے؟ انتظامیہ کا کوئی اہل کار ایسا نہیں تھا جس کے متعلق ایماندار ہونے کی شہادت دی جا سکے۔ حتیٰ کہ انٹیلی جنس والوں نے محض دو سو روپے لے کر انتہائی خفیہ فائل کی نقل ہمیں فراہم کر دی تھی۔ تھوڑی تنخواہیں' بے تحاشہ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بیروزگاری نے بھارتی عوام کا اخلاقی دیوالیہ نکال رکھا تھا۔ ان کا ایمان صرف اور صرف پیسہ تھا چاہے وہ کسی بھی طرح حاصل ہو۔

ooo

یہاں سے مطمئن ہو کر اب میں لدھیانہ جا رہا تھا جہاں مجھے بابوجی کے دوستوں سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ میری صلاحیتوں کا امتحان اصل میں اب ہونے والا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں نکسل باڑیوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہوں یا وہ میرے ذریعے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ لدھیانہ میں' میں اور پونم اکٹھے ہی پہنچے تھے۔ وہ تو کالج چلی گئی' جب کہ میں اپنے مشن پر!

ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے میں نے بابوجی والا نمبر دھڑکتے دل سے گھمایا۔ دوسری طرف سے فون اٹھانے والے نے "ہیلو" کہا اور میں نے اسے وہ نام بتا دیا جو بابوجی نے مجھے بتایا تھا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد دوسری طرف سے مجھے "ہولڈ" کرنے کے لئے کہا گیا۔ پھر ایک دوسری آواز فون پر سنائی دی۔ دریافت کرنے پر میں نے وہاں بھی وہی نام دہرایا۔ اس مرتبہ جواب صحیح موصول ہوا اور ہم نے اپنے کوڈ الفاظ کا تبادلہ کر لیا۔ فون موصول کرنے والے نے وہ جگہ دریافت کی جہاں سے میں بول رہا تھا اور مجھے اس کے قریب ہی ایک ہوٹل میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ آنے والے نے اپنی ایک مخصوص نشانی بھی بتا دی تھی۔

قریباً" بیس منٹ بعد ایک سکھ نوجوان کو میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے رک کر ایک نظر ہال میں بیٹھے لوگوں پر ڈالی اور سیدھا میری میز کی طرف آ گیا۔ نشانی کے مطابق

ایک سرخ پھول اس نے نیلے رنگ کے کوٹ میں ٹانک رکھا تھا اور سر پر پیلے رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

"ست سری اکال!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

جواب میں اس نے بھی "فتح" بلائی اور دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے جان بوجھ کر ہال کے ایک کونے میں رکھی میز منتخب کی تھی تاکہ ہم اطمینان سے گفتگو کر سکیں۔ آنے والا گو کہ سکھ تھا لیکن اس کے ساتھ چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد مجھے اس کے "سکھ" ہونے پر شک گزرنے لگا۔ وہ میری توقعات سے بڑھ کر ذہین ثابت ہوا تھا۔ بہت نپی تلی گفتگو کر رہا تھا اور خاصا سلجھا ہوا جان پڑتا تھا۔

نووارد نے اپنا نام منوہر سنگھ بتایا تھا۔ اس نے قریباً ایک گھنٹہ تک میرا انٹرویو لیا۔ میرا ماضی، حال اور مستقبل کے ارادے، تعلیم، تجربہ، مطالعہ، محبتیں، نفرتیں، کون سا ایسا موضوع تھا جس پر ہم نے بحث نہیں کی تھی۔ بعض دفعہ تو مجھے اس کے سوالات سے الجھن ہونے لگتی تھی لیکن جس تنظیم سے میرا واسطہ پڑنے والا تھا اس میں شمولیت کے بھی بہرحال کچھ تقاضے تھے جنہیں پورا کرنا ضروری تھا۔

قریباً آدھ گھنٹہ بعد جب ہم الگ ہوئے تو اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے "کامریڈ" کہہ کر الوداع کیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے مطمئن ہو کر جا رہا ہے۔ میں نے اسے یہ اطلاع دے دی تھی کہ مجھے پستول اور رائفل چلانا آتا ہے۔ اس نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ اگلے چند روز میں وہ لوگ خود مجھ سے رابطہ قائم کریں گے۔ یہاں سے فراغت پا کر میں پرکاش کے پاس آ گیا۔ جہاں سدرشنا بہن جی کی گرفتاری کا افسوس کرنے آئی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد پونم بھی آ گئی کیونکہ ہم نے اکٹھے ہی واپس رائے کوٹ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

ooo

سوامی دیانند کے منصب ہوتے ہی مقامی اخبارات کو اپنا غبار نکالنے کا موقعہ مل گیا۔ اس سے پہلے تو کسی کو اس کے خلاف لکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن اب تمام اخبارات دل کھول کر اس کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ پانچ پانچ سال پہلے ہونے والے پراسرار قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے لیکن اتنی ساکھ بہرحال اس کی قائم تھی کہ ابھی تک پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ سوامی جی کی سرگرمیاں اب آشرم تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ "کھلے درشن دیدار" کم ہی دیا کرتے تھے۔

وہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہندو کی دیرینہ سازشیں رنگ لائی تھیں اور پورا پاکستان کے معصوم بنگالی ہندو چلتر بازیوں کا شکار ہو کر بھارتی سرحدوں کا رخ کر رہے تھے۔ "ایکتا" اور "اہنسا" کا لبادہ اوڑھ کر خون آشام بھیڑیوں نے ان کے ذہنوں پر نقب لگائی اور باہمی محبت اور اعتماد کو جس کی بنیاد پر اتحاد کی یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی، اس میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ جب ایک دوسرے پر اعتماد کی مضبوط بنیادیں ہلیں تو محبت کے ایوانوں میں جیسے زلزلہ طاری ہو گیا۔ تب اپنوں نے یوں آنکھیں پھیریں جیسے وہ کبھی شناسا ہی نہ تھے، جیسے انہوں نے کبھی ایک دوسرے کو چاہا نہ تھا۔ فلک نے ایسا نظارہ کب دیکھا تھا، دردمندوں کے کلیجے پھٹنے لگے، چاہتوں نے رسوائیوں کا روپ دھار لیا۔ اچکے جو چودھری بن بیٹھے تھے انہوں نے محبتوں میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ نقب زنوں نے اس طور سے سیدھے سادے مانجھیوں کو ورغلایا کہ الامان! الحفیظ! ان کے جھوٹ سے ایک عالم نے پناہ مانگی، لیکن وہ مکمل ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ کے محاذ پر سرگرم عمل رہے۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی تمامتر توانائیاں فرسودہ پراپیگنڈے کے لئے وقف کر دی تھیں۔ ستم تو یہ تھا کہ لٹیرے ہی راہبری کے بھی ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ سچائی پہ سکتہ طاری ہو گیا۔ حقیقت حال سے باخبر تھے ہی کتنے ——؟ اور جو تھے ان کی بساط ہی کیا تھی۔ دشمن نے ایسا مکروہ جال پھیلایا تھا کہ وہ بے چارے اپنی صفائیوں میں ہی الجھے رہے اور زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔

مہاسبھائی لٹیرے بھگتی باہنی کے روپ میں مشرقی پاکستان کی مقدس خاک کو پامال کرنے لگے۔ وہ جہاں جہاں گئے دلوں میں زہر گھولتے گئے۔ انہوں نے جھوٹ کو مکر و فریب کے ایسے ایسے خوبصورت لبادے پہنا کر سچ کے روپ میں پیش کیا کہ عالمی رائے عامہ بھی گمراہ ہونے لگی۔ بھارتی سفارتی سرگرمیاں رنگ لائیں اور ہمارے سفارت کار منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔

اندرون ملک عوام کو پاکستان دشمنی پر آمادہ کرنے کے لئے مہاسبھائی ذہنیت اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا رہی تھی اور ہمارے ملک میں جب مختلف نوعیت کے فکری محاذ جانے کن کن ازموں میں انسانیت کی بقا کا راز بتانے میں مصروف تھے۔ عین انہی دنوں بھارت میں مہاسبھائی لفنڈوں نے "اکھنڈ بھارت" اور "بھارت درش" کی ایسی آگ لگائی کہ "کرانتی دل" وجود میں آ گیا جس کے رضاکار اپنا تن من دھن پاکستان کے خلاف تج دینے کا وچن دے کر "کرانتی دل" میں آتے تھے۔ وہ اس معاہدے پر اپنے خون سے دستخط کرتے تھے۔

بھارتی مسخرا جوئے کھرجی دن رات کی شوٹنگ کے بعد صرف ایک ماہ میں "جوئے بنگلہ دیش" نامی فلم بنا کر لے آیا تھا۔ اس فلم نے وہ کام کیا جو بھارت کے سارے ذرائع ابلاغ بھی مل کر کبھی نہ

کر پاتے۔ جہاں جہاں یہ فلم ریلیز ہوئی' عوام کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت کی آگ لگاتی گئی۔ جوئے کمرجی جو چانکیہ کا صحیح معنوں میں چیلا اور "منوجی سمرتی" کا پجاری ہے' نے اس فلم کی تمام آمدنی "شرنارتھیوں" کے لئے دینے کا اعلان کر دیا۔ ساری بھارتی فلم انڈسٹری نے پاکستان دشمنی کا محاذ سنبھال لیا۔ جگہ جگہ سنیچ شو منعقد کئے گئے اور عوام کو ورغلا کر ان کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا گیا۔

یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ بھارتی عوام کے ۶۵ء کے بعد جنگ سے متعلق جو جذبات تھے وہ بھارتی سرکار سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ اس طرح کی حرکتیں کر کے جہاں ایک طرف عوام کی ہمدردیاں حاصل کر رہے تھے وہیں "مظلوموں" کی امداد کے لئے انہیں کمربستہ کر کے ان کا مورال بھی بلند کرنے میں کوشاں تھے۔ جنتا نے شرنارتھیوں کے لئے مخصوص فنڈز میں جتنا روپیہ دیا' سرکار نے وہ کمتی باہنی اور مہاسبھائی غنڈوں میں بانٹ کر ان کو تربیت دی اور مشرقی پاکستان میں دھکیل دیا۔

اندرون ملک اور بیرون ملک تو بھارتی پروپیگنڈا یہ زہر گھول رہا تھا جب کہ پاکستان کے خلاف ان کی ثقافتی یلغار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور مسلمانوں کے نام رکھنے والے ہندو ذہنیت کے شاعر اور ادیب آکاش وانی اور آل انڈیا ریڈیو سے بڑے خوبصورت ڈھنگ سے میٹھا زہر اگل رہے تھے۔ ان تمام حربوں کے جواب میں ہمارے ذرائع ابلاغ کو سکتہ ہو گیا تھا۔ سیاسی زعما بندر بانٹ میں لگے تھے اور حکومتی ایوانوں میں جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی۔ برسوں سے اس سنہری موقعے کے منتظر گندم نما جو فروش قبروں سے اٹھ اٹھ کر سیاسی میدانوں کا رخ کر رہے تھے۔ ان کی سیاست کاریوں نے وہ وہ گل کھلائے کہ ایک نظریے پر اعتماد رکھنے والے' ایک تھالی میں کھانے والے اور ایک نظام حیات کے پیروکار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

پونم اور سدرشنا اپنے کالج کی طرف سے شرنارتھیوں کے لئے دان اکٹھا کر رہی تھیں۔ مجھے بھی بادل نخواستہ ان کی ضد پر ان کے ساتھ خصوصی ٹکٹوں پر "جوئے بنگلہ دیش" دیکھنے جانا پڑا۔ اس بے ہودہ فلم کو دیکھنا میری زندگی کا شاید تلخ ترین تجربہ تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا وقت جس اذیت ناک کرب کے عالم میں کٹا' وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ سینما ہال میں فلم کے دوران Pakistan Crush کے نعرے مسلسل گونجتے رہے اور میں خون کے گھونٹ پئے صبر و شکر سے بیٹھا رہا--- اپنے کھولتے ہوئے دل و دماغ پر قابو پاتے ہوئے جس اعصابی کھچاؤ سے میں دوچار ہوا' اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔

جب ہم فلم دیکھ کر باہر نکلے تو میرے تن بدن میں آگ لگی تھی۔ فلم سے ہم سیدھے لاری

اڈے گئے جہاں سے میں اور پونم رائے کوٹ چلے گئے اور سارے راستے میں اس کی باتوں کا جواب صرف "ہوں" "ہاں" میں ہی دیتا رہا--- پونم بھی حیران تھی کہ مجھے آخر کیا ہو گیا ہے؟

"خواہ مخواہ آپ کا موڈ بھی خراب کیا۔" اس نے بس سے اترتے ہوئے کہا۔

"ارے کس بات سے؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"فلم دیکھ کر۔"

"آہ! کاش تم میرے موڈ کو جان سکتیں۔ پونم! تمہارے ساتھ صرف بیٹھ کر صرف تمہیں دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے....."

"اچھا اچھا بس کیجئے۔" اس نے میری بات کو مسکراتے ہوئے کاٹ دیا۔

○○○

اگلے روز میں نے ایک مرتبہ پھر بابوجی کے دوستوں سے "فردا" ملاقات کی اور دوپہر کے وقت سالگ رام سے ملنے ہوائی اڈے چلا گیا۔ بظاہر تو میں "بے بابوجی کے متعلق ہونے والی پراگرس رپورٹ دینے گیا تھا لیکن اصل میں مجھے سالگ رام کی اس روز والی گفتگو یہاں لے آئی تھی۔ سالگ رام مجھے اپنی ایئرمین کنٹین میں لے گیا' جہاں اس نے اپنے دوسرے کارپورل ساتھیوں سے بھی میرا تعارف کرایا۔ یہاں سوائے ہوائی اڈے کے اور کوئی گفتگو سننے کو نہیں ملنی تھی۔ میری آنکھیں تو سالگ رام پر لگی تھیں جب کہ میرے کان وہاں موجود لوگوں کی گفتگو کو ذہن میں منتقل کر رہے تھے۔ ایک دو باتیں تو چونکا دینے والی تھیں۔

خصوصاً" جب مجھے ایک خاص جگہ ہونے والی ڈویلپمنٹ کا علم ہوا تو میں چونک پڑا۔ اس سے متعلق آگہی حاصل کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہاں خود جایا جائے لیکن حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد بظاہر داخلے کی کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی تھی۔

جیسے ہی میری فراہم کردہ اطلاعات محفوظ ہاتھوں تک پہنچیں۔ فوراً" وہاں داخلے کا حکم ملا لیکن اکیلے آدمی کے لئے یہ چونکہ ناممکن تھا' اس لئے اس مرتبہ پھر میرے ساتھ جسونت کو بھیجا گیا۔

ہماری ملاقات اس مرتبہ جگراؤں کے ایک تھرڈ کلاس ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں وہ پچھلے دو تین روز سے ایک مشن کے سلسلے میں سرگرم عمل تھا۔ اتفاق سے جسونت میرے اردگرد ہی کام کر رہا تھا اور وہ پروجیکٹ جس کے متعلق مجھے اطلاعات حاصل ہوئی تھیں' جسونت کا ہی ٹارگٹ تھا--- لیکن اپنی بہترین صلاحیتوں کے باوجود اسے ابھی تک کوئی اہم اطلاعات موصول نہیں

ہوئی تھیں۔ اس نے یہاں ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے رکھا تھا جسے میں ہمیشہ کی طرح سنتے ہی عش عش کر اٹھا۔

جسونت نے اس ٹارگٹ سے متعلق ایک نائیک اور ایک سپاہی کو اپنے جال میں پھنسا رکھا تھا۔۔۔۔ یہ دونوں ایک جگہ جوا کھیلتے ہوئے جسونت کی نظروں میں آ گئے تھے اور ایسے لوگوں کا وہ پہلے ہی سے متلاشی تھا۔ پہلے نائیک اس کے ہتھے چڑھا۔

کسی نہ کسی طرح جسونت نے اس ٹھکانے تک رسائی بھی حاصل کر لی تھی جہاں اس کی اطلاعات کے مطابق چھوٹے رینک کے فوجی اپنی رم کی بوتلیں جو انہیں خاصے کم نرخوں پر یونٹ سے مل جاتی تھیں' زیادہ قیمت دے کر فروخت کیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ اس طرح حاصل ہونے والی آمدن کو وہ اسی ڈیرے پر جوئے کی بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔ یہ ڈیرہ اصل میں شراب کا ایک ٹھیکہ تھا جو باقاعدہ اجازت نامے کے تحت قائم ہوا تھا۔ ایسے ٹھیکے پنجاب کے دیہاتوں اور شہروں میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں' جہاں سرکاری اہتمام سے شراب خانہ خراب اڑائی جاتی ہے اور اس کی حدود۔۔۔۔ جو عموماً" چائے کے ایک کپ سائل جتنی بھی نہیں ہوتی کے اندر غل غپاڑہ مچانے کی کھلی چھٹی ہے۔ زیادہ تعداد ایسے ٹھیکوں کی ہے جہاں شراب سے متعلقہ دوسرے لوازمات کا بھی بندوبست موجود ہوتا ہے تاکہ یہاں آنے والوں کو کسی قسم کی تشنگی کا احساس باقی نہ رہے۔

شراب کے ان ٹھیکوں پر بظاہر تو وہی شراب کی بوتلیں سجی دکھائی دیتی ہیں جو بھارتی لیبارٹریوں کی تیار کردہ ہوتی ہیں لیکن اندر خانے زیادہ تر گھٹیا قسم کی اور دیہاتی علاقوں میں غیر قانونی طور پر نکالی گئی شراب ہی بکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز بھارت کے اخبارات میں "زہریلی شراب" پینے سے واقع ہونے والی کسی نہ کسی "مرتیو" کا ذکر پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

جسونت کسی ایسے ٹھیکے کو کیسے نظرانداز کر سکتا تھا جہاں اس کے ٹارگٹ سے متعلقہ لوگوں کا آنا جانا رہا ہو۔ یہیں اس کی جہاندیدہ نظروں نے نائیک اندر موہن کو تاڑا تھا جو رم کی بوتل فروخت کرنے سے حاصل شدہ آمدنی کو جوئے کی نذر کر کے اب للچائی ہوئی نظروں سے دوسروں کے بھرے ہوئے گلاس دیکھ رہا تھا۔ ایسے مواقع پر فوجی لوگ وردی پہن کر آنے سے تو رہے لیکن جاسوس کی تربیت میں پہلا مرحلہ اسے اپنے پیشے سے متعلق افراد کی جان پہچان سے متعلق ہوتا ہے۔ اندر موہن کو اس کی وضع قطع اور چال ڈھال سے ہی جسونت نے پہچانا تھا۔

○○○

یہ سیپٹمبر کی شام تھی۔۔۔۔ اگلے روز چونکہ اندر موہن کو چھٹی تھی اس لئے وہ جسونت کے

ساتھ جگراؤں سے باہر ایک ویران سی جگہ پر جہاں کسی مماثے نے تیزی سے بڑھتی ہوئی جن سنکھیا کے پیش نظر مستقبل کے لئے سرمایہ کاری کرتے ہوئے دس پندرہ کوارٹر بنا ڈالے تھے' چلا آیا تھا۔ نائیک اندر موہن خود بھی کہاں آیا تھا یہ تو اس بوتل کا کمال تھا جسے جسونت نے بغل میں دبا رکھا تھا۔

رات اندر موہن نے جسونت کے ساتھ ہی گزاری اور صبح تک وہ پکے یار بن چکے تھے کیونکہ جسونت بھی "اتفاق" سے اندر موہن کی طرح بہار کا ہی رہنے والا تھا۔ اور یہ بھی "اتفاق" ہی تھا کہ دونوں کی گوت بھی ایک ہی تھی۔ کافی دور جا کر ان کے بزرگوں کا سلسلہ بھی آپس میں مل جاتا تھا۔ جسونت نے اسے بتایا تھا کہ وہ مزدوری کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت "دھندا" بھی کر لیتا ہے یعنی کبھی کبھی دیہاتوں سے شراب وغیرہ لا کر یہاں فروخت کر دیتا ہے۔ اس لئے تو وہ اتنے ٹھاٹ سے زندگی گزار رہا ہے۔

نائیک اندر موہن ساری رات شراب پیتا رہا اور اپنی نوکری پر لعنت بھیجتا رہا۔ چونکہ وہ دونوں ہم ذات تھے اور ایک ہی صوبے کے ایک ہی ضلعے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے جاتے سمے اس کی جیب میں جسونت نے زبردستی سو روپے بھی ڈال دیئے تھے جو اگلے ہی روز اندر موہن نے جوئے کی نذر کر دیئے تھے۔ نائیک اندر موہن اپنے ایک ضلع وال ساتھی کو بھی جو اس کی یونٹ کا سپاہی تھا' جسونت کے پاس لے آیا۔ اب تینوں مل کر رنگ رلیاں مناتے تھے۔ جب میری ملاقات اس نے نائیک اندر موہن اور سپاہی نیک رام سے کروائی تو دونوں اس کے قریباً" دو ہزار روپے کے مقروض تھے اور اس کے سامنے اس کے زر خرید غلام نظر آتے تھے۔

"میرا بھائی ہے رشتے کا۔۔۔۔ سسروں کو پنجاب میں نجانے کیا دکھائی دیوے ہے جو سب ادھر ہی بھاگے چلے آ رہے ہیں۔" اس نے دونوں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

دونوں چیلے جو شراب کے نشے میں ڈگمگا رہے تھے مجھے جسونت کا بھائی جان کر میرے پاؤں میں بچھے جا رہے تھے۔ بمشکل میں نے انہیں خود سے الگ کیا ورنہ وہ تو مجھ پر "قربان" ہونے کو تلے نظر آتے تھے۔

"بڑے سدھائے ہوئے ہیں۔" میں نے اپنی مخصوص ذہن میں جسونت سے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیا ہے بھگوان کی۔" اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے انکساری سے جھک کر کہا۔ مجھے غیر مانوس زبان بولتے دیکھ کر دونوں گدھوں نے نشے کی ترنگ میں مجھے "اوتار" سمجھ لیا اور میرے سامنے ماتھا رگڑنے لگے۔ ہنستے ہنستے میں بے حال ہوا جاتا تھا' بمشکل سمجھا بجھا کر جسونت انہیں اصلی

حالت میں واپس لایا۔ وہ کمبخت تو کبھی نہ اٹھتے لیکن جسونت نے ان سے کہہ دیا تھا کہ "ایشور غصے ہو جائیں گے۔"

"گرو جی آج ہی کیوں نہ قسمت آزمائی کریں۔" میں نے جسونت کو رائے پیش کی۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا' پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد "او کے" کے مختصر سے الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھرکے۔

ہم دونوں ان گدھوں کو وہیں چھوڑ کر کوارٹر سے باہر آ گئے تھے جہاں دور دور تک کسی شے کا نام و نشان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی سڑک پر سے کوئی لاری ضرور گزر جاتی تھی۔

نائیک اندر موہن کی کوارٹر گارڈ ڈیوٹی تھی۔ اسے سزایافتہ فوجیوں کے سیلوں پر پہرہ دینا ہوتا تھا اور رات کو آٹھ بجے اس کی ڈیوٹی شروع ہونی تھی۔ اس دوران میں لوز جسونت نے دونوں کی مدد سے اس بٹالین ہیڈ کوارٹر کا اپنے ذہن کی مدد سے نقشہ تیار کر لیا تھا۔ اندازاً اسے معلوم تھا کہ سزایافتہ فوجیوں کے سیل کس طرف ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ جسونت کو آج رات کے "پاس ورڈ" کا علم تھا اور ہم نے انڈین فوج کی وردیاں زیب تن کر لی تھیں اور کوئی زاد راہ ہمارے پاس نہیں تھا۔

یہ آگ میں جان بوجھ کر چھلانگ لگانے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا---؟ اپنی جان سے ہولی کھیلنے کی اجازت کسی جاسوس کو نہیں دی جاتی لیکن ہمارا تعلق کسی لاذہبی ملک سے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے بے سروسامانی کے عالم میں بھی اللہ کی خصوصی مدد سے وہ وہ کام کر دکھائے تھے جو شاید دنیا کی بڑی بڑی جاسوسی ایجنسیوں کے ایجنٹ جدید ترین آلات جاسوسی سے لیس ہو کر بھی انجام نہ دے پائیں۔

○○○

دونوں فوجیوں کے گلاسوں میں جسونت نے بے ہوشی طاری کرنے والا سفوف اتنی پھرتی سے منتقل کیا کہ مجھے بھی کانوں کان خبر نہ ہو پائی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ دونوں خراٹے لینے لگے۔ نائیک کی وردی جسونت نے پہن لی اور سپاہی کی میں نے۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر پر ہم قریباً آٹھ بجے ہی پہنچے تھے کیونکہ اس کے بعد داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ جن لوگوں کی وردیاں ہم نے پہن رکھی تھیں انہوں نے اسلحہ اپنے یونٹ سے حاصل کرنا تھا لیکن ہم اتنے نتھے بھی نہیں تھے۔ اپنے آٹومیٹک پستول جن کی اہمیت اس ماحول میں نہ ہونے کے برابر تھی' ہم نے لباسوں میں چھپا رکھے تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چلتے ہوئے ان فوجیوں کے ساتھ

اندر داخل ہو گئے جو ہماری طرح بڑی جلدی میں دکھائی دیتے تھے۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر کھڑے ملٹری پولیس کے مسلح گارڈز نے ایک سرسری سی نظر ہم پر بھی ڈالی--- اس ہیڈ کوارٹر میں بھانت بھانت کے لوگ اکٹھے کئے گئے تھے کیونکہ یہاں پر کچھ خاص نوعیت کی مشقیں کی جا رہی تھیں۔ جس یونٹ کی وردیاں ہم نے پہن رکھی تھیں اس کے جوان بھی یہاں دکھائی دے رہے تھے لیکن ہم نے اس بات کی خصوصی احتیاط برتی کہ ہم ان کے نزدیک تک نہ پھٹکیں۔

مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ہم ایک نسبتاً ویران علاقے کی طرف جہاں درختوں کی بہتات نظر آ رہی تھی' گھوم گئے۔ یہاں اکا دکا فوجی ہی نظر آ رہے تھے کیونکہ یہ ڈیوٹیوں کی تبدیلیوں کا وقت تھا۔ اس لئے ہر کوئی افراتفری میں دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارا رخ درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے بنے دفاتر کی طرف تھا جہاں مختلف نوعیت کی فائلیں رکھی تھیں۔ یہ دفاتر تین بجے کے بعد بند ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد اس طرف کسی کا آنا جانا بھی کم ہو جاتا تھا۔

یہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں دو جگہ پوچھنے پر "پاس ورڈ" بتانا پڑا تھا۔ ہنگامی صورت حال کی وجہ سے لائٹ آف تھی' صرف سرچ لائیٹ کبھی کبھی روشن کر کے گھمائی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس ہیڈ کوارٹر کے چاروں اطراف "سرچنگ لائٹ" بنے ہوئے تھے لیکن ہم نے وہ سب کچھ بھلا دیا تھا۔ قریباً دو ڈھائی گھنٹے یہاں چھپے رہے۔

یہ دفاتر ایک بلاک کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ پھر درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم ان کے نزدیک پہنچ گئے اور اب جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ اس اثناء میں کسی آمد، خطرے کے پیش نظر فرار ہونے کے لئے راستے کا بھی انتخاب کر لیا تھا۔ رات کے وقت ایسے علاقے عام فوجیوں کے لئے بھی ممنوع ہوتے ہیں اور بغیر ڈیوٹی کے ان جگہوں کے نزدیک کسی کا پھٹکنا بھی ممنوع ہوتا ہے۔

ہم دونوں دبے پاؤں--- آہستہ آہستہ اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنے ہدف سے چند گز کے فاصلے پر اچانک ہم دونوں زمین بوس ہو گئے کیونکہ ایک سائے کو ہم نے دفاتر والے بلاک کے ایک کونے سے نمودار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میرا ہاتھ پھرتی سے اپنی جیب کی طرف گیا اور دوسرے ہی لمحے ننھے سے آٹومیٹک پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی--- میں سائے پر ٹکٹکی باندھے نظریں جمائے لیٹا تھا۔ جسونت کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

لیٹے لیٹے اس نے ایک مخصوص سگنل دیا جس کا مطلب تھا کہ میں آگے نکلوں اور وہاں موجود پہرے دار کو دھوکے سے اپنی طرف متوجہ کروں۔ اس اثناء میں جسونت کو اپنا کام کر گزرنا

تھا۔ اشارہ ملتے ہی میں کہنیوں کے بل تیزی سے بلاک کے ایک کونے کی طرف رینگنے لگا۔ جسونت کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ کا دباؤ اپنی کمر پر محسوس کیا۔ وہ مجھے نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع کہہ رہا تھا۔ جسونت نے میرے مخالف سمت رینگنا شروع کر دیا۔ بلاک کے ایک کونے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ اس اثناء میں وہ سلیہ دوسرے کونے پر پہنچ چکا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو جسونت میرے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ تیزی سے بنے پختہ فرش پر رینگنے کی وجہ سے میری کہنیوں کا برا حال ہونے لگا تھا۔

میں برآمدے کے ایک کونے پر دیوار کے ساتھ چپٹ گیا جب کہ جسونت میرے قدموں کے ساتھ رینگتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ برآمدے سے منسلک چھوٹی باڑھ سے چپک گیا تھا۔ سائے نے اپنا رخ بدلا' اب برآمدہ اس کے فوجی قدموں کی آواز سے گونجنے لگا تھا۔ میں اپنی بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ قریباً" سانس روکے ہوئے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ میری مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکا ہے تو میں اپنی جگہ سے نکلا اور بغیر آواز پیدا کئے اپنی جگہ سے سرک کر برآمدے کے پتھر سے آ لگا۔ گو کہ یہ عمل میں نے بغیر' آواز پیدا کئے انجام دیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آنے والے نے میری یہ حرکت کوٹ کر لی ہو گی۔

یہ آخری اور خطرناک ترین داؤ تھا جو ہم کھیل رہے تھے۔ عموماً" جاسوس یہ عمل اس وقت دہراتے ہیں جب کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہے۔ ہم یہاں وقت ضائع کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ کسی بھی وقت اندر موہن اور اس کے ساتھی کی غیر حاضری پر ملٹری پولیس والے مشتبہ ہو سکتے تھے یا کسی بھی وقت اس طرح اچانک آ نکلنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ہماری توقعات کے مطابق آنے والا ٹھٹھک کر رک گیا اور چند سیکنڈ تک اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ وہ "ٹارچ بردار" نہیں تھا۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ جیسے ابھی دل اچھل کر حلق سے باہر آ گرے گا۔ میرے جسم کی تمام سکت آنکھوں سے ہوتے ہوئے اب ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی۔ میں کسی بھی لمحے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبانے کے لئے تیار تھا۔

چند سیکنڈ---' بمشکل ہی وہ اپنی جگہ ٹھہرا ہو گا لیکن ہمارے لئے وہ چند لمحات صدیوں پر محیط دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے معمول کی رفتار سے میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ اپنے کندھے پر لٹکی آٹومیٹک رائفل اس نے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لی تھی۔ مکمل تیاری کی حالت میں نہیں--- شاید ابھی تک اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اور جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا' بیک وقت دو اطراف سے اس پر قیامت ٹوٹی--- جسونت جو سرکتا

ہوا برآمدے کی دیوار کے بالکل ساتھ چپک گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اس طرح اچھلا جیسے اس کے جسم میں لگے طاقت ور سپرنگوں نے اسے فضا میں اچھال دیا ہو۔ وہ اڑتا ہوا آیا اور حیرت زدہ پہرے دار جس کی زبان اچانک پیش آنے والی صورت حال سے گنگ ہو گئی تھی کہ منہ پر مضبوطی سے ہاتھ جماتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

---اور میرے دائیں ہاتھ میں پکڑے پستول کا دستہ اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی زوردار ضرب اس کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی اس کی دونوں کنپٹیوں پر قیامت ڈھا گئی تھیں۔

"فائن" میرے اس تیز ایکشن پر جسونت نے ہولے سے سرگوشی کر کے مجھے داد دی۔ مگر نگاہیں اس کی بدستور اپنے شکار پر تھیں جو بالکل بے ہوش ہمارے سامنے گرا پڑا تھا اور جس کی رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر برآمدے کے نیچے کچی جگہ پر جا گری تھی۔

ooo

وہ ہر لحاظ سے مجھ سے کہیں سینئر تھا۔ ممکن ہے اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو' میرے لئے بہرحال یہ صورت حال پریشان کن ثابت ہو سکتی تھی۔ بے ہوش پہریدار کو ہم نے چند لمحوں میں اس کی وردی سمیت ہی اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کر اسی باڑھ میں پھینک دیا تھا جہاں جسونت چھپا رہا تھا۔ اول تو وہ صبح سے پہلے ہوش میں آ ہی نہیں سکتا تھا اور اگر بالفرض وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو چیخنے چلانے کے مواقع ختم ہو چکے تھے--- سرچ لائٹ اس طرف ابھی تک تو گھمائی نہیں گئی تھی اگر گھمائی بھی جاتی تو اس کا روشنی کی زد میں آنا مشکل تھا۔

اب اصل میں میرا وہ کام شروع ہوا تھا جس میں مجھے خصوصی مہارت اور جسونت پر کسی قدر برتری حاصل تھی۔ ہم مختلف کمروں کے باہر لگی نیم پلیٹوں پر نظر دوڑاتے اس مخصوص کمرے کے سامنے جا پہنچے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ جسونت تو پلر کی آڑ میں کھڑا اندھیرے میں حالات کا جائزہ لے رہا تھا جب کہ میں ایک نظر تالے پر ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ قریباً" ڈیڑھ دو منٹ تک سرکھپائی کے بعد بالآخر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور تالا کھٹاک کی آواز پیدا کرتا ہوا کھل گیا۔

اس کے بعد بیہوش پہرے دار کی رائفل تھامے جسونت والی جگہ پر کھڑا ہو گیا جب کہ پنسل ٹارچ سمیت وہ کمرے میں جا گھسا تھا۔

جسونت نے قریباً" دس منٹ اندر لگائے تھے۔ اس اثناء میں ایک مرتبہ اس کی مدد کے لئے اندر جا کر مجھے پھر ایک تالے پر زور آزمائی کرنا پڑی۔ جب دس منٹ کے بعد جسونت باہر نکلا تو کامیابی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

اصل میں اب وہ خطرناک مرحلہ آیا تھا جس سے بخیریت گزرتے ہماری کامیابی کا دارومدار تھا۔۔۔ ہیڈکوارٹر کے چاروں اطراف دیوار بنی ہوئی تھی جس پر خاردار تار لگے ہوئے تھے اور رات کو آٹھ بجے کے بعد ان میں بجلی کی رو دوڑنے لگتی تھی۔ اس کے علاوہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچے اونچے ٹاور بنائے گئے تھے جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ ان کو کچھ اس انداز سے نصب کیا گیا تھا کہ اشارہ ملنے پر ہیڈکوارٹر کے کسی بھی حصے میں ان سے فائرنگ کی جا سکتی تھی اور چند منٹ کے اندر وہ حملہ آوروں کو بھون کر رکھ سکتی تھی۔

تین بجے پہریدار بدلتے تھے۔

۔۔۔۔ہم نے اسی وقت کو یہاں سے نکلنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ دونوں گدھے جنہیں ہم جسونت کے کوارٹر میں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے چوبیس گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس وقت بمشکل رات کے بارہ بجے تھے اور ایسے اعصاب شکن حالات میں صبح تین بجے تک یہاں چھپے رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہم دفاتر سے پرے ہٹ گئے تھے۔ جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر ہم نے اپنے نئے شکار کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔۔۔

اس کی رائفل جسونت کے کندھے پر لٹکی تھی۔ وہاں سے چرائے گئے کاغذات کچھ تو میں نے اپنی جیبوں میں ٹھونس لئے تھے اور کچھ جسونت کے پاس تھے۔ ہم اب درختوں کے جھنڈ تک پہنچ چکے تھے اور وہیں بیٹھے وقت گزار رہے تھے۔ دونوں ہی ایک درخت کی مخالف سمت میں منہ کئے بیٹھے تھے۔ رائفل جسونت کی گود میں دھری تھی اور پستول میری جھولی میں پڑا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی اکتا جاتے تو پلٹ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے اس کے علاوہ وقت گزاری کا اور کوئی بہانہ ہمیں میسر نہ تھا۔

○○○

جیسے ہی ہیڈکوارٹر میں گیارہ گھنٹی پر تین بار ضرب پڑی۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ اٹھے۔ منصوبے کے مطابق اپنے "شکار" کی رائفل جسونت نے کندھے سے لٹکا رکھی تھی اور اس کا لمبا فوجی کوٹ میں نے پہن رکھا تھا۔ میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے۔ یہ کوٹ ہرگز مجھے فٹ نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح گزارہ تو کرنا ہی تھا۔

اس وقت گیٹ تک پہنچنے والے شاید ہم دونوں سب سے پہلے انسان تھے۔ مین گیٹ کے سامنے لگا ہیپیر جھکا ہوا تھا۔ ایک کونے پر لکڑی سے بنی چیک پوسٹ کے باہر دو سپاہی کندھوں سے رائفلیں لٹکائے کھڑے تھے۔ ہیپیر کے آگے ایک فوجی موٹرسائیکل کھڑی تھی۔ ہمیں صرف دو یا تین منٹ میں جو کچھ بھی ہم چاہتے تھے کر گزرنا تھا۔ اس کے بعد ہمارے لئے کوئی چانس باقی

نہیں بچتا تھا کیونکہ کسی لمحے گیٹ پر نئے پہرے داروں کی آمد متوقع تھی۔ میں آگے تھا اور جسونت میرے پیچھے۔ ہم دونوں نے چاہا کہ تیزی سے باہر نکل جائیں۔

"اے ٹھہرو!" اچانک سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

"بلآخر پھنس ہی گئے۔" یہ سوچتا ہوا میں واپس مڑا تو میرے کانوں میں جسونت کی آواز گونجی۔

"ہینڈز اپ!" اس نے اپنی رائفل دونوں کی طرف تان رکھی تھی۔

فوراً" میرا پستول بھی جیب سے نکل آیا۔ دونوں نے ہڑبڑا کر ہاتھ اٹھا دیئے۔

"موو (Move)" جسونت نے تحکمانہ لہجے میں رائفل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں بکے بکے اپنی جگہ سے آگے بڑھ گئے۔

ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ پاکستانی کمانڈوز یہاں بھی آ جائیں گے۔

"دوسری طرف گھومو۔" جسونت کا اگلا حکم سنتے ہی انہوں نے اپنے منہ ہاتھ اوپر کئے ہوئے اس لکڑی کی بنی ہوئی پوسٹ کی طرف کر لئے۔ ہم نے انہیں ایک لمحے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ جسونت نے اپنی رائفل اور میں نے پستول کا دستہ آزمایا۔ ایک ہی ضرب سے وہ تناور درختوں کی طرح کٹ کر زمین پر آ رہے۔ ہم دونوں تیزی سے موٹر سائیکل کی طرف لپکے اور موٹر سائیکل کو بھگانا شروع کر دیا۔

۔۔۔۔چند گز بھگانے کے بعد ہی ہم اسے سٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں چھلانگ لگا کر جسونت کے پیچھے بیٹھ گیا۔ رائفل ابھی تک اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی لیکن ہمارے لئے فی الحال کارآمد نہیں تھی۔ میں نے اپنا پستول البتہ فائرنگ پوزیشن میں ضرور کر لیا تھا۔

ابھی بمشکل جسونت نے پہلا ہی گیئر بدلا تھا کہ سامنے سے دو فوجی آتے دکھائی دیئے۔ یہ لوگ غالباً" پرانے پہرداروں کی جگہ لینے آئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے پیچھے گولی چلنے کی آواز آئی۔ چیک پوسٹ پر پہنچنے والوں نے بے ہوش پہرے داروں کو دیکھتے ہی ہم پر گولی چلا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ سامنے سے آنے والے لوگ صورت حال سمجھ پائیں جسونت نے موٹر سائیکل کا رخ ان کی طرف موڑ دیا اور جب تک وہ سنبھل کر دوبارہ فائرنگ کی پوزیشن میں آتے ہم ان کی دسترس سے دور جا چکے تھے۔

ہمارے پیچھے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی لیکن جسونت تمام حالات سے لاپروا انتہائی خطرناک ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے موٹر سائیکل کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت ہم

دونوں واقعی کسی انگریزی فلم کے کردار دکھائی دے رہے تھے۔ جب ہم پکی سڑک سے اتر کر ایک کچے راستے پر مڑے جو ایسی نازک صورت حال کے پیش نظر ہم نے پہلے ہی منتخب کر رکھا تھا تو ملٹری جیپ پر لگے سائرن کی مخصوص آواز ہمیں دور سے آتی سنائی دینے لگی تھی۔

یہ کچا راستہ نہر پر جاتا تھا اور کسی کے گمان میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ہم نہر میں ڈوبنے کے لئے چلے آئیں گے۔ اس لئے کسی کے اس طرف آنے کے امکانات کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ موٹر سائیکل پر جسونت کو مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ اس نے رفتار اب خاصی کم کر دی تھی اور ہم کھیتوں کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ کیچڑ میں موٹر سائیکل چلانا کوئی خالہ جی کا کھیل نہیں تھا لیکن جسونت کی مہارت ہر جگہ کام آئی اور ہم نہر کے کنارے تک جا پہنچے۔ یہاں موٹر سائیکل کھڑی کر کے مجھ سے کوئی بات کئے بغیر بندروں کی طرح پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک درخت پر جا چڑھا۔ غالباً اس نے بھی تعاقب میں آنے والی جیپ کی آواز سن لی تھی' ہم سڑک سے قریباً دو ڈھائی فرلانگ دور تھے۔

قریباً دو منٹ کے بعد ہی وہ نیچے اترا اور شدت جذبات سے بے قابو ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"یہ بلا تو ٹلی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا' ہمیں علم تھا کہ صرف چند منٹ کی مہلت ملی تھی کیونکہ یہ جیپ جو ہمارے پیچھے آئی تھی وہ تو ہنگامی طور پر تیار شدہ جیپ تھی' جو اچانک پیش آنے والی صورت حال سے نمٹنے کے لئے "سٹینڈ بائی" رہتی تھی۔ اس کے پیچھے یقیناً اور لوگ بھی آئیں گے جو اس علاقے میں فوراً بکھر کر ہمیں ڈھونڈنا شروع کر دیں گے۔ ہم موٹر سائیکل دھکیلتے ہوئے نہر کے کنارے تک لے آئے۔ پھر بھارتی فوج کی مخصوص وردی سے نجات حاصل کی جس کے نیچے ہم نے اپنے پرائیویٹ کپڑے پہن رکھے تھے۔

جسونت کے کپڑوں میں نائلون کا ایک تھیلا برآمد ہوا۔ ہم نے بڑی پھرتی سے چوری کردہ کاغذات اور اپنے کپڑے جوتوں سمیت اس میں ٹھونس دیئے۔ تھیلے کا منہ نائیلون کی ایک باریک ڈوری سے کس کر باندھ دیا اور اسی ڈوری کی مدد سے میں نے یہ تھیلا اپنی پیٹھ پر باندھ لیا۔ بھارتی فوجی وردیاں ایک گٹھڑی کی صورت میں موٹر سائیکل سے باندھیں اور انہیں موٹر سائیکل سمیت نہر میں غرق کر دیا۔

موٹر سائیکل کے گرنے سے چھناکے کی ایک آواز گونجی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد

ہم دونوں بھی نہر میں کود گئے اور پانی کے ساتھ بہتے دوسرے کنارے پر بہت دور نکل گئے۔ قریباً بیس پچیس منٹ کے بعد جب ہم دوسرے کنارے پر باہر نکلے تو محاورتاً ہی نہیں حقیقت میں ہماری قلفی جم چکی تھی۔ گیلے زیر جاموں سے نجات حاصل کی اور تھیلے میں سے کپڑے نکال کر پہن لئے۔ اپنے جسم کو گرم کرنے کے لئے ہم دونوں نے قریباً پانچ منٹ تک الٹی سیدھی ورزشیں کیں۔

اس علاقے کے لئے ہم بالکل اجنبی تھے اور اپنی تربیت کے مطابق اب ہمیں الگ الگ سمتوں میں سفر کرنا چاہیے تھا۔ ہم نے موت کی شاہراہ پر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ سفر کیا تھا اب زندگی کی نوید ملی تھی تو کیسے جدا ہوتے——؟ یہاں بھی وہی ظالم پہل کر گیا۔ قریباً ایک میل تک سفر کرنے کے بعد جب ہمیں اردگرد کے کھیتوں میں لوگوں کی آمدورفت دکھائی دینے لگی تو وہ ایک جگہ رک گیا۔

یہ جدا ہونے کا سگنل تھا۔ اتنے پیارے اور بہادر ساتھی سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

"سینئر ہو نا! یہاں بھی نمبر لے جاؤ گے۔" میں نے قریباً رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

جسونت خاموش رہا۔ شاید اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بے اختیار آگے بڑھ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھلملا رہے تھے۔ الگ ہوتے ہوئے میرے دونوں کندھے اس نے تھپتھپائے اور "خدا حافظ" کہہ کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

ہم دونوں مخالف سمتوں میں چل دیئے۔ کافی دیر بعد جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا دوست کھیتوں کے وسیع سلسلے میں غائب ہو چکا تھا۔

○○○

بڑے بوجھل دل سے میں اس سے الگ ہوا تھا لیکن جلد ہی نارمل ہو گیا۔ سورج نکل رہا تھا اور لوگوں کی آمدورفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ میں مختلف کھیتوں کی پگڈنڈیاں پھلانگتا ان دیکھی منزل کی طرف گامزن تھا۔ صورت حال کی سنگینی کے پیش نظر میں نے کسی سے بھی سڑک کا راستہ دریافت نہ کیا اور تن بہ تقدیر چلتا رہا۔ قریباً ڈھائی گھنٹے تک ٹاک ٹوئیاں مارنے کے بعد مجھے سڑک کی صورت دکھائی دی۔ اس دوران نجانے کتنے دیہات' مندر' گردوارے اور لوگ مجھے ملے تھے لیکن میں ان سب سے کنی کترا کر گزر گیا تھا۔

ساری رات جس اعصاب شکن ماحول میں کٹی تھی اور جس صورت حال سے میں دوچار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا۔ ان حالات میں میری ذہنی اور جسمانی تندرستی کا برقرار رہنا کسی معجزے

سے کم نہیں تھا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ یہاں سنگ میل دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے اندازہ ہو سکتا کہ یہ سڑک کہاں سے آتی ہے اور کس طرف جا رہی ہے۔

---میں نے سڑک کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر ایک کنارے پر لگا بورڈ دکھائی دیا جس پر انگلی کے اشارے سے ایک راستے کی نشان دہی کی گئی تھی اور اس گاؤں کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ آگے بائیں طرف بھی ایک ایسا ہی بورڈ نظر آیا۔ کچھ اور آگے پہنچا تو گوہر مقصود بھی ہاتھ آگیا۔ یہ لدھیانہ کی ایک ذیلی سڑک تھی جو آگے جا کر جی ٹی روڈ سے مل جاتی تھی۔

ایک جگہ سڑک کے کنارے بنا ہوا ایک لوہے کا شیڈ سا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ بس سٹاپ ہے۔ قریباً" پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد ایک چھکڑا سا دور سے آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ بس ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس بس نما چھکڑے میں سوار ہو گیا۔ جس میں پہلے ہی سے نزدیکی دیہات کے لوگ' بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھسے ہوئے تھے۔ میرے سوار ہونے پر حسب روایت پہلے سے پھنسے لوگوں نے دو چار گالیاں بس والوں کو نکالیں' دو چار کلمات خیر میرے حق میں کہے اور بس چل دی۔

آدھے گھنٹے بعد قریباً" پسلیوں کو شکنجے سے نکالنے کے بعد مجھے کھلی ہوا میں سانس لینے کی توفیق نصیب ہوئی۔ یہ ایک قصباتی بس سٹینڈ تھا جہاں سے بسیں موگا وغیرہ کے لئے جاتی تھیں۔ سامنے موگا کی بس تیار تھی میں اس میں سوار ہو کر موگا کی طرف چل دیا۔

دوپہر کے قریب موگا پہنچا۔ ایک ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور وہیں ایک مقامی سینما میں جا گھسا۔ سرشام جب مجھے جسونت کے محفوظ ہاتھوں تک پہنچنے کا سگنل موصول ہوا تو بے اختیار میرا دل تشکر کے جذبات سے بھر آیا--- اللہ تعالیٰ کے خصوصی رحم و کرم سے ہی یہ مہم سر ہوئی تھی۔ مسرت بھرے دل کے ساتھ میں یہاں سے عازم لدھیانہ ہوا اور سورج ڈھلتے ہی وہاں جا پہنچا۔

ooo

پرکاش کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ میں سیدھا اوپر کمرے میں ہی چلا آیا۔ شاید ہی کسی نے مجھے دیکھا ہو گا۔ یہاں ایک ٹرنک میں سے اپنے دھلے ہوئے کپڑے نکال کر پہنے۔ پرکاش کے آنے سے پہلے پہلے اسی کے سامان سے شیو بنایا' پھر ایک لڑکے کو بلا کر قریبی ہوٹل سے چائے لانے کو کہا اور خود چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

پرکاش سدرشنا کے ساتھ فلم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس دوران میں' میں شاندار نیند سے لطف اندوز ہو چکا تھا اور خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ ایک لڑکے کو میں نے قریبی ہوٹل سے کھانا لینے بھیجا۔ لڑکے اور پرکاش کی آمد ایک ساتھ ہوئی تھی۔ اسے چونکہ میرے آنے کی خبر نہ تھی اس لئے مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"آپ کب پدھارے مہاراج؟"

"تمہیں آوارہ گردی سے فرصت ملے تو جانو۔"

"میں آوارہ گردی کرنے نہیں' فلم دیکھنے گیا تھا۔" پرکاش نے ہنستے ہوئے کہا۔

کھانا ہم دونوں نے اکٹھے ہی کھایا' پھر پرکاش تو لمبی تان کے سو رہا جب کہ میں نے وہ رات کروٹیں بدلتے گزار دی۔ جب سے میں نے فلم "جوئے بنگلہ ویش" دیکھی تھی اک بے کلی سی چھائی رہتی تھی۔ کوئی طاقت اندر ہی اندر مجھے آنے والے بھیانک خطرے کا احساس دلاتی رہتی۔ ہندو کی چالبازیوں کا نزدیک سے مشاہدہ کرنے کے بعد اور اپنی قوم کی بھولی ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ چانکیہ کے چیلوں کی خباثت رنگ لا کر رہے گی اور جو زہر آہستہ آہستہ لیکن بڑے منظم طریق سے بھولے بھالے بنگالیوں کے دل و دماغ میں اتر رہا تھا اس کے دور رس نتائج ضرور برآمد ہوں گے۔

بھارتی اخبارات میں روزانہ پاکستانی فوج کے متعلق من گھڑت کہانیاں شائع ہونے لگی تھیں۔ نجانے یہ لوگ کہاں سے عجیب عجیب قسم کی تصاویر لے آئے تھے جن کو پاکستان کی بربریت کا شکار ظاہر کر کے دن رات پراپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔ آکاش وانی کے کسی نہ کسی سٹیشن سے ہر روز کوئی نہ کوئی "شرنارتھی" پاکستان کے خلاف زہر اگلتا سنائی دیتا تھا۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیاں کہ اسلام دشمنی جن کی گھٹی میں پڑی تھی' ایسی باتوں کی منتظر رہتی تھیں اور بغیر کسی تصدیق کے وہی خبر اگلے روز ان کے حوالے سے پڑھنے سننے کو مل جاتی تھی۔ کاش ہمارے سفارت کاروں نے اس دور پرآشوب میں اپنی ذمے داریوں کا احساس کیا ہوتا اور وقت کی آندھیوں کا رخ پہچان سکتے۔

اگلے روز علی الصبح میں اور پرکاش لدھیانہ جیل جانے کی تیاریوں میں لگ گئے کیونکہ آج بابوجی سے ملاقات کا دن تھا۔ صبح جلد ہی ماتا جی اور موسی جی پونم اور منو کے ساتھ آگئی تھیں۔ انہوں نے بابوجی کے لئے بہت سا سامان اکٹھا کر رکھا تھا۔ جیل میں بابوجی سے ملاقات علیحدگی میں ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم نے پہلے سے ہی جیل حکام کی مٹھی گرم کر دی تھی اور انہوں نے بھی پورا پورا حق نمک ادا کیا۔

بابو جی ہمیں بڑے اچھے موڈ میں ملے۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ گھر والوں نے میری مساعی سے انہیں آگاہ کیا تو ان کی حالت دیدنی تھی۔ انہوں نے علیحدگی میں مجھ سے کچھ باتیں کیں تو میں نے انہیں منوہر سنگھ کی ملاقات سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں ان کے معیار پر پورا اترا ہوں۔

"پرکاش بیٹے اس سلسلے میں مجھے نجانے کیوں اک خلش سی لگی رہتی ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں میں نے اپنے مشن کی عظیم خدمت کی ہے جو انہیں تم جیسا کارکن سونپا ہے' لیکن جب پونم کا خیال آتا ہے تو پھر....." وہ خاموش ہو گئے۔

"آپ صرف تحریک کی کامیابی کے بعد کے ثمرات سوچا کیجئے۔ بابو جی اگر آپ نہ ملتے تو کیا میں نکسل باڑی نہ بنتا؟ بس آپ کا بہانہ بننا تھا سو بن گیا۔" میں نے ان سے کہا تو بوڑھے کمیونسٹ نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

بابو جی کی زبانی علم ہوا کہ جس بات کا انہیں شک تھا' اس بات سے خیریت ہی گزری ہے اور ان کی اطلاعات بھی یہی ہیں کہ انہیں نکسل باڑی ہونے کے شبے میں نظر بند کیا گیا ہے۔ پولیس کپتان کے سلسلے میں نہیں۔ بابو جی کی طرح مجھے بھی اس بات کا یقین تھا کہ حکومت کی کوئی ایجنسی بھی ان کے خلاف نکسل باڑی ہونے کا ثبوت حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ بابو جی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ ممکن ہے مجھے اب کلکتہ ان کے ہیڈ کوارٹر میں تربیت حاصل کرنے جانا پڑے۔ اس سلسلے میں پیش بندی کے طور پر انہوں نے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ "چند روز تک ممکن ہے پرکاش کو ان کے کسی خاص کام سے کلکتہ جانا پڑے۔" تاکہ گھر والوں کو میرے اچانک اس طرح کلکتہ جانے پر شک نہ گزرے۔

ملاقات کے لئے عموماً ایک گھنٹے کا وقت ملتا ہے لیکن ہم نے تین چار گھنٹے بابو جی کے ساتھ گزارے اور ان کی نیک تمنائیں لے کر رخصت ہوئے۔ پرکاش کو میں نے گھر والوں کے ساتھ رائے کوٹ بھیج دیا اور خود لدھیانہ رہ گیا۔ اصل میں' میں اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر کلکتہ کے سلسلے میں اگلا پروگرام طے کرنا چاہتا تھا کیونکہ خالی ہاتھ بیٹھے رہنا مجھے منظور نہیں تھا۔

مجھے تو کام کرنا تھا نکسل باڑیوں کی آڑ میں ہی سہی!

کلکتہ کے ممکنہ دورے کے پیش نظر مجھے وہاں سے متعلق کچھ مشن سونپے گئے اور وہاں کے "دوستوں" کو بھی میرے متعلق اطلاعات بھیج دی گئیں۔ اپنے کام سے نمٹ کر قریباً شام کے وقت جب میں واپس کارخانے پہنچا تو ایک پیغام میرا منتظر تھا۔

"بابو جی ایک صاحب آئے تھے' آپ کا انتظار کرتے رہے پھر یہ رقعہ دے گئے۔۔۔۔!" ایک ملازم نے اطلاع دی۔

میری توقع کے عین مطابق یہ میرے نئے دوستوں کا پیغام تھا۔ انہوں نے اگلے روز پھر اسی ہوٹل میں آنے کے لئے کہا تھا۔

ooo

اگلے روز سب سے پہلے پونم سے ملاقات ہوئی جو رائے کوٹ سے سیدھی یہیں چلی آئی تھی۔

"خیریت" میں نے اس کے کپڑوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کالج کی مخصوص وردی کے بجائے پرائیویٹ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔

"بالکل نہیں۔" پونم مختصر سا جواب دے کر میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ارادے خطرناک ہی دکھائی دیتے ہیں۔" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"آپ سے زیادہ نہیں۔" میں پونم کی اس بات سے چونکا۔ "یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کلکتہ جانے کی کیا سوجھی؟"

"اچھا تو یوں کہو نا بھئی! بابو جی کا کام تھا کچھ۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"پرکاش بابو آپ کو مجھ پر وشواش نہیں کیا؟" اس کا لہجہ بڑا گمبھیر ہو گیا تھا۔

"پونم یہ بات تم کہہ رہی ہو' تم جو میرا انتر وشواش ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

پرکاش بابو میں بچی نہیں ہوں' مجھے علم ہے بابو جی کس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یہ بات میں آج سے نہیں پچھلے پانچ سال سے جانتی ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے بات کی اور میرا دل پھر زور سے دھڑکا۔

"میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا۔" میں نے اپنی طرف سے چالاکی کا مظاہرہ کیا۔

"پرکاش بابو آپ سب کچھ جانتے ہیں' یہ ٹھیک ہے کہ بابو جی آپ پر وشواش کرتے ہیں۔ انہوں نے آپ کو کلکتہ میں اپنے نکسلا ہیڈ دوستوں سے ملاقات کرنے کو کہا ہے۔ مجھے صرف ایک بنتی کرنی ہے کہ آپ کہیں....."

"اوہ پونم کیا بچوں کی سی بات کرتی ہو' جو تمہاری زلفوں کا اسیر ہو چکا ہو وہ اور کسی کے دام میں نہیں پھنس سکتا۔ یہ ٹھیک ہے میں بابو جی کے کام ہی سے جا رہا ہوں لیکن ایسی بات قطعاً نہیں کہ میں خود نکسل باڑی بن جاؤں گا اور ہاں جس راز کو پانچ سال سے تم نے اپنے سینے میں

چھپا رکھا ہے اسے ہمیشہ راز ہی رکھنا' اسی میں ہم سب کی سلامتی ہے۔"

پونم خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ شاید آنے والے وقت سے متعلق کچھ اندازہ قائم کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"پونم میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ وشواش رکھو میں زندگی میں تمہیں کبھی دھوکہ نہیں دوں گا کبھی نہیں۔" یہ بات کہتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔

کیسا خطرناک کھیل تقدیر کھیل رہی تھی میرے ساتھ۔۔۔۔!

دوپہر تک ہم اکٹھے رہے۔ ایک ہوٹل سے ہم نے کھانا کھایا اور میں پونم کو بس میں سوار کرکے واپس اس ہوٹل کی طرف چل دیا جہاں مجھے اپنے نئے دوستوں سے ملنا تھا۔ ابھی ہماری ملاقات میں قریباً" ایک گھنٹہ باقی تھا۔ یہ وقت میں نے آوارہ گردی کی نذر کر دیا اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی ہوٹل میں جا بیٹھا۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں مقررہ وقت پر پہنچیں' اس کے بمشکل دو منٹ کے بعد ایک سمارٹ سا نوجوان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ نووارد نے وہ مخصوص نشان اپنے کوٹ کے کالر پر سجا رکھا تھا جو نکسن باڑی کے لئے ان دنوں مخصوص تھا۔

"اشوک" اس نے میرے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔

"پرکاش" میں نے بھی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک کیبن میں بیٹھ گئے اور بیرے کو چائے لانے کا کہہ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

"مسٹر پرکاش مجھے آپ کے ساتھ کلکتہ جانا ہے جہاں ہمارے دوست آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ کو کم از کم ایک ماہ تک قیام کرنا ہو گا تاکہ آپ بنیادی تربیت حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد آپ واپس پنجاب میں آئیں گے اور آپ کو عظیم پرولتاری انقلاب کے لئے کام کرنا ہو گا۔ ممکن ہے آپ نے ہمارے ساتھ شمولیت کا فیصلہ جذباتی ہو کر کیا ہو' ہم نہیں چاہتے کہ تصویر کا کوئی رخ آپ سے پوشیدہ رہے۔ صرف ایک بات یاد رکھئے کہ ایک دفعہ نکسن باڑی ہو جانے کے بعد اس ملک میں آزادی کا سانس لینا آپ کے لئے ناممکن ہے یا تو سیکورٹی والے آپ کو کسی نہ کسی بہانے سے مار ڈالیں گے یا پھر ساری عمر گلنے سڑنے کے لئے کسی جیل میں پھینک دیں گے۔ آپ برسوں تک سوچئے' اچھی طرح حالات کا جائزہ لیجئے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ ثابت قدم رہیں تو میں دن کے گیارہ بجے پلیٹ فارم نمبر "تین" پر آپ کا منتظر رہوں گا۔ مجھے جواب دینے کا موقع دیئے بغیر اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور "گڈ لک" کہہ کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں بھی اٹھ کر باہر نکل آیا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب براہ راست چانکیہ کے ان خبیث چیلوں سے ٹکرانے کا موقع ملے گا جو پورے پاکستان کی پوتر دھرتی کو اپنے ناپاک قدموں سے روند رہے تھے کیونکہ مکتی باہنی کے ٹریننگ کیمپ زیادہ تر کلکتہ میں واقع تھے اور مشرقی پاکستان میں کی جانے والی تمام کارروائیوں کو عموماً" کلکتہ اور آسام ہی سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔

واپسی میں رائے کوٹ ہی چلا آیا۔ اتفاق سے سالگ رام بھی چھٹی لے کر آیا ہوا تھا۔ میں نے گھر والوں کو بتایا کہ پرسوں مجھے کلکتہ جانا ہو گا' ممکن ہے وہاں کچھ دن لگ جائیں۔ بڑی مشکل سے میں انہیں مطمئن کر سکا کیونکہ گھر کا کوئی فرد مجھے کلکتہ جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھا۔ پونم کو میں نے بڑی روودقد کے بعد اس بات کا یقین دلایا تھا کہ میں صرف بابوجی کو اس چکر سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں' کیونکہ ان کے متعلق زیادہ تر شواہد حکومت کلکتہ سے حاصل کرے گی اور ہماری کوتاہی کی وجہ سے اگر بھگوان نہ کرے' ان پر نکسلا ہیڈ ہونے کا الزام ثابت ہو گیا تو پھر ان کی ساری زندگی جیل کی نذر ہو جائے گی۔

پونم کو میں نے وچن دیا تھا کہ میں کبھی نکسن باڑیوں کا آلہ کار نہیں بنوں گا۔ خدا خدا کر کے سب لوگ راضی ہوئے۔ میں نے پرکاش کو بتایا کہ کلکتہ میں بزنس ملنے کی بھی بہت امید ہے۔

"جہنم میں گیا بزنس اور کلکتہ۔" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں جواب دیا۔

اصل میں اس گھر کے مکینوں کو مجھ سے ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ گھر میں شاید ایک خلاء سا محسوس کرنے لگتے۔ ایک سالگ رام ایسا تھا جسے میں نے اشارے کنایے سے حالات کی سنگینی کا احساس دلا کر اپنی حمایت پر راضی کیا تھا اور جب گھر والوں نے میرے جانے کے حق میں فیصلہ دے دیا تو پرکاش ناراض ہو کر رائے کوٹ چلا آیا۔ میں نے بھی فی الحال اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔

رات کو پونم اور میں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے تو اب قدرت کی ستم ظریفی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا لیکن ایک پھانس سی کہیں اٹک کر رہ جاتی۔ جب میں یہ سوچتا: میری دائمی جدائی کو یہ لوگ کیسے برداشت کریں گے؟ جب میں نے اس کھیل کا آغاز کیا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ حالات اتنے سنجیدہ ہو جائیں گے!

پونم کی قربت کے وہ حسین لمحات اب میرے لئے سرمایہ حیات بن چکے ہیں۔ فلک نے پھر

بھی اتنی مہلت نہ دی کہ یوں کھل کر پونم سے باتیں کر پاتا۔ خود پونم کے رویے سے یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اندر سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ اسے ابھی تک اس بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ میں نکسل باڑیوں کے جال میں نہیں پھنسوں گا۔ یہ شاید اس ذہنی نسبت کی وجہ سے تھا جو اسے مجھ سے تھی۔ بہرحال اسے کسی نہ کسی طور میں نے مطمئن کر دیا۔

صبح میں رائے کوٹ سے لدھیانہ چلا گیا۔ بڑی مشکل سے پرکاش کو سمجھا بجھا کر راضی کیا اور ساتھ ہی وعدہ بھی کر لیا کہ میں بہرصورت دس پندرہ دن کے اندر واپس آ جاؤں گا۔ مجھے علم تھا کہ سٹیشن تک یہ لوگ ضرور میرے ساتھ چلیں گے' اس لئے پہلے ہی اپنے دوستوں کو آگاہ کر دیا تاکہ ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لئے پہلے سے وہ خاطر خواہ بندوبست کر لیں' شام کو پھر واپس رائے کوٹ آ گیا۔

اگلے دن علی الصبح میں اور پونم گھر سے نکل گئے۔ مجھے لدھیانہ سے ٹرین پر سوار ہونا تھا--- سدرشنا جسے پرکاش نے میری کلکتہ یاترا سے آگاہ کر دیا تھا صبح ہی سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی' تینوں میرے ساتھ ریلوے سٹیشن تک آئے--- تینوں کی حالت دیدنی تھی' خصوصاً" پونم تو روہانسی ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ٹرین آئی' پہلے سے مخصوص برتھ پر سامان رکھ کر میں نیچے آن کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی میرے پیارے مجھے آنسو بھری مسکراہٹوں سے الوداع کر رہے تھے۔ ٹرین نے رینگنا شروع کیا۔ میں اپنے برتھ پر پہنچا جہاں اشوک میرا منتظر تھا۔

سجاتا

لدھیانہ سے کلکتہ تک کا سفر حفاظتی اقدامات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے نہایت خاموشی سے طے کیا۔ اس دوران اشوک کو مختلف سٹیشنوں پر اس کے پُراسرار ساتھی ملتے اور اگلے سفر سے متعلق ہدایات دیتے رہے---

یوں تو بھارت میں علیحدگی پسند تحریکیں ہمیشہ سے ہی زیر عتاب رہی ہیں' لیکن نکسل باڑیوں کے متعلق سرکار کا رویہ کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔ پھر چارو موزمدار کی موت نے تحریک کی ایک طرح سے کمر توڑ کر رکھ دی تھی' لیکن کسی نہ کسی طرح اس کے باحوصلہ کارکنوں نے ابھی تک اسے سنبھالے رکھا تھا۔

نکسل باڑیوں کی صحیح سرگرمیاں بنگال' مدراس اور بہار کے اضلاع میں دیکھنے کو ملتی تھیں کیونکہ یہاں پہلے سے علیحدگی پسند تنظیمیں ان کی کھل پشت پناہی کرتی تھیں۔ بنگال میں تو خود یہ تحریک خاصی مستحکم تھی جب کہ مدراس میں اسے ڈی۔ ایم۔ کے--- وراوڑ امونیری کشیم تحریک کی ہمدردیاں حاصل تھیں اور بہار سے ملحقہ دوسرے سرحدی اضلاع میں یہ لوگ میزورام اور ناگالینڈ وغیرہ کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔

ریلوے سٹیشن سے ہم لوگ بڑی بازار میں چلے آئے تھے۔ ہمیں سٹیشن پر لینے کوئی نہیں آیا تھا البتہ تین سٹیشن پہلے اشوک کو اگلا پروگرام دے دیا گیا تھا۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ خفیہ آنکھیں یہاں ہماری نگرانی کر رہی ہوں گی۔ یہ آنکھیں انٹیلی جنس کی بھی تھیں اور نکسلائیٹ کی بھی۔

انٹیلی جنس تو معمول کی کارروائی کے مطابق یہ کام کر رہی تھی جب کہ نکسل باڑی نئے کامریڈ پر آخر وقت تک نظر رکھتے تھے۔ مبادا وہ حکومت کا آدمی ہو اور سب کو لے ڈوبے۔ یہ لوگ اتنے زبردست تربیت یافتہ تھے کہ میرے لاکھ چلاک ہونے کے باوجود ابھی تک میں نے اشوک سے ملنے والے کسی شخص کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ پیغام البتہ ہم تک ضرور پہنچ جاتا تھا۔

بڑی بازار کیا تھا چوں چوں کا مربہ! جس مکان میں ہم پہنچے' وہ ایک کٹڑی میں بنا تھا۔ اسے

جانوروں کا طویلہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ بازار میں گھستے ہی عجیب عجیب رنگ و نسل کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو انسانوں کے بجائے کسی مشین کا کل پرزہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان لوگوں کو پنجاب کے لوگوں کی طرح دوسروں کے متعلق سوچنے کی مہلت میسر نہیں تھی۔ ویسے بھی ان کے پاس سوچنے کے لئے وقت تھا ہی کہاں۔ وہ تو رات کو بھی اتنی دیر ہی آرام کرتے تھے جتنی دیر کے لئے کسی زیر استعمال مشین کو ممکنہ نقصان کے پیش نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ پنجاب کے اور یہاں کے لوگوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سوکھے سوکھے مریل سے بنگالی جو دن رات زندگی سے لڑائی میں لگے رہتے تھے۔ اس لڑائی میں انہیں نہ کبھی فتح نصیب ہوئی نہ ہو گی کہ یہی کچھ انہیں ورثے میں ملا تھا جسے وہ اگلی نسلوں کو منتقل کر دیں گے۔

ہم جس ڈربے میں گھسے تھے اس کی نچلی منزل میں شراب خانہ تھا اور اوپر کی منزل میں تین کمروں میں تین کنبے رہتے تھے۔ ایک ڈربہ نکسل باڑیوں نے لے رکھا تھا۔ جہاں موقع محل کی مناسبت سے ان کا ایک ورکر اپنی بیگم کے ساتھ مقیم تھا۔۔۔۔ یہ تھے جیسن اور اس کی پتنی سجاتا۔

سجاتا بگڑی ہوئی رئیس زادی تھی جو اپنے باپ کی مل کے ایک کلرک جیسن کے ساتھ یہاں آن براجی تھی۔ دونوں نے واقعی خود کو نکسل باڑی تحریک کے لئے وقف کر دیا تھا۔ سجاتا عورتوں میں کام کرتی تھی اور جیسن یہاں کا مقامی سکتر تھا۔ دونوں بزعم خویش عظیم انقلاب کے لئے لڑ رہے تھے جو شاید کبھی ان کا مقدر نہ بن سکے۔ سجاتا کو تحریک میں عظیم مقام اس لئے حاصل تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے "بورژوا باپ" کو گولی مار دی تھی اور جو کامریڈ اپنے اصولوں کے لئے اپنی ولدیت سے بھی منکر ہو جائے وہ "عظیم" کیوں نہ کہلائے گا۔ اس کو زیادہ اہمیت اس لئے بھی حاصل تھی کہ اس نے کبھی کسی کامریڈ کو "ناراض" ہونے کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ سجاتا کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے تھے۔ وہ انسانی پستیوں کی انتہا میں گر چکی تھی جہاں اخلاقیات کا جنازہ نکل جاتا ہے اور مذہب' معاشرت' اخلاق وغیرہ لایعنی سی چیزیں بن کر رہ جاتے ہیں۔

سجاتا والی کی رہنے والی اور پولیس کو مطلوب تھی۔ وہ یہاں پچھلے دو سال سے اپنا نام اور شخصیت بدل کر قیام پذیر تھی۔ اس کے ہاتھ اور لوگوں کے خون میں بھی یقیناً رنگے ہوں گے' لیکن ان کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اس کے باپ والی بات بھی اس لئے بتائی جاتی کہ دوسرے کامریڈ انقلاب کے راستے پر چلنے والی اس "مہاویر کامریڈ" جیسے نظریات اپنائیں جو بنفس نفیس ان میں موجود تھی کیونکہ بقول ان کے انقلاب کا حصول تبھی ممکن ہے جب ہم تمام رشتوں کو بھلا کر

صرف "انقلابی" کا رشتہ اپنا لیں۔ جسے سجاتا نے خوب خوب اپنایا تھا۔

کٹڑی میں داخل ہوتے ہی شراب کی بدبو میرے نتھنوں میں گھس آئی تھی۔ پہلے پہل تو مجھے ایسی جگہوں سے سخت وحشت ہوتی لیکن بھارت میں چونکہ قدم قدم پر ایسے ہی ماحول سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے اب میں نے ذہنی طور پر ان حالات سے مصالحت کر لی تھی اور چند لمحوں کے بعد ایسی جگہوں پر لعنت بھیج کر میں پھر نارمل ہو جاتا تھا۔ تب مجھے یہ احساس نہیں ہو پاتا تھا کہ میں یہاں کوئی غیر مرئی مخلوق بن کر آیا ہوں بلکہ میں خود کو بھی اسی ماحول اور اس میں بسنے والے لوگوں کا ایک حصہ جاننے لگتا تھا۔۔۔۔ ڈربے پر ہمارا استقبال جیسن نے کیا۔

"ہیلو کامریڈ۔" کہہ کر اس نے گرمجوشی سے ہم سے مصافحہ کیا۔

ابھی ہم بمشکل بیٹھ ہی پائے تھے کہ سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہونٹوں میں سگریٹ دبائے میرے سامنے بگڑی ہوئی رئیس زادی کھڑی تھی' اس کی آنکھیں نشے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

جس پرانی وضع قطع کے صوفے پر ہم بیٹھے تھے اس کے سامنے ایک کونے میں رکھی تپائی پر شراب کی آدھی خالی بوتل اور گلاس بھی موجود تھا جس کے بھبھوکے اس کے منہ سے اٹھ رہے تھے۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے جیسن کی طرف دیکھا جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا اور جواب میں سجاتا نے بھی اس سے کچھ زیادہ ہی سرگرمی سے "کامریڈ" کہہ کر ہم دونوں سے باری باری مصافحہ کیا۔

اشوک بھی شاید میری طرح ان دونوں کے لئے اجنبی تھا' لیکن یہاں کے دوسرے لوگ جنہیں پنجاب میں کام کرنے کا موقعہ ملا تھا اس سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اسی لئے جیسن نے اس کا خیر مقدم اس طرح کیا تھا جیسے وہ سینئر کامریڈ کا کیا کرتے تھے۔ میرے متعلق اطلاعات پہلے ہی سے یہاں پہنچ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی یہاں زیادہ تر نئے پھنسائے گئے یا خود پھنسے ہوئے کارکن ہی آتے تھے اور بڑی بازار کے اس مکان کو ٹریننگ سینٹر کا مقام حاصل تھا۔

مسلسل سفر نے ہمیں تھکا ڈالا تھا۔ اس لئے ناشتہ کرتے ہی اسی کمرے کے ایک کونے میں لگے لکڑی کے ایک تخت پوش پر آڑے ترچھے ہو کر سو رہے۔ میرے آنکھ تو جلد ہی کھل گئی جب کہ اشوک ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ سجاتا اور جیسن دونوں کمرے میں موجود نہیں تھے۔ میں ایک تولیہ کندھے پر رکھ کر نیچے گیا اور شراب خانے کے ایک کونے میں لگے نلکے پر منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ واپس آیا تو جیسن وہاں موجود تھا۔ کچھ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے یار۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"منہ ہاتھ دھونے گیا تھا' سوچا گھوم پھر کر کلکتہ ہی دیکھ لوں۔" میں نے تولیہ ایک طرف لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تو سمجھا تھا بھاگ گئے ڈر کے مارے۔" اس نے قریباً ہنستے ہوئے کہا۔

"کامریڈ میں بھاگنے کے لئے یہاں نہیں آیا۔" میرے لہجے کی سنجیدگی نے چیتن کو بھی سنجیدہ کر دیا۔

اس اثناء میں سجاتا بھی وہاں آ گئی۔ اب وہ نارمل نظر آتی تھی۔ اس نے چیتن کے اشارے پر ایک سٹوو پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا اور چیتن نے اپنا کام سنبھال لیا۔ سب سے پہلے تو اس نے عظیم انقلاب کی خوبیاں گنوانی شروع کیں' پھر کچھ حفاظتی اقدامات سے آگاہ کیا اور یہ خصوصی ہدایت کی کہ یہاں کسی کامریڈ کو سوائے اپنے کام کے اور کچھ نہیں بتانا۔ نہ ہی کسی کے متعلق جاننے کی کوشش کرنا۔ مجھے صرف انہی باتوں یا معلومات پر اکتفا کرنا تھا جو تحریک کی طرف سے مجھے فراہم کی جاتیں۔ خود سے کچھ جاننے کی کوشش کرنا یا زیادہ چالاک بننا جرم تھا۔ ایسی کوئی بھی حرکت سرزد ہونے پر "عوامی عدالت" انقلاب کی راہ سے ہٹنے والے یا روڑے اٹکانے والے کے خلاف کارروائی کرتی تھی اور اس کا ہر فیصلہ قبول کرنا پڑتا تھا' خواہ وہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔ اپنے اصول و ضوابط مختصراً بتا کر اس نے میری توجہ کچھ سرخ جلدوں والی کتابوں کی طرف دلائی اور بتایا کہ ہر انقلابی کا فرض ہے کہ وہ ان کا مطالعہ کرے۔

چیتن واقعی کامیاب ورکر تھا۔ اس کا بات سمجھانے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ سننے والے کو یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اسے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے جب کہ وہ سب کچھ کہہ گزرتا تھا۔ چیتن کی اجازت سے میں شہر دیکھنے باہر آ گیا۔ اس نے سجاتا کو اپنے ساتھ لے جانے کی پیشکش کی لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ سجاتا نے اس پیش کش کو ٹھکرانے پر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

ooo

شام کو پانچ بجے واپس آنے کا وعدہ کر کے میں روانہ ہو گیا--- کلکتہ بھی اس وقت جاگ گیا تھا۔

---دریائے ہگلی کے کنارے آباد اس شہر کے --- لاکھوں مکینوں میں سے اکثر و بیشتر اپنے اپنے دھندوں کے لئے گھروں سے باہر آ گئے تھے۔ اسی ہجوم میں' میں بھی سڑکوں پر سیر گشت کرنے لگا۔

میدان سے ہوتا ہوا لوئر چت روڈ پر آ گیا اور وہاں سے گھومتا گھماتا آخر زکریا اسٹریٹ کی

طرف آ نکلا--- یہاں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ ایک بڑی سی سرائے کے نزدیک لوگوں کے ہجوم نے میرے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ میں وہیں رک گیا۔ دیکھوں تماشہ کیا ہے؟

اور وہ نظارہ دیکھ کر میرا دا خون کے آنسو رونے لگا۔

---چند بنگلی نوجوان لڑکیوں کو لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ یہ وہ بدقسمت مشرقی پاکستان کی مسلمان لڑکیاں تھیں جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھارتی پروپیگنڈا کا شکار ہو کر یہاں چلی آئی تھیں۔

پہلے تو یہ لوگ سرحدی اضلاع میں لگے شرنارتھی کیمپوں میں آتے تھے' پھر سیالدہ سے ہوتے ہوئے کلکتہ کی طرف نکل جاتے تھے کیونکہ شرنارتھیوں کے نام پر حاصل ہونے والی مقامی اور بین الاقوامی امداد بھارتی سرکار خود ہضم کر جاتی تھی یا کمتی باسی کی بھینٹ چڑھا دیتی تھی اور ان بدنصیبوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کلکتہ کا رخ ہی کرنا پڑتا تھا۔

کلکتہ میں ان کے لئے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا--- کہ وہ اپنی عزت بیچیں یا پھر بھوکے مر جائیں۔ کیونکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں مزدوری کرنے کے مواقع نہیں دیئے جاتے تھے تاکہ یہ بدبخت لوگ اتنے مجبور ہو جائیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی غیرت کو سولی پر چڑھا دیں۔ پہلے پہل تو یہ بدقسمت کنبے اپنے ساتھ لایا ہوا مال و متاع اونے پونے داموں بیچ کر زندگی بسر کرتے اور جب زادِ راہ ختم ہو جاتا تو افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ مکروہ دھندا اپنا لیتے۔

زمانہ غلامی میں شاید اس طرح کنیزوں اور غلاموں کی منڈیاں لگتی ہوں گی جس کا نظارہ یہاں دیکھنے میں آ رہا تھا--- مکروہ چہروں والے چانکیہ کے خبیث چیلے کھا جانے والی نظروں سے ان کا جائزہ لیتے۔ انہیں ٹٹول ٹٹول کر ان کی قیمت کا تعین کرتے۔ قیمت چکاتے اور بے کسی کی ان تصویروں کو بغل میں دبا کر اپنی راہ لیتے۔ عزتوں کا یہ کوڑیوں کے مول نیلام کیسا اندوہناک المیہ تھا--- اس کا احاطہ الفاظ میں ممکن نہیں۔

حیرت تو اس بات پر ہوتی تھی کہ آخر شرنارتھیوں کو بھارتی حکومت نے اپنے شہروں میں آنے جانے کی اجازت کیوں دے رکھی تھی؟ حالات نے اب یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا۔ کسی قوم کو ذلیل و خوار کرنا مقصود ہو تو حملہ آور قومیں سب سے پہلے "دشمن" کی بہو بیٹیوں کی عصمت پر ڈاکہ زنی کرتی ہیں۔ انہیں بے غیرت بنا کر ان کے تشخص میں دراڑیں ڈالی جاتی ہیں اور کرداروں میں ایسے شگاف بنا دیئے جاتے ہیں کہ وہ جب چاہیں ان رخنوں میں سے دخل اندازی کر سکیں۔ اس مداخلت پر مغلوب کچھ نہیں

کہہ پائے' احتجاج بھی نہیں کر سکتے کہ ضمیر تو ان کے پہلے ہی اپنی قیمت پا چکے ہوتے ہیں۔

بھارت کے اس سب سے بڑے شہر—— کلکتہ کی مقامی مسلمان آبادی اتنی غریب تھی کہ سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ حالت مسلمانوں کی ہی نہیں یہاں بسنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کی تھی۔ بھارتی حکومت پر جنگی جنون کا بھوت اس بری طرح سوار تھا کہ اس نے جنتا کی تمام ضروریات کو نظر انداز کر کے اپنی تمام توانائیاں مشرقی پاکستان پر غاصبانہ یلغار کے لئے وقف کر دی تھیں۔

یہ مناظر دیکھ کر میرا دل اپنی بدقسمتی پر خون کے آنسو رو دیا۔ بڑے دکھی دل کے ساتھ میں واپس آ رہا تھا۔ زکریا اسٹریٹ کے ایک کونے پر کھڑے ایک بوڑھے مشرقی پاکستانی نے جس کے ساتھ سکڑے سمٹے دو بچے بھی بیٹھے تھے بھیک مانگنے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ان کی حالت دیدنی تھی! مجھے بجائے رحم کے ان پر غصہ آ رہا تھا۔

"تم سالا ایک دم بے غیرت ہے! ادھر آزادی کا نعرہ لگاتا ہے ادھر اپنی عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔" میں نے کلکتہ لہجے میں اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم دھوکے میں مارا گیا صاحب۔ ہمارے ساتھ بہت بلم (ظلم) ہوا۔ ادھر موزیب (مجیب) ہم سے بولا' پنجابی تم پر بلم کرتا ہے' تمہارا حق کھاتا ہے۔ ادھر اندرا حکومت ہم سے بولا ہم تمہیں بھات دے گا' تمہیں بچائے گا۔ تم پنجابیوں سے لڑو۔ صاحب ہمیں موزیب اور اندرا نے مار ڈالا۔ صاحب! ہم بے غیرت نہیں ہے۔ ہم بزدل بھی نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنوں نے مار ڈالا۔" وہ قریباً" سسکیاں لے کر رونے لگا۔

○○○

بوڑھا مانجھی میرے سامنے ہاتھ پھیلائے ندامت کے آنسو بہا رہا تھا—— لیکن میرے سامنے اس سے پورا پاکستان ابھر آیا تھا۔

—— جہاں کی سنہری ریت پوری آب و تاب سے چمک اٹھتی تھی اور جہاں کی مٹی سے سر نکالنے والے پٹ سن کے ریشے میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے تھے۔ جہاں کے لہلہاتے کھیتوں میں دور دور تک بچھی ہوئی دھان کی فصلیں مجھے شوق نظارہ دینے لگی تھیں۔

—— اور جہاں اس وقت آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ آہ! سنہری اور روپہلی آفتابی کرنیں کس شوق سے دریاؤں پر حد نگاہ تک پھیلی ہوئی زمین پر سونا بکھیر رہی تھیں۔

"خدایا! کیسا پیارا لگتا ہے یہ سنہری دیس میرا——" میرے ہونٹوں پر جب یہ فقرہ لرزنے لگا تو میری آنکھیں مانجھی سے دوچار ہو گئیں—— اس کے ہاتھ بدستور میرا دل ٹٹولنے کی

کوشش کر رہے تھے۔

میں بھی پھٹی پھٹی نظروں سے اس بوڑھے مانجھی کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھوں میں اب بھی طوفانوں کا سینہ چیرنے کی سکت تھی لیکن جسے بے دست و پا کر کے اس کے لیڈروں نے چانکیہ کے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے لا کر پھینک دیا تھا۔

——اور وہ مفرتوں کی طرح ان سے لپٹے ان کا خون چوس کر اپنی ازلی پیاس بجھا رہے تھے۔

میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے—— لیکن میں اتنا مجبور تھا کہ ان کے سامنے رو بھی نہ سکا۔ مبادا کوئی سی۔ آئی۔ ڈی والا میری اس حرکت سے مجھے مشتبہ نہ سمجھ لے۔ میں تو اپنے پورے پاکستان کے مانجھی سے یہ بھی نہ کہہ سکا "بدبختو! اب بھی وقت ہے اپنوں میں واپس پلٹ جاؤ۔ صرف وہیں تمہارے لئے امان ہے ورنہ دنیا کا کوئی گوشہ تمہارے لئے محفوظ نہیں—— اپنی ڈار سے بچھڑ جانے والی کونجیں کرگسوں کا شکار بن جایا کرتی ہیں۔"

بس چپ چاپ جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھما کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا اور یہ بات میرے پیشے کے اصولوں سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ جلد ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور—— گھر لوٹنے سے پہلے اپنے مقامی "دوستوں" سے رابطہ قائم کر کے انہیں اپنے ٹھکانے سے آگاہ بھی کر دیا اور ضروری ہدایات بھی حاصل کر لیں۔

لیکن جب چیسن کے ہاں پہنچا تو ایک کانٹا بدستور میرے دل میں پیوست تھا اور وہ تھا—— مشرقی پاکستان کی بہنوں کی رحم طلب نگاہیں! میری بدنصیب بہنوں کی بدنصیب فریادیں۔

○○○

پانچ بجے کے قریب ایک اور شخصیت کا نزول ہوا۔ یہ بسواس تھا۔ ان لوگوں کا مقامی لیڈر۔ بسواس نے بھی مصافحہ کرنے میں خاصی گرمجوشی دکھائی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پانچ چھ اور نوجوان اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب میری طرح "انڈر ٹریننگ" تھے۔

بسواس اور چیسن نے ہمیں قریباً" ایک گھنٹہ تک کیموزم پر لیکچر دیا۔ بادل نخواستہ مجھے بھی دوسروں کی طرح ان کی الٹی سیدھی سننی پڑیں۔ ازاں بعد ہم نے سجاتا کی بنائی ہوئی چائے زہر مار کی۔ دوران لیکچر تو کسی کو آنکھ جھپکنے کی بھی اجازت نہیں' لیکن اس کے بعد کامریڈ سجاتا سے بے ہودہ مذاق کرنے لگے تھے۔ بسواس چلا گیا تو اس کے بعد ایک ایک کر کے باقی لوگ بھی چلے گئے۔

میں اور اشوک شام ڈھلنے کے بعد سجاتا کی معیت میں وہاں سے چلے آئے۔ سجاتا ہمیں کلکتہ

کے تنگ و تاریک محلوں اور پرتعفن گلیوں میں گھماتی بالآخر ایک بلڈنگ کے سامنے لے آئی جس میں کم از کم پچاس کنبے مقیم تھے۔ اسی کے ایک کونے میں ایک کمرہ ہمارے لئے بھی موجود تھا۔ میرے رویے نے اسے کچھ الجھن میں مبتلا کر دیا تھا' جس کا اظہار اس کی مختلف حرکات سے ہو رہا تھا۔ اشوک البتہ اسے خاصا انجوائے کر رہا تھا۔ ایک بات جو میں نے اب تک خاص طور سے نوٹ کی تھی وہ یہ کہ یہ لوگ زیادہ تر گنجان آباد علاقوں میں ٹھکانہ کرتے تھے ورنہ عموماً" سننے میں یہی آتا تھا" ایسی تنظیمیں اجاڑ اور ویران مقامات پر بسیرا رکھتی ہیں۔"

میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میں یہاں ایک سیلز ایجنٹ کی حیثیت سے قیام کر رہا ہوں اور اپنے اصولوں کے مطابق وہ لوگ کسی کی پرائیویٹ لائف میں دخل بھی نہیں دیتے تھے۔

—— سجاتا ہمیں اگلے روز کے پروگرام کے متعلق ضروری ہدایات دے کر چلی گئی۔ اشوک نے میرے ساتھ سفر کے دوران اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ پینے پلانے کے معاملے میں' میں بالکل "کنزرویٹو" ہوں---- شراب خانے پر وہ اسی لئے اکیلا ہی چلا گیا جب کہ میں نے "ڈھابے" کا رخ کیا---- وہاں سے میں جلد ہی واپس آ گیا اور آتے ہی سونے کی فکر کرنے لگا۔

ooo

لیکن نیند تھی کہ عنقاء ہو گئی۔

---- صبح جو کلکتا دل میں پیوست ہوا تھا' اب وہ میرے سارے جسم کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ مشرقی پاکستان کی مکمل داستان میرے سامنے بکھری پڑی تھی---- اور وہ کہانی میرے لاشعور سے زندہ پیر کی طرح انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی۔

اس تقدس مآب دھرتی سے ستمبر ۶۵ء میں Crush India کا نعرہ ابھرا تھا۔ یہ سلوگن لے کر پورے پاکستان کے جوانوں' بچوں' بوڑھوں اور عورتوں نے بڑے بڑے جلوس نکالے تھے۔ انہوں نے اپنے قول ہی سے نہیں' عمل سے بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ شہید ٹیپو میر اور سراج الدولہ کے جانشین ہیں۔ فسٹ بنگال ٹائیگر نے اپنے جسموں کی آہنی دیواریں بھارتی سورماؤں کے سامنے چن دی تھیں۔ وہ عمل و عزم کی ایسی ناقابل تسخیر دیوار بن گئے تھے جس سے سر پٹخ پٹخ کر چانکیہ کے خونخوار چیلوں کے زہریلے عزم تڑخ گئے تھے۔

مجھے وہ بوڑھی عورت یاد آ گئی جو بھات دال لے کر جیسور کی سرحد پر مورچہ زن لٹھ کے شیروں کے پاس آئی تھی۔ اس نے سسکیاں لے کر بتایا کہ اس کے بچے صبح سے بھوکے ہیں' شام کو بوڑھا چاول لایا تو انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ پہلا حق ہمارے ماں اور جان پر

ہمارے جیالوں کا ہے۔

آج اسی بوڑھی ماں کے بچے جنہوں نے بھوکے ہوتے ہوئے بھی اپنے فوجیوں کے لئے کھانے سے انکار کر دیا تھا' ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے مکار ہندو نے محبت کی شبنم کو نچوڑ کر وہاں نفرت کی چنگاریاں بھر دی تھیں۔

الٰہی اتنی بڑی اور زبردست تبدیلی کیسے آ گئی؟ کس نے سیدھے سادھے مائیوں کو اپنے بھائیوں کے خون کا پیاسا کر دیا۔ دو بھائیوں کے بیچ کروڑہ کی مضبوط دیوار کس نے چن دی۔ کس نے کپاس کا سونا پیدا کرنے والے کسان کے ہاتھوں سے تخلیق کی قوت چھین کر اسے فنا کے زہریلے ترشول تھما دیئے۔

سیالدہ سے ورغلا کر اجاڑے گئے پاکستانیوں کے قافلے جب جھوٹی امیدوں کے سہارے کلکتہ پہنچے تو ان کا استقبال منوجی کے صدیوں سے تربیت یافتہ بھیڑیئے کرتے۔ پہلے ہی ہلے میں وہ ان کی شہ رگ سے سارا خون پی کر انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر پھینک دیتے۔

پھر "کلی" کے پجاریوں کا خونی رقص شروع ہو جاتا اور وہ بدنصیب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے خونی جبڑے کا شکار ہو جاتے۔ ان کی عصمتیں' عفتیں' خاک میں مل جاتیں۔ تاریخ خود کو دہرانے لگتی اور تقسیم کے واقعات دوبارہ زندہ ہونے لگتے۔

ooo

صبح اٹھ کر میں نے اشوک سے اجازت لی اور ایک قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔ دوپہر تک جب میں واپس آیا تو میرے پاس اچھا خاصا آرڈر پر کاش کے لئے موجود تھا اور اگلے مشن سے متعلق ہدایات بھی مل چکی تھیں۔

حسب حکم قریباً" تین بجے چین کے گھر جا کر بسواس کا لیکچر ہضم کرنا پڑا۔ وہیں سے ہم لوگ دو دو کی ٹولیوں میں ایک تفریح گاہ میں پہنچے۔ تفریح گاہ سمندر کے کنارے بنائی گئی تھی جہاں ایک لانچ ہمارے لئے تیار کھڑی تھی—— اس علاقے سے متعلق میری معلومات صفر تھیں۔

جس وقت ہم اس جزیرے میں پہنچے' سورج سمندر کے گہرے پانیوں میں ڈوب رہا تھا۔ یہ جزیرہ غیر آباد دکھائی دے رہا تھا۔ مخالف سمت کھڑی ماہی گیروں کی مچھلیاں پکڑنے والی لانچوں سے یہ احساس ہوتا تھا جیسے یہ جزیرہ یہاں مچھلیاں پکڑنے والوں کا وقتی مسکن ہے۔ بعد میں میرے علم میں یہ بات آئی کہ یہ لوگ مکمل باڑی ہی تھے جو ماہی گیری کے بھیس میں یہاں قیام کرتے تھے اور یہ جگہ ایک طرح سے ان کے ٹریننگ سینٹر کی حیثیت رکھتی تھی۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ علم ہوا کہ تخریبی کارروائیوں کی انسٹرکٹر سجاتا ہے۔ میری طرح یہاں تین اور نئے "شکار" بھی موجود تھے۔ ہم چاروں کو سجاتا نے پستول کا استعمال کرنے سے متعلق بتانا شروع کیا اور جب عملی مظاہرے کا وقت آیا تو میری کارکردگی اس سے بھی بہتر تھی۔ پہلے ہی روز میں نے انہیں "دستی بم" بھی استعمال کر کے دکھادیا۔ ان باتوں کا تذکرہ میں اشوک سے لدھیانہ میں کر چکا تھا اور ان لوگوں کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ ماضی میں سمگلروں کے ایک گروہ سے وابستہ رہ کر سیکھا تھا اور بوقت ضرورت میں اس سے بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکوں گا۔

پہلے ہی روز کی کارکردگی نے ان لوگوں کو میری پوشیدہ صلاحیتوں کا قائل کر دیا اور بسواس کے حکم پر مجھے باقاعدہ انقلابی تسلیم کر لیا گیا۔ کافی دیر گئے تک ہماری ٹریننگ ہوتی رہی۔ ہمیں جھپٹ کر حملہ کرنے اور بھاگنے سے متعلق بسواس نے خود تربیت دی---- وہ ایک منجھا ہوا کمانڈو دکھائی دیتا تھا اور یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی تربیت کسی خاص غیر ملکی ایجنسی نے کی ہے۔ وہاں موجود اسلحے کا تعلق بھی ایک خاص ملک سے تھا جو بظاہر تو حکومت بھارت کا یار غار تھا لیکن اندر جانے اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھا۔

قریباً" آدھی رات کے بعد ہماری تربیت مکمل ہوئی---- ہمارے سونے کا بندوبست بھی اسی جزیرے میں کیا گیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد ماہی گیروں کے بھیس میں مختلف ٹولیوں کی شکل میں ہمیں اسی طرح واپس لایا گیا جس طرح ہمیں وہاں پہنچایا گیا تھا۔ ساحل سمندر سے ہی ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچے تھے۔ اشوک پرانا کارکن ہونے کی وجہ سے خاصا محتاط ہو چکا تھا اور مجھ سے صرف مطلب کی گفتگو ہی کیا کرتا تھا۔ وہ تو اوپر کمرے میں چلا گیا' میں نے قریبی ہوٹل کا رخ کیا۔

اپنی تربیت کے مطابق ہوٹل میں میں ایک علیحدہ کیبن میں بیٹھا تھا۔ یہ دوسرے درجے کا معمولی سا ہوٹل تھا لیکن یہاں زیادہ تر شرفا قسم کے لوگ ہی آیا کرتے تھے۔ ایک بیرے کو میں نے چائے لانے کو کہا۔ چائے اور ایک بند لفافہ اکٹھے ہی مجھ تک پہنچے تھے۔ لفافے سے ایک چھوٹا سا رقعہ برآمد ہوا۔ یہ میرے دوستوں کی طرف سے میرے لئے نیا حکم تھا' جس کی تعمیل مجھے آج ہی کرنی تھی۔ میں نے تمام مقامات اور ہدایات کو ذہن نشین کیا اور کاغذ کو لفافے سمیت تلف کر دیا۔

ooo

واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے اشوک سے کہا کہ ایک واقف کار اچانک مل گیا ہے۔

اگر میں نے آج رات اس کے پاس قیام کرنے کی دعوت مسترد کر دی تو وہ خواہ مخواہ شک میں پڑ جائے گا' اس لئے آج مجھے چھٹی پر ہی سمجھا جائے۔ اشوک نے حسب توقع مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں رات قیام کہاں کروں گا۔ وہ خود پنجابی تھا اور اسے علم تھا کہ بہت بڑی تعداد میں پنجابی کلکتہ میں مختلف مقامات پر روزگار پر لگے ہوئے ہیں اور دوسرے صوبوں میں ایک واقف کار پنجابی کا دوسرے سے ملنا اس کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگلے روز صبح ملاقات کا وعدہ کر کے میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

جانے سے قبل میں نے پرکاش کے نام یہاں سے موصول شدہ آرڈر اور حالات لکھ کر خط پوسٹ کر دیا تھا۔ جس میں اسے کہہ دیا تھا کہ مال بذریعہ بلٹی بھیج دے۔ میں مقامی مارکیٹ میں دے کر پیسے وصول کر لوں گا اور واپس آ جاؤں گا۔ مجھے معلوم تھا اس عمل میں کم از کم دس پندرہ دن لگیں گے اور اتنے عرصے کی مہلت ہی مجھے درکار تھی۔

پونم کو میں نے علیحدہ خط لکھا تھا جس میں باجو جی سے متعلق کی جانے والی جعلی کوششوں کی روئیداد سنائی تھی۔ اس کی جدائی کا رونا اور جلدی واپسی کا وعدہ! جس شدت سے وہ میری منتظر تھی مجھے اس کا احساس تھا۔ میں نے اسے ماتا اور موہی جی کا دل بہلائے رکھنے کو خاص طور سے لکھا تھا کہ میری غیر موجودگی میں اسے گم سم رہ کر گھر والوں کو پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا۔

شام تک کا وقت میں نے اپنے ٹارگٹ سے متعلق مقامات کے تفصیلی مطالعے میں بسر کیا۔ فرار کے امکانات کا بھرپور جائزہ لیا اور رات کو قریباً" دس بجے میں ساحل سمندر کے نزدیک ایک مخصوص مقام پر دیکا آنے والے حالات کا منتظر تھا۔ میں نے سادہ لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اندھیرے کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے بھی یہ ڈھلتے چاند کی رات تھی۔ سمندر میں بہت دور کہیں کہیں مختلف بحری جہازوں کی روشن بتیاں کسی تھال میں رکھے ننھے سے دیپے کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ یہ علاقہ بندرگاہ سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا اور کسی بھی وقت ساحلی محافظوں کے اس طرف آ نکلنے کے امکانات بھی موجود تھے۔ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی پرشور لہریں مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ساحلوں سے سر پٹختیں جھاگ اڑاتیں واپس اپنے پانیوں میں غرق ہو رہی تھیں۔ میں لہروں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جہاں سے ہندوستان کا ماضی ابھرتا ڈوبتا اور میرے ذہن کو مختلف دھاروں پر بہاتا رہا۔

کبھی تو میرے تصور میں مسلمان مفتوحوں کے وہ بحری بیڑے ابھرتے جو انہی سرکش موجوں کو چیرتے سمندری طوفانوں سے ٹکراتے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئے اور براہمنوں کے غرور کو پاؤں تلے روندتے انہی ساحلوں سے آگے بڑھ کر سارے ہندوستان پر چھا

گئے۔ ان کی شمشیر جہاں گیر کچھ انداز سے جمائدار ہوئی کہ بت صنم خانوں میں سہم سہم گئے۔ سمندروں کی لہروں نے ان کی عظمتوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آہن پوش لشکریوں کے سیلاب اُن کی مجاہدانہ یلغار سے یوں ڈر کر بھاگے جیسے سورج کی تیز شعاعیں اندھیروں کو چاٹ جاتی ہیں۔ بلند و بالا اور مضبوط قلعے اُن کے جگر شگاف نعروں سے دہل گئے۔ نخوت اور غرور و تکبر کے بڑے بڑے لات و منات ان کے جذبوں کی شدت سے زمین بوس ہو گئے۔ انہوں نے مہا بھارت کا طلسم پاش پاش کر دیا اور کالی کے خونخوار پجاریوں کو وہ سبق سکھایا کہ ان کی جھوٹی تاریخ کو ان کے زعم سمیت غرق ہونا پڑا۔

تصویر کا اگلا منظر بدلتا تو عیسائی راہبوں کے بجرے کلکتہ کے پانیوں میں ابھرتے اور سفید چمڑی والے سیاہ دلوں کے مالک سوداگر نظر آئے جو تاجر بن کر آئے اور لٹیرے بن کر یہاں قابض ہو گئے۔ مسیحائی کے روپ میں انہوں نے ایسی ایسی نشتر زنی کی کہ تاریخ کے سینے میں سیاہ شگاف ڈال دیا۔ ٹیپو میر اور سراج الدولہ ایسے ہزاروں شہیدوں نے اپنے مقدس خون کا نذرانہ انہی ساحلوں کی نذر کیا تھا۔ اس دھرتی نے کتنے شہیدوں کا خون پیا اور پیاسی کی پیاسی ہی رہی۔

آج پھر چانکیہ کے خونخوار بھیڑیے انہی ساحلوں سے اٹھ اٹھ کر پورے پاکستان کی تقدس مآب دھرتی کا رخ کر رہے تھے۔ لہو کی چاٹ ان کو کشاں کشاں اس طرف بہائے لئے جا رہی تھی۔

ooo

قریباً دو گھنٹے مجھے یہاں ہونے کو آئے تھے۔ میں بار بار بیتابی سے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لیتا اور دوبارہ میری نظریں سمندر کے پرشور لہروں پر محیط ہو جاتیں۔ دو گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد امید کی کرن اندھیرے میں اُس ٹارچ کی روشنی بن کر اُبھری جو ایک سٹیمر سے جو ساحل سے آلگا تھا چمکی تھی۔ یہ سٹیمر صرف اس لحاظ سے تھا کہ اس میں ایک انجن فٹ تھا ورنہ تو کشتی ہی تھی اور میرے خیال کے مطابق آنے والوں نے اس کا انجن کچھ فاصلے پر بند کر دیا تھا اور وہ اسے چپوؤں اور لہروں کی مدد سے یہاں تک لائے تھے۔

ٹارچ کی سبز روشنی تین بار وقفے وقفے سے جل کر بجھی تھی۔ جواب میں، میں دھڑکتے دل سے اپنی جگہ سے باہر نکلا اور ساحل پر پہنچ کر جواب میں وہی "سگنل" دہرایا۔ سگنل موصول کرتے ہی میں نے سٹیمر کو کنارے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میں وہیں ساحل سمندر پر زمین سے چپکا آنے والے واقعات کا منتظر تھا۔ اندھیرے میں ایک سایۂ کو میں نے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں پکڑے پستول کے دستے پر میری گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی۔

نووارد نے یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ میرے قریب پہنچ چکا ہے۔ تیز سرگوشی میں "کوڈ ورڈ" دہرایا۔ جواب میں میں نے بھی زمین سے اٹھتے ہوئے اسے مخصوص جواب دیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے لیکن میری طرح اس نے بھی اپنا چہرہ کچھ اس طرح چھپا رکھا تھا کہ سوائے ہماری آنکھوں یا ماتھے کے کچھ حصے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ہم نے کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا اور مطمئن ہوتے ہی آنے والے نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک سربمہر لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لفافہ وصول کرتے ہی اسے اپنی جیکٹ میں محفوظ کر لیا۔ ابھی بمشکل ہم نے یہ عمل مکمل کیا تھا کہ فضا میں اچانک بوٹس کے انجنوں کی زوردار آواز گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی سمندر میں اس جگہ سے کچھ فاصلے پر کھڑے جہاز کی اوٹ سے دو تیز رفتار بوٹس بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہماری طرف بڑھتی نظر آئیں۔

"خدا حافظ!" میں نے اپنے ساتھی کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"گڈ لک!" اس نے بھی جواب میں وہی عمل دہرایا۔

اس کے ساتھ ہی میں اندھیرے میں رینگ گیا۔ ابھی بمشکل چند گز ہی بھاگ پایا تھا کہ میرے عقب میں نیوی کی گشتی گن بوٹ پر نصب ۱۔ ایم ایم فائر سے "ہالٹ" کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی میرے تعاقب میں سرچ لائٹ کی تیز روشنیاں بھی لپکیں۔ "ہالٹ" کی گو بردار آوازوں کا گلا فائرنگ کی زد ٹٹ سے ٹوٹا۔ میرے دوست شاید ساحل پر پوزیشن لے کر انہیں آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ اس طرح اصل میں وہ مجھے یہاں سے نکل جانے کا موقعہ فراہم کر رہے تھے۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اگر میں بھاگتا بھاگتا زمین بوس نہ ہو جاتا تو گن بوٹس کی طاقت ور مشین گنوں سے میرے تعاقب میں آنے والی گولیاں مجھے چاٹ جاتیں۔ میں نے انہی ساحلی جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی تھی جن میں کچھ دیر پہلے میں چھپا تھا۔ اندھیرے میں سرخ شعلے ایک قطار کی صورت میں سر سے کچھ اوپر دائیں بائیں سے گزرتے مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میرا دل اپنی تیز ترین دھڑکنوں کے ساتھ جانے کیسے ابھی تک میرے پہلو میں موجود تھا۔ کانوں میں فائرنگ کی زوردار آوازوں سے زیادہ شوں شوں اور شائیں شائیں گونج رہی تھی جو عموماً ایسے ماحول میں دل و دماغ کو گھیر لیتی ہے۔ ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔

لیکن ——! یہ ساری وقتی کیفیت تھی جو صرف چند لمحوں کے لئے مجھ پر طاری ہوئی اور جب چند سیکنڈ بعد میرا ذہن بیدار ہوا تو سب کچھ خلاؤں میں کھو گیا۔ اب میں تھا اور میری

جولانیاں ——!!

میری شریانوں میں انگارے تڑپنے لگے تھے۔ خطرے کے احساس نے ساری توانائیاں مجتمع کر کے مجھ میں سمو دی تھیں۔ میری آنکھیں آگ اگلنے لگیں اور جسم میں ایسی پھرتی سما گئی کہ جیسی حملے کے وقت چیتے میں سما جاتی ہے۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں لڑھکتا' کرونیں بدلتا' اٹھ اٹھ کر بیٹھتا اور بیٹھ بیٹھ کر اٹھتا میں بمشکل تین چار منٹ کے بعد ان کی رینج سے نکل چکا تھا یا کم از کم اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ اٹھ کر تیز رفتاری سے بھاگ سکوں اور اگلے چند منٹوں میں' میں دیوانہ وار اپنے ذہن میں حفظ شدہ ایک سمت کا تعین کر کے بھاگ رہا تھا۔ اس اثناء میں کچھ سائے بھی مجھے اپنے دائیں بائیں بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی دوست تھے جو اپنا سیٹر پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میری سماعت بھاگتے بھاگتے ایک زور دار دھماکے کی آواز سے لرزی اور میں لڑھکنیاں کھا کر گر پڑا۔ یہ اس ٹائم بم کا کرشمہ تھا جو میرے ہمرائیوں نے اپنے سیٹر میں نصب کر رکھا تھا۔ ایسے ٹائم بم گھیرے میں آ جانے کی صورت میں سمگلر اپنی لانچوں اور سیٹر سے بھاگتے بھاگتے ان میں نصب کر دیا کرتے ہیں تاکہ بحریہ یا پولیس کو ان کے خلاف کوئی شواہد ہاتھ نہ آ سکیں۔ ان لمحوں میں جب کوئی اچانک گھیرے میں آ جائے' عموماً" ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور ہر شخص سوائے اپنی جان بچانے کے اور کسی بات کی فکر نہیں کرتا۔ ایسے حالات میں اپنے حواس قائم رکھنا اور بم نصب کرنا جان جوکھوں کا کام ہے لیکن ایسے جانبازی کے مظاہرے کلکتہ کے ساحلوں پر سمگلروں کے ہاتھوں انجام پا جاتے ہیں' جب کہ میرے ساتھی بہرحال ان سے افضل تھے۔

○○○

میں سنبھل کر اٹھا اور دوبارہ اسی سمت میں بھاگنے لگا۔ زور دار دھماکے کی آواز نے مشین گنوں کی چیخم دھاڑ تھوڑی دیر کے لئے خاموش کر دی تھی۔ اس مرتبہ جب دوبارہ انہوں نے چلانا شروع کیا تو اُن کی آواز میں وہ پہلے والا غیظ و غضب نہ تھا۔ مدھم پڑتے پڑتے قریباً" دس منٹ کے بعد ہی اُن پر سکتہ طاری ہو گیا لیکن میری رفتار میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں اسی تیزی سے دوڑ رہا تھا جس سے میں نے شارٹ لیا تھا۔ قریباً" بیس منٹ تک دوڑنے کے بعد میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور میں بری طرح ہانپنے لگا۔

تحفظ کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنی رفتار کم کر دی لیکن رکا نہیں۔ میں نے اب بھاگنے کی بجائے چلنا شروع کر دیا تھا اور اس سڑک تک آ پہنچا تھا جو شہر کی طرف جا رہی تھی۔ قریباً" پانچ منٹ کے بعد میری بے قابو سانسیں سکون آشنا ہوئیں' سڑک کے کنارے سے ہٹ کر میں اپنی

منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اس "پوائنٹ" پر پہنچ کر جو میرا مقصود تھا۔ میں نے اس لفافے کو "ڈیڈ ڈراپ" کر دیا۔

"لفافہ" کو محفوظ طریقے سے منتقل کر دینے کے بعد میں خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

"کلکتہ دن کو سوتا اور رات کو جاگتا ہے۔" اس سنے سنائے فقرے کی آج عملی تفسیر دیکھنے کو ملی۔ حالانکہ وہ سڑک جس سے میں گزر رہا تھا اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی' پھر بھی ہر آٹھویں دسویں منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی سواری اس پر سے گزر رہی تھی۔ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو سرِشام ہی ساحلی علاقوں میں بنی کلب نما تفریح گاہوں کا رخ کرتے اور رات کے دوسرے پہر جب شراب اور شباب کی تباہ کاریوں سے نڈھال ہو جاتے تو اپنی اپنی کمین گاہوں کو واپس پلٹتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد بدقماش اور سمگلر ٹائپ لوگوں کی ہوتی تھی۔

مجھے پیدل چلتے اب ڈیڑھ دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور شہر ابھی خاصا دور تھا۔ اب سڑکوں پر پیدل لوگ بھی ٹکرانے لگے تھے کیونکہ میں اس علاقے میں داخل ہو چکا تھا جہاں عموماً" ملاحوں کے لئے شراب خانے بنے ہوئے تھے۔ ایک "بار" کے سامنے جا کر میں ٹھہر گیا۔ باہر لٹکے نیون سائن سے یہی دکھائی دے رہا تھا کہ کوئی شریفانہ قسم کی بار ہے لیکن اندر گھستے ہی اپنی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ میں یہاں محض اس لئے آ گیا تھا کہ چند منٹ بعد جب باہر نکلوں تو میرے پاس "پوچھ گچھ" کا جواز موجود ہو گا لیکن اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ یہ "بار" کسی "ولوا" کی زد میں آئی ہوئی تھی اور اس کے گرگے مختلف کونوں میں ڈیرے جمائے بیٹھے تھے۔ قریباً" ہر دوسری میز پر جوا ہو رہا تھا۔

میں اندر داخل ہوتے ہی کچھ پریشان سا ہو گیا اور چاروں طرف خواہ مخواہ چور نظروں سے دیکھنے لگا۔ داخلے سے پہلے میں نے اپنی وضع قطع مقامی لفنگوں جیسی بنا لی تھی' میرا گریبان سامنے سے کھلا تھا اور گلے میں ایک سرخ رنگ کا رومال بندھا تھا۔ ایسے حلیے میں ہی ایسی جگہوں پر جایا جاتا ہے لیکن یہاں ایک بھول مجھ سے ہو گئی۔ جو میرا ذہن اس بات کی طرف نہ گیا کہ اس بار میں مقامی "ولوا" کا عمل دخل بھی ہو سکتا ہے جس کے لئے میں یقیناً اجنبی تھا اور کسی اجنبی "گرگے" کا کسی مقامی "ولوا" کی حدود میں گھس آنا ایسی خطرناک سرحدی خلاف ورزی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

"ابے کیا دیکھتا ہے۔" میری گدی پر پڑنے والے زوردار ہاتھ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں بابا! پردیسی آدمی ہے ادھر سالا ایسے ہی آ گیا۔" میں نے اپنی خفت مٹاتے اور قریباً ڈرتے ہوئے اسے موٹے تازے کرخت الشکل شخص سے کہا جو میرا مخاطب تھا۔

"کیا بکتا ہے' دادا کو گالی دیا ہے سالا!" شراب کے نشے سے دھت ایک غنڈے نے لڑکھڑاتے ہوئے میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ اب پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا کیونکہ آنے والے کے ہاتھ میں وہ مخصوص چابک نظر آ رہا تھا جو مقامی بدمعاشوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جیسے ہی وہ میرے قریب چابک لہراتا ہوا پہنچا' میری دائیں ٹانگ اوپر اٹھی' کچھ تو اس کی ڈگمگاہٹ اور اوپر سے میری زوردار لات جس نے کنپٹی پر لگتے ہی اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے اور وہ چابک سمیت الٹ کر پیچھے جا گرا۔ بار میں موجود باقی لوگ اس دوران سانس روکے ہم پر ٹکٹکی جمائے بیٹھے رہے۔

اس کے گرتے ہی کلکتہ کے بدمعاشوں کے پاس موجود ایک خاص وضع قطع کے چاقو کی کڑکڑاہٹ گونجی اور دوسرے ہی لمحے کونے والی میزوں سے دو غنڈے اٹھ کر خطرناک ارادے سے میری سمت بڑھنے لگے۔ معاملہ دو ہی غنڈوں کا ہوتا تو میرے لئے کوئی بات نہیں تھی لیکن یہاں تو قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ میں نے پھرتی سے پستول نکالتے ہوئے انہیں للکارا۔ آگے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے' اپنے پہلو میں کھڑے موٹے کو میں نے بے خبری میں اتنی زور دار لات رسید کر دی کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے رکھی میز سے ٹکرا گیا۔ اس اثناء میں' میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک فائر بوڑے سے بلب پر کیا اور مین سوئچ آف کر کے پھرتی سے باہر نکل گیا۔ میرے پیچھے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میرا رخ بار کے ایک کونے میں کھڑی ٹیکسی کی طرف تھا جس کے دروازے سے ٹیک لگائے ایک مریل سا ڈرائیور کسی سواری کا منتظر تھا۔

"بنگلہ باسی۔" میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی کہا۔

"ادھر نہیں جانے کا صاب۔" اس نے بڑی نخوت سے جواب دیا۔

"کیا بکتا۔۔۔ چلو۔" میں نے پستول اس کی طرف لہراتے ہوئے اسے دو چار گالیاں بک دیں۔

"چلے گا صاب' چلے گا۔" اس نے خوف سے تھرتھراتے ہوئے جواب دیا۔

دوسرے ہی لمحے ہم دونوں اندر تھے۔ خیریت گزری گاڑی کا انجن ٹھیک ٹھاک تھا اور پہلے ہی ایکسیلیٹر پر سٹارٹ ہو گئی۔ جس وقت ڈرائیور نے گیئر بدلا تو بار کے دروازے سے ایک طوفان بدتمیزی زوردار آواز میں گالیاں دیتا نمودار ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی سواری نہیں تھی

ورنہ مجھے یوں بچ کر کوئی نہ جانے دیتا۔

"تیز چلو' تیز!" میں پچھلی سیٹ سے ڈرائیور کو دھمکاتا رہا۔ وہ پوری رفتار سے ٹیکسی بھگا رہا تھا۔

پولیس کی کسی گشتی جیپ سے ٹکراؤ کا کسی بھی وقت امکان تھا۔ غنڈوں کے تعاقب کا خطرہ بھی موجود تھا۔ ایک آبادی کے نزدیک پہنچ کر میں نے ٹیکسی روکنے کا حکم دیا۔ اس کی توقع سے بڑھ کر نوٹ اس کی طرف پھینکے اور اسے فوراً ٹیکسی وہاں سے بھگا لے جانے کو کہا۔ ڈرائیور کبھی تو نوٹوں کی طرف دیکھتا تھا کبھی حیرانگی سے میری طرف۔ اسے مجھ سے ایسے سلوک کی توقع ہرگز نہ تھی۔ "شکریہ صاب" کہہ کر اس نے ٹیکسی بھگا دی۔

میں بجائے آبادی میں گھسنے کے اس کی مخالف سمت میں چلنے لگا۔ رات گزارنا میرے لئے مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ پولیس کی نظروں سے چھپ چھپا کر کسی نہ کسی طرح میں نے وہ رات بسر کی اور دوپہر کے نزدیک اپنے شریفانہ حلیئے میں واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا لیکن اشوک کی بجائے یہاں ایک اور شکل نے میرا استقبال کیا۔ یہ تھی سجاتا۔۔۔!

"کہاں رہ گئے تھے؟" اس نے چھٹتے ہی پوچھا۔

"اس بات کا جواب دینا کیا ضروری ہے؟" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں اور اس لئے کہ ہم اپنے کامریڈ کے متعلق جاننے کا حق رکھتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے ابھی تک کسی نے مجھے پرائیویٹ لائف کے متعلق بھی روز نامچہ درج کروانے کو نہیں کہا۔"

"مسٹر پرکاش آپ ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔"

"مس سجاتا آپ میرے پھٹے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہی ہیں۔" میں نے دوبارہ جواب دیا۔

چند لمحوں تک وہ ٹکٹکی باندھے مجھے گھورتی رہی۔ میں بھی ہونقوں کی طرح منہ پھلائے کھڑا رہا۔

"ٹھیک ہے ابھی نئے آئے ہو جلد ہی تمہیں علم ہو جائے گا کہ سینئرز کا احترام کرنا چاہیئے۔"

"مجھے اس بات سے انکار کب ہے کامریڈ۔ آپ مجھے تحریک سے متعلق کوئی بھی حکم دیں' میں تعمیل کروں گا۔" میں نے ایک پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سجاتا کے ساتھ ایسا سلوک شاید آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ بگڑی ہوئی رئیس زادی تھی۔ گھر میں بھی اسے حاکم کی حیثیت حاصل تھی اور یہاں بھی۔ میرا مغرور قسم کا رویہ اور

مار دھاڑ سے متعلق پہلے سے تربیت یافتہ ہونے نے اسے بہرحال کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"کامریڈ برامت ماننا۔" اس نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آل رائیٹ۔" میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"او کے۔ جیسی تمہاری مرضی۔" کہہ کر وہ کمرے سے ملحقہ رسوئی میں چلی گئی۔

تین دن تک یہی معمولات رہے۔ دن کو لیکچر ہضم کرنا پڑتے اور رات کو وہی ٹھائیں ٹھائیں اور دوسری تخریب کاری کی ٹریننگ۔ مارشل آرٹ سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار میں نے ان کے سامنے پہلی ملاقات ہی میں کر دیا تھا اور دوران تربیت ان کے کہنے پر تین چار مرتبہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا تھا۔ سجاتا کے رویے میں اب خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ میں نے اس کی نظروں میں اپنے لئے احترام اور محبت کے ملے جلے جذبات موجزن دیکھے تھے۔ وہ دوسروں کو تو اسی لہجے میں مخاطب کرتی تھی جس کی وہ عادی تھی لیکن میرے ساتھ گفتگو کرتے وقت وہ سنجیدہ ہو جاتی تھی۔

ooo

اگرچہ میرے "مقامی" دوستوں نے مطلع کر دیا تھا کہ جو کانٹا میرے سینے میں پیوست ہے۔ اس سے نجات کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ: کہ جیسے تیسے بھی ہو شیام بنیرجی کا پتہ کاٹ دیا جائے! تو پھر--- مریض کے زخم کسی حد تک مندمل ہو سکیں گے۔

شیام بنیرجی کلکتہ کے مقامی دلالوں کا سب سے بڑا خریدار تھا--- مشرقی پاکستان سے اغوا شدہ بدقسمت لڑکیوں کا سب سے بڑا بیوپاری۔ وہ کلکتہ کے ٹاک ایکسچینج کا پریذیڈنٹ بھی تھا اور مہاسبھائی غنڈوں کا مقامی سربراہ بھی!

وہ بھارتی حکام کی مدد سے کوڑیوں کے مول اس مال کا سودا کرتا اور پھر ان بدبخت لڑکیوں کو بڑے منظم طریقے سے مشرق وسطیٰ کی منڈیوں میں فروخت کرتا۔ اس کام میں مہاسبھائی غنڈے اپنے سربراہ کا پورا پورا ساتھ دیتے اور وہ کمتی باہنی سے مل کر اس کاروبار میں معقول منافع کما رہا تھا۔

--- اس طرح حاصل شدہ آمدنی کا آدھا حصہ مشرقی پاکستان کی تخریبی کارروائیاں سرانجام دینے والوں کو دے کر وہ حکومت کا قرب بھی حاصل کر چکا تھا۔ دولت اور عزت حاصل کر کے اس نے حکومتی ایوانوں میں اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ جس سے نئی پولیس والے اس کا پانی بھرنے لگے تھے اور وہ خود بھی انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن گیا۔ اب اس تک "رسائی" کیسے؟

--- یہ فکر دن رات مجھے پریشان کرنے لگی تھی اور راستہ مجھے کوئی نہیں دکھائی دیتا تھا---

میرے اندر شیام بنیرجی کے خلاف نفرت کا جو لاوا کھول رہا تھا اگر وہ جلد نہ پھٹ جاتا تو ایسے زہریلے کی صورت اختیار کر لیتا جس کے ہاتھوں میری روحانی موت واقع ہو جاتی۔ میں محمد بن قاسم نہیں تھا کہ اس کی طرح کسی مسلمان خاتون کی پکار پر "لبیک" کہہ سکتا۔ زندگی نے نہ اتنے وسائل دیئے اور نہ ہی وہ منصب سرفراز کیا۔ لیکن میرے لاشعور میں ابھی وہ مجاہد زندہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے پاکستان کی بہو بیٹیوں کو اس درندے کے ہاتھوں نامراد ہوتے دیکھا تھا۔ میں یہ سب کچھ لاکھ مصلحت کوش ہونے کے باوجود کیسے برداشت کرتا۔

قریباً ایک ہفتے کی ٹریننگ کے بعد ہمیں مشن سونپ دیا گیا--- پہلا مشن نئے کامریڈ خود اپنے لئے منتخب کرتے تھے اور حال ہی میں پھنسنے والے دوستوں کا چونکہ میں ہی گروپ لیڈر تھا' اس لئے قرعہ میرے نام پڑا۔

ان لوگوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ نئے تربیت یافتہ کامریڈ سے "انتقاب دشمن" شخصیت کا انتخاب کرواتے اور اس شخصیت پر کونسل میں باقاعدہ بحث کی جاتی تھی--- زیادہ تر اسی بات کا جائزہ لیا جاتا کہ: "یہ انتخاب کہیں ذاتی مخالفت کا شاخسانہ تو نہیں؟"

اور ابھی میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ سجاتا ہمارے کمرے میں آ گئی--- اس کے ہاتھوں میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ وہ آتے ہی کہنے لگی۔

"پرکاش! لو اب آپ کے فائنل امتحان کا بھی وقت آ گیا۔"

"امتحان میرا کلکتہ میں ہو گا یا ڈھاکہ میں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جواب تلاش کرنے لگا تو وہ بولی:

"--- یہ لو' ان کاغذات پر تین شخصیتوں کے نام درج ہیں۔ کونسل سے میں اجازت لے آئی ہوں' اب آپ بتائیں کہ--- ان میں سے کس شخصیت کو آپ اپنے لئے منتخب کرتے ہیں۔"

میں نے کاغذات اس کے ہاتھ سے لے لئے--- اس میں تین نام درج تھے اور ہر ایک کے کوائف بھی اس کے ساتھ ہی قلمبند کئے گئے تھے۔ پہلا نام چیٹرجی کا تھا' دوسرا سبھاش بابو اور تیسرا--- شیام بنیرجی--- میں نے اسی نام پر انگلی رکھ دی۔

وہ حیران ہو کر مجھے ٹٹولنے لگی لیکن--- اس کے بارے میں یہ دلیل کافی تھی کہ وہ انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے اور پولیس والوں سے سازباز کر کے اس نے مکتی باڑیوں کو مسلسل جانی اور مالی نقصان پہنچائے ہیں۔

سجاتا میرے انتخاب پر مسکرائی۔ "فکر نہ کرو--- اس مہم میں' میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

اس نے نظریں مجھ سے ملانے کی کوشش کی لیکن میں سوچنے لگا تھا۔ ایک آدھ موذی کے مر جانے سے مہاسبھائیوں کا کچھ نقصان تو نہیں ہو گا' البتہ---- پُورو پاکستان کی بچیوں کی قیمت کا سودا کرنے والے کو سزا دے کر یقیناً میں اس درد کا مداوا کر سکوں گا جو میرے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔" اب میں وقت اور دن کا انتظار کرنے لگا۔

ooo

اسی روز لدھیانہ سے ٹرک بلٹی بھی بذریعہ ڈاک موصول ہو گئی۔ پرکاش نے ایک لمبا چوڑا خط بھی اس کے ساتھ ہی لکھا تھا جس میں اس نے مجھ سے التجا کی تھی کہ میں بزنس کو پرماتما کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں اور اس کے لئے نہیں تو کم از کم یُونم کے لئے ہی فوراً" واپس لوٹ آؤں۔ اتمام حجت کے لئے اس نے مال بھیج دیا تھا۔

میں نے ٹرکوں کے لڑے سے پتہ کیا تو پنجاب سے دو دن کے بعد مال پہنچنے کی خبر ملی۔ میں نے پرکاش کو لکھ دیا کہ مال کی تقسیم اور بل وصول کرتے ہی میں واپس آ جاؤں گا۔

شیام بنیرجی کو بم کے دھماکے سے ہلاک کرنے کا پروگرام طے ہوا۔

بنکسل باڑی اگر چاہتے تو اسے گولی کا نشانہ بھی بنا سکتے تھے لیکن ان کا مقصد قتل سے زیادہ دہشت پھیلانا ہوتا ہے اس لئے عموماً" وہ ایسے ہی طریقے اختیار کیا کرتے تھے---- اس کی رہائش کلکتہ کی ایک جدید اور ماڈرن طرز کی کالونی میں تھی جو سمندر کے نزدیک حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ جہاں رہائش پذیر لوگوں میں سے کوئی بھی کروڑ پتی سے کم نہیں تھا۔ بنیرجی کو بھی دوسرے امیر لوگوں کی طرح تکنس باڑیوں کا دھڑکا لگا رہتا۔ اس لئے اس نے اپنی کوٹھی پر خصوصی پہرے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

اس کی حفاظت حکومت کے آدمی نہیں بلکہ مہاسبھائی غنڈے کرتے تھے۔ کوٹھی پر چوبیس گھنٹے پہرہ لگا رہتا تھا۔

---- بنیرجی کو قتل کرنے کی مہم کی کمان سجاتا کو سونپی گئی تھی۔ اس کے ساتھ میں اور دو مقامی ورکر تھے۔ ہمارے پاس شیام بنیرجی کے معمولات کا ریکارڈ موجود تھا اور یہ بات ہماری صوابدید پر منحصر تھی کہ ہم اسے کسی نائٹ کلب میں مارنا پسند کرتے ہیں یا اس کے دولت خانے پر۔

سجاتا نے میرے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد اس کے گھر کا انتخاب کیا تھا کیونکہ سستا" سنسان علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں فرار کے مواقع زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے دونوں ساتھی نئے تھے اور ایسی کسی بھی مہم میں وہ پہلی مرتبہ حصہ لے رہے تھے۔ ان سے یہ امید کرنا کہ وہ بھرے

پرے مجمع میں کوئی کارنامہ کر گزریں گے' ذرا مشکل ہی نظر آتا تھا۔

شیام بنیرجی کی واپسی قریباً" گیارہ بجے رات کو ممکن تھی۔ ہمارے دونوں مقامی کامریڈز ضروری سازوسامان سمیت سرشام ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ جب کہ میں اور سجاتا دس بجے کے قریب ایک بھاری بھرکم رائل فیلڈ موٹر سائیکل پر وہاں پہنچے۔ سجاتا نے اینگلو انڈین لڑکیوں کا بھیس بدل رکھا تھا۔ اس کے بیگ نما بٹوے میں دستی اور دھواں پھیلانے والے بم موجود تھے۔ موٹر سائیکل ڈرائیونگ کا کمال میں نے اسے اچھی طرح دکھایا تھا اور اس سلسلے میں اس کی بے اختیار واہ بھی وصول کر لی تھی۔

آبادی سے کچھ فاصلے پر درختوں کے ایک جھنڈ کے نزدیک ہمارا ایک ساتھی پہلے سے ہی منتظر تھا۔ اس سے تازہ ترین رپورٹ حاصل کر کے ہم نے اسے آگے بھیج دیا۔ سجاتا کی ہدایت پر میں نے موٹر سائیکل کو وہیں چھپا دیا تھا۔ خود ہم دونوں بھی وہیں چھپ کر بیٹھ رہے۔ ایک کھلونا نما ننھا سا ٹرانسمیٹر ہمارے پاس موجود تھا جس کی رینج بمشکل پندرہ بیس میل تک تھی۔ ایسے ٹرانسمیٹر کلکتہ کے دوسرے درجے کے بدمعاشوں کے پاس بھی عام طور پر ہوتے تھے۔ شیام بنیرجی جس نائٹ کلب میں رنگ رلیاں منا رہا تھا اس کے باہر ہمارا ایک اور ساتھی اسی قسم کے ٹرانسمیٹر کے ساتھ موجود تھا۔ جیسے ہی شیام بنیرجی وہاں سے چلتا' اس کی اطلاع ہمیں مل جاتی۔ جس کے بعد ہی اصل میں ہمارا کام شروع ہونا تھا۔

سجاتا اور میں چپ چاپ ایک دوسرے سے ٹیک لگائے آنے والے حالات کے منتظر تھے۔

"کیا محسوس کر رہے ہو؟" اس نے بڑا ذومعنی سا فقرہ کہہ کر سکوت توڑا۔

"نارمل۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کامریڈ میں اتھیسٹ (ملحد) ہوں۔ یہ میری پہلی مہم بھی نہیں' تمہیں بھی علم ہو گا کہ میں نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری تھی۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میرا یہ فعل اچھا تھا یا بُرا....."

"تمہارے پاس احساس کرنے کے لئے وقت ہی کہاں ہے؟" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو' میں بے حس ہو چکی ہوں۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طور سے' لیکن آج مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ میرے ہاتھوں درجنوں کامریڈ تربیت پا کر نکلے ہیں۔ خود مجھے چارو موزمدار نے تربیت دی تھی' لیکن جب سے تمہارے ساتھ ملاقات ہوئی ہے مجھے کچھ بے کلی سی لگی رہتی ہے۔ ایک عجیب طرح کا احساس کبھی کبھی ذہن پر چھا جاتا ہے۔ میں محسوس

کرنے لگتی ہوں کہ میں غلط تھی اور غلط ہوں۔ جو عظیم مقصد لے کر میں آئی تھی وہ تمام بننے تو بکھر کر رہ گئے۔ میں بری طرح پھنس چکی ہوں' ان لوگوں کے بیچ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں....."

"پھر بھاگ کیوں نہیں جاتیں۔" میں نے اس کی بات اُچک لی۔

"کاش تمہیں اس بات کا جواب دے سکتی لیکن نہیں۔ تین چار ماہ ہمارے ساتھ رہو گے تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں شاید تمہیں ورغلانے یا تحریک سے تمہاری وفاداری کا امتحان لینے کے لئے ایسی باتیں کر رہی ہوں۔۔۔ تمہیں سوچنا بھی یہی چاہیے' لیکن ایسی بات نہیں۔ اگر تم یہ سب کچھ ہائی کمان تک پہنچا دو تو جانتے ہو میرا انجام کیا ہو گا؟" چند لمحے توقف کرنے کے بعد اس نے کہا "ایک بدترین موت۔۔۔" پھر وہ خاموش ہو کر خلاؤں میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ شاید اپنا چھنا ہوا ماضی تلاش کر رہی تھی۔

اس کی گفتگو میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے کچھ دیر کے لئے اُس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔۔۔ میں اُس کے لئے اب خاصی ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔ میری توقعات کے برعکس وہ صرف عورت ہی نکلی تھی۔

"سجاتا تمہاری باتوں پر غور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے جس طرح ڈرامائی انداز میں' میں نے اس تحریک کو اپنایا ہے اسی طرح کسی روز چھوڑ کر چلا جاؤں۔ مجھے نہ کسی نے یہاں آنے کے لئے مجبور کیا ہے اور نہ کوئی مجھے جانے سے روک سکے گا لیکن نجانے میں یہ کیوں چاہتا ہوں کہ شیام بیرجی بھی کتے کی موت مارا جائے۔" میرے منہ سے آخری فقرہ بالکل لاشعوری طور پر نکلا تھا۔

"پرکاش مجھے علم ہے' مجھے یہ بھی علم ہے تم پرکاش نہیں ہو!" میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ وہ بہرحال ایک تربیت یافتہ تخریب کار تھی۔ یہ بھی ممکن تھا اس کے روابط کسی غیر ملکی ایجنسی سے رہے ہوں' کیونکہ ایسی تحریکیں ان کے تعاون کے بغیر نہیں چلا کرتیں۔

"بڑا زبردست ڈائیلاگ بولا ہے کامریڈ۔" میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ میری آواز پرسکون رہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں رینگ گیا۔

"پرکاش تم جو کوئی بھی ہو' مجھے اس سے غرض نہیں' لیکن تم نے اپنی صلاحیتیں آزمانے کے لئے غلط میدان منتخب کیا ہے۔"

ابھی اس کی بات بمشکل مکمل ہوئی تھی جب اس کی گود میں رکھے ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول

ہوا۔ "کم آن کامریڈ" اس نے ٹرانسمیٹر آف کرتے ہوئے مجھ سے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور موٹر سائیکل کے پہلو میں لٹکے تھیلے سے سٹین گن نکال کر اس میں میگزین فٹ کرتا ہوا واپس آ گیا۔ ہم دونوں نے وہاں سے اٹھ کر سڑک کے کنارے اگی جھاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ بیرجی کے تعاقب میں ہمارا ساتھی بھی آ رہا تھا۔ اس نے ہی ہمیں بیرجی کی گاڑی کی نشاندہی کرنی تھی۔ یہ سڑک کچھ زیادہ آباد نہیں تھی کیونکہ یہ کالونی کو آنے اور جانے کا راستہ تھا۔ عام شاہراہ نہیں تھی۔ ہماری موجودگی کے دوران بمشکل دو یا تین کاریں یہاں سے گزریں تھیں۔

دھڑکتے دل کے ساتھ سڑک پر نظریں جمائے سٹین گن تھامے میں سجاتا کے ساتھ بیرجی کا منتظر تھا۔ جب سڑک پر بہت دور روشنیاں جگمگائیں۔ اس کے ساتھ ہی سجاتا کا ٹرانسمیٹر جاگا۔

"آ رہا ہے' کاریں دو ہیں۔" مختصر سا پیغام ملا اور سلسلہ ختم۔

دوسری کار میں یقیناً اس کے محافظ ہوں گے۔ سجاتا نے فوراً" دونوں مقامی ساتھیوں کو جو یہاں سے کچھ فاصلے پر تھے اپنے نزدیک پہنچنے کا حکم دیا تاکہ مقابلے کی صورت میں تناسب برقرار رہے۔

ٹرانسمیٹر اپنے بیگ میں رکھ کر اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ دبایا۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اس لمحے سارے جہان کی محرومیاں سمٹ آئی تھیں۔ مجھے وہ قاتلہ اور خونخوار ڈائن کی بجائے کسی کانونٹ کی ننھی منی سی بچی دکھائی دے رہی تھی۔

کاریں اب لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ سجاتا میرا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے کی طرف رینگ گئی۔ ہم دونوں میں اب قریباً" آٹھ دس گز کا فاصلہ ہو چکا تھا۔

جب اگلی کار اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرنیڈ کار کے آگے پیچھے اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔۔۔

دوسری کار والوں نے بریک لگانے میں خاصی تیزی دکھائی تھی لیکن وہ بھی اس دھماکے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور کار ڈرائیور کے کنٹرول سے باہر ہو کر سڑک کے کنارے لگے ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ سجاتا تیزی سے واپس میری طرف پلٹی لیکن ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ دوسری کار میں سوار لوگ تربیت یافتہ معلوم ہوتا تھے۔ بیرجی کی جلتی کار کی روشنی میں' میں نے تین سایوں کو چھلانگیں لگاتے دیکھا جنہوں نے زمین پر گرتے ہی تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ انہوں نے شاید سجاتا کو بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کی پشت میں لگیں اور وہ لڑکھڑا کر مجھ پر آ رہی۔

میں نے لیٹے لیٹے پہلو بدلا اور سٹین گن کا فائر اس طرف کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے دونوں ساتھیوں نے قریب سے فائرنگ شروع کر دی۔ کارسواروں نے ہماری تعداد زیادہ دیکھ کر جان بچانے میں ہی عافیت سمجھی اور بھاگ اٹھے۔ دو بھاگتے ہوئے مہاجر بھائی تو میری سٹین گن نے چاٹ لئے جب کہ تیسرے کو مارنے کی سعادت دوسرے کامریڈ نے حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سجاتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اٹھانا چاہا جو زمین پر لیٹی کراہ رہی تھی لیکن سجاتا اٹھ نہ سکی۔ میں نے اسے کندھے پر لادا اور موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگا دی۔

موٹر سائیکل کے قریب پہنچنے تک وہ نیم بیہوش ہو چکی تھی۔ اس کے تمام کپڑے خون میں تر تھے۔ فائرنگ آٹومیٹک رائفل سے کی گئی تھی جس کی گولیاں جسم میں گھسنے کے بعد پھٹتی ہیں اور اندرونی نظام کو کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا لیکن سجاتا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ اب وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے سہارا دے کر اسے درخت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ خود اس پر جھکا تاکہ اس کے زخموں کا جائزہ لے سکوں۔

"پرکاش ٹھہرو میری بات سنو' میرے پاس وقت کم ہے۔" اس نے نحیف سی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

"سجاتا حوصلہ کرو۔" میں اس کے علاوہ اسے اور کیا کہتا۔

"پرکاش میں اب بچ نہیں سکتی' مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ میری آخری مہم ہے۔ مجھے تم پر کوئی حق نہیں' میں بہت بری عورت ہوں۔ مجھے علم ہے پرکاش تم مجھ سے نفرت کرتے ہو' میں ہوں ہی نفرت کے قابل لیکن مرتے وقت مجھے اقرار کرنا ہے کہ میں اپنی فطرت کے خلاف تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ یہاں سب نے مجھے کھلونا جان کر مجھ سے کھیلا ہے۔ تم..... تم....." اس کی آواز لڑکھڑانے لگی' میری حالت غیر ہو رہی تھی۔

"سجاتا پرماتما کے لئے ایسی بات نہ کہو---- تم بہت گریٹ ہو۔ سجاتا تم نے عظیم انقلاب کے لئے....."

"اپنے باپ کو مار ڈالا....." اس نے میری بات خود مکمل کر دی۔

"نہیں پرکاش' یہ سب بکواس ہے..... کوئی انقلاب نہیں آئے گا..... سب ذلیل لوگ ہیں دوسری حکومتوں سے مال کھاتے ہیں..... پرکاش مجھے چھوڑ دو تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔" اس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں سجاتا! میں چلا جاؤں گا' میں تمہیں بھی....." میں نے تیزی سے کہنا چاہا لیکن اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

"سارے جیون میں صرف ایک..... تم..... آئے..... تھے' وہ..... وہ بھی....."

اس نے ایک لمحے کے لئے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہچکی کے ساتھ اس کی اکھڑی سانسوں کا تانا بانا منتشر ہو گیا۔

میں ابھی تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مرنے کے بعد اس کی تمام کرختگی اور نحوست ختم ہو چکی تھی اور اس کے چہرے پر ملائمت اور معصومیت سمٹ آئی تھی اور وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا اور حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ آیا جہاں کسی بھی لمحے پولیس کی آمد متوقع تھی۔ میں نے ریزہ ریزہ دل کے ساتھ اس کو زمین پر لٹا کر اس کی تلاشی لی اور تمام اشیاء اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں۔ اسے آرام سے زمین پر لٹا دیا تاکہ اس کی پرسکون نیند میں خلل نہ آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی میں بڑے دکھی دل سے موٹر سائیکل کو ان محفوظ راستوں پر اڑائے لئے جا رہا تھا جو فرار کے لئے ہم نے پہلے ہی سے منتخب کر رکھے تھے۔ محفوظ ٹھکانے پر کامریڈ میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔

صبح کے اخبارات میں شیام بنرجی کی موت کی خبر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی اور---- پولیس نے اس کی موت کا ذمہ دار بھی نکسل باڑیوں ہی کو ٹھہرایا۔

---- اس خبر کے ساتھ ہی ایک گمنام لڑکی کی لاش کی تصویر بھی چھاپی گئی تھی جس پر پولیس نے مجرموں کی ساتھی ہونے کا شک ظاہر کیا تھا اور ہم نے بھی اپنی ہنگامی میٹنگ میں اس بدنصیب حسینہ کی موت پر اسے خراج تحسین پیش کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے بھلا دیا۔

میرے اس پہلے ہی کارنامے نے اس حلقے میں میرا وقار بڑھا دیا اور میں یہ سوچنے لگا تھا: "دیکھیں میرے لئے اب کون سا محاذ تجویز کیا جاتا ہے؟"

ooo

دو تین روز بعد پرکاش کے یہاں سے بلنیاں بھی موصول ہو گئیں اور میں نے مال چھڑا کر گاہکوں میں تقسیم کر کے اپنی جیبیں پیسوں سے بھر لیں۔

دراصل اب میری تربیت تو مکمل ہو چکی تھی اور میں پنجاب واپس جا رہا تھا۔ روانگی سے قبل میں چیئرمین سے ملنے گیا تو وہ کہنے لگے۔ "کامریڈ' تمہیں اگلا مشن بھی سونپ دیا گیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا تو اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ تھرکنے لگے---

"سوامی دیانند کو قتل کرنا ہو گا!"

"وہ کیوں——؟"

میں کہتے کہتے رک گیا—— میرے کانوں میں سجاتا کے یہ الفاظ گونجنے لگے۔ "ابھی نئے نئے ہو' تمہیں جلد ہی علم ہو جائے گا کہ سینئرز کا احترام کرنا چاہیئے۔ تعمیل حکم کرنی چاہیئے اور بس!"

○○○

اس مرتبہ میں نے سفر اکیلے ہی کیا تھا۔ اپنی آمد کی اطلاع میں نے بذریعہ تار پرکاش کو دے دی تھی اور میری توقعات کے مطابق لدھیانہ کے ریلوے سٹیشن پر پونم' سدرشنا اور پرکاش میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے میں پردیس سے لمبی مدت گزار کے واپس آ رہا ہوں۔ خوشی سے پونم کا چہرہ تو خصوصاً گلنار ہو رہا تھا۔ حجاب و حیا کی سرخیاں اس کے گالوں پر پھیل پھیل جاتی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میں اکثر کٹ کے رہ جاتا' کیونکہ جلد یا بدیر اب ہمیں الگ ہو جانا تھا۔ پھر بھی بادل نخواستہ مجھے اس بلائے جان کھیل کو آخری ایکٹ تک کھیلنا تھا۔

سٹیشن سے ہم سیدھے کارخانے میں چلے آئے تھے جہاں سدرشنا کے لئے خرید کردہ تحائف میں نے اس کے حوالے کر دیئے۔ آج تک کسی نے اس سے ایسی عملی محبت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ تحائف وصول کرتے ہوئے اس کی حالت دیدنی تھی۔ "بھیا" کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ جب میں نے اسے خود سے الگ کیا تو اس کے گالوں پر آنسو پھسل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ سدرشنا نے ابھی تک یہ بات پرکاش سے چھپائی ہوئی تھی کہ اس کی سگائی ہونے والی ہے۔ اب تک معاملہ صرف اس کی ضد کی وجہ سے رکا ہوا تھا اور اس کے پتا جی نے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگانے کی دھمکی دے دی تھی۔ یہ باتیں اس نے مجھے علیحدگی میں بتائیں' لیکن عورت تھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے وہ ان کا تذکرہ مجھ سے پہلے پونم سے کر چکی تھی۔

پرکاش جس رفتار سے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ رہا تھا اس پر سب کی نظریں تھیں۔ متاعی مارکیٹ کی حد تک اس نے اپنا مقام بنا لیا تھا اور اب وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ ہم سدرشنا کے پتا سے اس کے رشتے کی بابت بات کر سکیں' لیکن بابوجی کے جیل میں ہوتے ہوئے یہ ذکر کچھ عجیب سا بھی دکھائی دیتا تھا دوسری طرف اگر ان کی رہائی کا انتظار کیا جاتا تو بات بگڑ سکتی تھی۔ جس طوفانی محبت میں وہ دونوں مبتلا تھے دوسری جگہ شادی کی صورت میں اس کا نتیجہ دونوں کی تباہی کے علاوہ اور کیا نکل سکتا تھا۔

میں نے سدرشنا کو تسلی دی اور اس کے کہنے پر وچن بھی دیا کہ اس کی شادی سوائے پرکاش کے اور کسی کے ساتھ نہیں ہو گی۔ اس بات میں ایک طرح سے میری ذہنی تسکین کا بھی کسی حد تک سامان موجود تھا۔ کم از کم ان سے بچھڑنے سے پہلے انہیں ایک خوبصورت یاد تو سونپ سکتا تھا۔ سدرشنا گھر چلی گئی تو ہم تینوں رائے کوٹ چلے آئے جہاں ماتا اور موسی جی سالگ رام کے ساتھ موجود تھیں۔ جس طرح ایک مہینہ انہوں نے دن گن گن کر گزارا تھا اس کا اندازہ میں ان کے رویے سے بخوبی لگا سکتا تھا۔

یہاں پہنچ کر مجھے بابوجی سے متعلق کی جانے والی جعلی کوششوں کی ایک لمبی کہانی ان کے گوش گزار کرنا پڑی اور انہیں میں نے یہ یقین دلا دیا کہ اب تین مہینے کے بعد بابوجی ہر صورت میں رہا ہو جائیں گے۔ ان کے خلاف نکسل ہاڑی ہونے کی کوئی شہادت حکومت کو نہیں مل سکی۔ رات کو میں نے پونم سے مشورہ کیا اور ہم اس فیصلے پر پہنچے کہ پرکاش کی شادی فوراً ہو جانی چاہیئے——!

"لیکن ماتا جی شاید یہ بات' نہ مانیں—— اور پرکاش بھی....." پونم نے میری بات سن کر کہا۔

"کیوں اس میں کون سی قباحت ہے؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اصل میں موسی جی کہہ رہی تھیں کہ بابوجی کے رہا ہوتے ہی کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر دونوں دواہ اکٹھے کر دیں گے۔" اس نے یہ بات رک رک کر اور بڑی مشکل سے مکمل کی' شرم سے اس کا چہرہ دھنک رنگ ہو رہا تھا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" میں نے اسے چھیڑنے کے انداز میں جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا' جہاں انبساط کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

پونم خاموش رہی' شرم و حیا نے اس کی زبان بند کر رکھی تھی۔

"دیکھو بھئی اپن کو تو ایسی کوئی جلدی نہیں ہے اور پھر تم کہیں بھاگی تو جا نہیں رہی۔ جب کہ اس طرف معاملہ دوسرا ہے۔ پھر یہ ڈبل شادیوں کا چکر کچھ ٹھیک نہیں لگتا مجھے—— آدمی اپنی شادی میں شریک ہو یا دوسرے کی شادی میں شرکت کرے۔" میں نے آرام کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا مہاشے جی جیسی آپ کی اچھیا۔ اب داسی کے لئے کیا حکم ہے؟" اس نے موضوع بدلنے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرا جواب سن کر وہ قریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی

چائے کے ساتھ ہوئی' لمبے سفر نے مجھے تھکا ڈالا تھا۔ رات کو جلد ہی میں نیند کی دیوی کی آغوش میں سما گیا اور میرا لاشعور ساری رات مجھے مشرقی پاکستان اور کلکتہ کے گلی کوچوں میں گھماتا رہا--- سجاتا ابھی تک میرے حواس پر سوار تھی۔ ایک مہاسبھائی درندے کو موت کی نیند سلانے کے بعد اب مجھے اپنا آپ کچھ ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ میرے انتقام کی آگ تو شاید کبھی سرد نہ پڑ سکے' لیکن ایک طمانیت سی ضرور محسوس ہونے لگی تھی۔

ooo

صبح بیدار ہو کر ناشتہ کرتے ہی میں نے لدھیانہ کا رخ کیا۔ "دوستوں" کو اپنی آمد سے مطلع کر کے میں نے مقامی تحریک سے رابطے کی ٹھانی جہاں میرے متعلق اطلاعات پہنچ چکی تھیں۔

سوامی دیانند ابھی تک گردش دوراں کا شکار تھا۔ سوائے اس کے اندھے عقیدت مندوں کے اور کوئی بھی اس کے آشرم کے نزدیک پھٹکنے کو تیار نہیں تھا۔ نکسل باڑی اسے مارنے پر کیوں تلے تھے؟ اس کی کوئی خاص وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی سوائے اس کے کہ وہ اسے زیر عتاب دیکھ کر کوئی پرانا قرضہ چکانے کے چکر میں نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ سوامی جی سے یہ بعید نہیں تھا کہ انہوں نے تحریک کو نقصان پہنچایا ہو اور نکسل باڑی اپنے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اس بات کا اندازہ میں نے قیام کلکتہ کے دوران ہی لگا لیا تھا۔ اگر حالات ان کے خلاف ہو جائیں تو وہ تھوڑی دیر کے لئے دم سادھ لیتے ہیں' لیکن اپنے قول سے ہٹتے ہرگز نہیں اور موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ پھر جب ذرا سا بھی موقع ملتا' وہ اپنا کام کر گزرتے تھے۔

اُن کی اس عادت کے پیش نظر ان کی دہشت سے بھارت کے در و بام کانپ رہے تھے۔ ایسے تمام لوگ جو ان کی بلیک لسٹ میں آ جاتے--- ان کے لئے زندگی اجیرن ہو جاتی تاوقتیکہ موت کا بے رحم پنجہ انہیں نہ دبوچ لے۔

خفیہ ٹھکانے پر میرا استقبال اُسی سکھ کامریڈ نے کیا جس نے مجھ سے پہلی ملاقات کی تھی--- منوہر سنگھ کو میرے متعلق خفیہ ہدایات پہنچ چکی تھیں اور یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ میں تحریک کے بڑوں کی نظر میں محض ایک کارنامہ انجام دینے کے بعد ہی آ چکا ہوں۔ اس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ میں سوامی جی کے درشن کر چکا ہوں۔

"اب مہاتما کے پرلوک سدھارنے کا بندوبست بھی آپ ہی کریں گے کامریڈ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

چائے کا دور مکمل ہوتے ہی اشوک بھی وہیں آ گیا اور ہم تینوں سر جوڑ کر سوامی جی کی

"پرلوک یاترا" کا پروگرام طے کرنے لگے۔ ایک متفقہ فیصلے پر پہنچنے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

ہمارا پروگرام اگلے تین روز کے بعد طے پایا۔

ooo

دو روز کے بعد باجوہ جی سے ملاقات کا دن آ رہا تھا جس کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ اسی روز مجھے دو اہم باتوں کا فیصلہ کرنا تھا۔ نکسل باڑیوں سے تعاون جاری رکھنا اور پرکاش کی شادی کا فیصلہ کرنا۔

منوہر سنگھ اور اشوک سے ملاقات کر کے میں نے بجائے کسی سواری کے پیدل ہی پرکاش تک جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ لدھیانہ چھوڑے ایک ماہ قریباً ہونے کو آیا تھا اور حالات اتنی تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے کہ اگلے پل کا گمان نہیں ہوتا تھا کہ اب کیا ہو جائے؟ عوامی سوچ کے دھارے بھی حالات کے ساتھ ہی بدلتے ہیں اور بھارتی جنتا کے وچاروں سے آگاہی حاصل کرنا میرے لئے اتنا ہی ضروری تھا جتنا کھانے کے ساتھ پانی پینا۔

میں ماتا رانی چوک کے قریب ایک ہوٹل میں جا گھسا۔ یہ عام سا ہوٹل تھا جہاں عموماً سفید پوش قسم کے لوگ آ کر بیٹھا کرتے تھے' لیکن اندر خانے یہاں کیا ہوتا ہے اس کا علم مجھے اسی روز ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا--- اس ہوٹل میں زیادہ تر مقامی دفاتر کے کلرک وغیرہ آ کر بیٹھا کرتے تھے اور ایسے لوگوں کو سیاسیات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہوتی ہے اور اپنی معلومات جتانے کو شوق بھی! یہاں عموماً ایسی باتیں سننے کو مل جاتی تھیں جو واقعی خفیہ فائلوں میں ہی درج ہو سکتی ہیں۔

میں تو اپنے چکر میں یہاں آیا تھا جب کہ یہاں ایک دوسرا چکر چل رہا تھا--- میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی تھی جس کے چاروں اطراف میزوں پر بابو لوگ اونچی اونچی آوازوں میں مصروف بحث تھے۔ بظاہر میں چائے کی چسکیاں لیتا ہوا اخبار کے مطالعے میں غرق تھا' جب کہ میرے کان ان کی طرف لگے تھے کہ اچانک ایک طوفان بدتمیزی اندر گھس آیا۔ درجنوں کی تعداد میں پولیس کے مسلح جوانوں نے چھوٹے سے ہوٹل پر دھاوا بول دیا۔ وہ مرکزی دروازہ جس کے ذریعے اندر آیا اور باہر جایا جا سکتا تھا' اس پر تھانیدار اور اس کے ماتحت سپاہی رائفلیں تانے کھڑے ہو گئے۔

وہاں موجود قریباً" سبھی لوگ ہکے بکے ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہے تھے اور ابھی تک کسی کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا--- سب سے پہلے میں ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ میرا

رخ سیدھا دروازے کی طرف تھا۔

"کی گل اے؟" ایک حوالدار نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں مہاراج' چائے پی لی اب گھر جائیں گے۔" میں نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

جواب میں اس نے مجھے تین چار گالیوں سے نوازتے ہوئے آگے بڑھ کر دھکا دیا اور میں اپنے ساتھ والی میز سے ٹکراتا ایک لالہ جی پر آ رہا۔ میرا خون کھول اٹھا لیکن صورتحال دیکھتے ہی دماغ ٹھنڈا ہو گیا اور میں بھیگی بلی بن کر وہیں دبک گیا۔

تھوڑی دیر بعد منیجر کے کیبن سے چار آدمیوں کو منیجر سمیت دھکے دیتے ہوئے پولیس والے باہر لائے' یہ لوگ جوا کھیل رہے تھے۔ شاید اس ہوٹل میں کوئی بڑا منظم قسم کا چھاپہ پڑا تھا کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی پولیس وہاں موجود قریباً" بیس گاہکوں کو بھی دھکے دیتے ہوئے باہر لائی اور مجھ سمیت سب کو ایک قیدیوں والی لاری میں ٹھونس کر عازم تھانہ ہو گئی۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ میرا ذہن ہی ایک طرح سے ماؤف ہو کر رہ گیا۔ بھرے پرے بازار سے بھاگنا سوائے حماقت کے اور کیا معنی رکھتا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔

میرا خیال یہی تھا کہ پولیس وہاں صرف ملازموں کو بند کر کے باقی لوگوں کو رہا کر دے گی لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ نئے پولیس کپتان نے کارکردگی دکھانے کے شوق میں یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے اور نیک چلنی کی ضمانت دیئے بغیر یہاں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ خیریت یہ گزری کہ ابھی تک ہماری جامہ تلاشی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک سپاہی کو تاڑا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ دس دس کے دو نوٹ اس کی مٹھی میں تھمائے جو اس کی اوقات سے بہرحال زیادہ تھے' لیکن اندریں حالات اس سے کم میں کام بھی نہیں چل سکتا تھا۔

میری توقع کے مطابق اس نے مجھے موٹی آسامی سمجھا اور میری "خدمت" کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے پرکاش کی طرف دوڑایا اور مزید انعام کا "لالچ" بھی دے دیا۔ قریباً" ایک گھنٹے بعد جب پولیس تمام گرفتار شدگان کی جیبیں خالی کر کے ان کو حوالات میں بند کر چکی تھی۔ پرکاش ایک وکیل کے ساتھ فرشتہ رحمت بن کر پہنچ گیا۔ اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجسٹریٹ سے میری ضمانت قبل از گرفتاری بھی کروالی تھی' لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور تھانے دار نے میری جامہ تلاشی سے حاصل شدہ دو سو روپے اور مزید ایک سو روپے لے کر مجھے اس نصیحت کے ساتھ رہا کر دیا کہ میں آئندہ جوا نہیں کھیلوں گا۔

پرکاش کو یقین تھا کہ میں ایسی قبیح حرکت نہیں کر سکتا' پھر بھی میں اس کے سامنے نجانے

کیوں شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔

"خیریت تو ہے؟" اس نے باہر نکلتے ہی ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

"خیریت ہی گزری ورنہ ملاقات شاید جیل میں ہوتی۔" میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

"شریمان یہ شوق آپس میں کھیل کر بھی پورا ہو سکتا ہے۔" اس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یار بس اب کیا کہوں' تمہارے سامنے ذرا شرم آتی ہے۔" ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

میں نے اسے تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد درخواست کی کہ اس راز کو راز ہی رکھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اگلے دن کے اخبارات میں جوا کھیلتے ہوئے پکڑے جانے والوں میں میری تصویر شامل نہیں تھی ورنہ بعد میں یہ میرے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتی۔

ooo

اگلے روز جب ہم سب نے بابو جی سے ملاقات کی۔ میں نے ان سے علیحدگی میں گفتگو کر کے انہیں تمام واقعات سے آگاہ کیا اور اپنے کارنامے کا ذکر بھی کر دیا۔ بوڑھے کامریڈ نے میری بات سن کر مجھے تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ چینتن سے آشنا تھے' میں نے جان بوجھ کر انہیں اگلے مشن سے آگاہ نہ کیا۔ پھر گھر والوں کے سامنے ہی میں نے انہیں پرکاش کے متعلق تمام واقعات سے آگاہ کر دیا اور ان سے درخواست کر دی کہ وہ ہمیں پرکاش کی شادی کی اجازت دے دیں۔ سب گھر والے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ میں یہ بات کہوں گا' لیکن میرا واسطہ ایک حقیقت پسند بوڑھے سے تھا جو کبھی یہ نہ چاہتا کہ اس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی خوشیاں چھن جائیں۔ وہ خوشیاں جو ان سے روٹھ چکی تھیں اور ایک لمبی مدت کے بعد انہوں نے انہیں منایا تھا۔ بابو جی چند لمحے تک کچھ سوچتے رہے پھر انہوں نے پرکاش اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی اجازت دے دی۔ سب نے بادل نخواستہ اس فیصلے کو قبول کیا تھا۔

"دیر جی! آپ کی بات بجا لیکن یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ وہ لوگ کبھی رشتے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ تم سدرشنا کے پتا کو نہیں جانتے اور کچھ نہیں تو وہ بابو جی کے جیل میں ہونے کا ہی بہانہ بنا لے گا۔" پرکاش نے واپسی پر مجھے کہا۔

"یار تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو اور شادی کے لئے تیار ہو جاؤ۔" بھگوان نے چاہا تو ہم اسے منا ہی لیں گے۔ ایک دفعہ وہ مان گیا تو بابو جی کی رہائی کے بعد کوئی صورت نکلوا لیں گے۔ فی الحال

تو سدرشنا کی زندگی کا سوال ہے۔ پھر تم ہی سے نہیں اس سے بھی میرا کوئی رشتہ ہے۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

پرکاش نے بڑے جذباتی انداز میں میرا ہاتھ دبایا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مچل رہے تھے۔ اس گئے گزرے دور میں کون کسی کے لئے اتنا تردّد کرتا ہے اور ایک میں تھا کہ ان کی معمولی خوشیوں کا بھی خیال رکھتا تھا۔ بھلا میرے جیسا دھرم ویر پرکاش کو کبھی مل سکتا تھا؟

سدرشنا کے باپ سے ملاقات کے بعد واقعی بڑے بڑے حوصلہ مند ہتھیار پھینک دیتے اور اس پر لعنت بھیج کر واپس چلے جاتے' لیکن میں نے تو ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ نہ تو اسے اپنی بیٹی کی پروا تھی نہ ہی وہ نام و نسب کو اہمیت دیتا تھا۔ آخر میں اس نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے یہ کارڈ بھی پھینک دیا۔

"میرے پاس دہج (جہیز) کے لئے ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ اب بتاؤ منظور ہے رشتہ؟"

میں ماتا جی اور پونم کو پہلے ہی اس مرحلے کے لئے تیار کر چکا تھا۔ اس لئے ہم سب نے جھٹ ہاں کر دی۔ اب لالہ جی چکرائے کہ یہ کیا ہو گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے آخری داؤ بھی کھیل دیا جس میں انہیں ہارنے کی ہرگز توقع نہ تھی۔

"شادی آٹھ دس روز کے اندر ہونی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں برادری والوں کو کہنے سننے کا موقعہ نہ ملے۔ اگر میں نے دیر کر دی تو وہ لوگ مجھے کبھی ایسا نہیں کرنے دیں گے۔" انہیں امید تھی کہ باہوجی چونکہ جیل میں ہیں اس لئے ہم ان کی رہائی سے پہلے ہرگز شادی کے لئے تیار نہ ہوں گے' لیکن اسی موقعے کے لئے میں نے ان سے اجازت لی تھی۔

باقی لوگ تو خاموش رہے لیکن میں نے فوراً "ہاں" کہہ دی۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" انہوں نے ماتا جی کو تذبذب میں مبتلا دیکھ کر کہا۔

"مجھے اپنے بیٹے کی موجودگی میں اپنے سوامی کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔" انہوں نے کمال حوصلہ سے کام لے کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ پونم کے علاوہ خود میں اور موسی بھی ماتا جی کے اس جواب سے حیران رہ گئے۔

"ٹھیک ہے اگلے روز میں مہورت نکلوا کر مجھے تاریخ سے آگاہ کر دیں۔" لالہ جی بولے۔

انہیں امید تھی کہ ذات برادری کے لوگ اس فیصلے کی شدت سے مخالفت کریں گے کہ ہم اپنا وچن نبھا نہ سکیں گے۔ اس طرح وہ اپنی سپتری کے سامنے بھی سچے رہیں گے اور رشتہ بھی اپنی مرضی سے طے کر سکیں گے۔ وہ بڑے پرامید تھے کہ اس بات کا نتیجہ وہی نکلے گا جو انہوں نے اپنے ذہن میں طے کر رکھا تھا' لیکن ہم نے اسی روز شام کو "شگن" کر لیا اور ماتا جی نے

سدرشنا کو اپنی بیٹی قبول کر کے لالہ جی سے کہہ دیا کہ ہم انہیں ایک دو روز میں ہی ودلہ کی تاریخ سے آگاہ کر دیں گے۔ سدرشنا تو شدت جذبات سے مغلوب ہو کر "بھیا" کہہ کر وہیں مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

ooo

واپسی پر ہم سب رائے کوٹ آ گئے۔ میں نے سانگ رام کو بھی تھوڑی دیر کے لئے بلا لیا تھا۔ رات کو میں نے ان لوگوں کو تفصیلاً تمام باتوں سے آگاہ کیا اور ان سے کہہ دیا کہ وہ یا تو اپنے بیٹے کی زندگی اور گھر کی خوشیوں کے حق میں فیصلہ کر لیں یا پھر محلے داروں اور عزیزوں کے طعنوں سے ڈر کر بیٹے کی زندگی اور گھر کی خوشیاں داؤ پر لگا دیں۔ رات کافی دیر گئے تک ہم باتیں کرتے رہے' پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب تمام گھر والوں نے ہنسی خوشی میری بات مان لی۔

صبح ہم نے پنڈت کو بلوا کر مہورت نکلوایا اور اگلے "شبھ وار" کو شبھ گھڑی جانتے ہوئے اس تاریخ پر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہندو رسم کے مطابق فوراً گھر میں ڈھولک بجنے لگی اور محلے بھر میں خبر پھیل گئی۔ پہلے پہل تو لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی' جب گھر سے کسی نے بھی اس بات کی پروا نہ کی تو لوگوں کی زبان بھی بند ہو گئی۔

پرکاش اور سدرشنا تو میرے پاؤں دھو کر پینے پر تلے تھے۔ ان کے تو کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں سدرشنا کے اڑیل باپ کو قابو کر سکوں گا۔

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے بالیکے۔" میں نے پرکاش سے کہا اور ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

لالہ جی کو میں نے خبر کر دی تھی اور اس بات کا بندوبست بھی کر لیا تھا کہ انہوں اب بھی کوئی اڑچن پیدا کی تو ہم اس شادی کو "سول میرج" میں تبدیل کر لیں گے۔

گھر والے تو سب کچھ بھول بھلا کر شادی بیاہ کے ہنگاموں میں کھو گئے۔ جب کہ میں سوامی دیانند کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ooo

مقررہ وقت پر میں' اشوک اور منوہر سنگھ مکمل تیاری کے ساتھ سوامی دیانند کے آشرم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہماری اطلاعات کے مطابق سوامی نے آشرم سے باہر نکلنا قریباً بند کر رکھا تھا لیکن آج بدقسمتی اسے آشرم سے باہر لے آئی تھی۔ ایک "دھارمک سماگم" میں شرکت کے بعد وہ رات کو

کافی دیر گئے آشرم کی طرف واپس آ رہا تھا۔ جب اس کی کار مطلوبہ مقام پر پہنچی تو میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپے چھپے ایک سائیکل جس پر ایک گٹھڑی اس انداز میں بندھی تھی کہ دور سے اس پر بیٹھا سوار نظر آئے' اس کی کار کے آگے لڑھکا دی۔ ڈرائیور اس اچانک صورت حال سے اتنا گھبرایا کہ وہ گاڑی کو کنٹرول کرتے کرتے درخت سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اشوک اور منوہر سنگھ دونوں نے ایک ہی وقت میں دو دستی بم اس پر پھینک دیئے۔ زوردار دھماکہ ہوا اور کار کے اپنے مسافروں سمیت پرخچے اڑ گئے۔

دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ اگرچہ اپنی کارروائی سرانجام دینے کے بعد میں کافی فاصلے پر پہنچ گیا تھا' مگر اس کے باوجود منہ کے بل زمین پر آ رہا اور نہ جانے کتنی دیر یونہی پڑا رہتا لیکن فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ ہماری توقعات کے بالکل برعکس پولیس کی گشتی جیپ کا سائرن فضا میں گونجنے لگا تھا۔

نکسن باڑی تربیت یافتہ گوریلوں کی طرح منصوبہ ترتیب دیتے تھے اور انہی کے سے انداز میں اس پر کام کرتے تھے۔ میرے علم میں کم از کم ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا کہ پولیس نے کبھی کسی نکسن باڑی کو موقع واردات سے گرفتار کیا ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنی واردات کے نتیجے میں پیش آنے والے تمام ممکنہ نتائج پر غور کر کے تمام خطرات کا سدباب بھی پہلے سے ہی سوچ لیا کرتے تھے---- یہاں بھی تقریباً" ایسی ہی صورتحال درپیش تھی۔ جس جگہ ہم نے سوامی دیانند کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا' یہ سڑک ایک ذیلی سڑک تھی اور بہت کم پولیس کی پٹرول پارٹیاں اس طرف آتی تھیں۔ لیکن شاید دھماکے کی آواز نے جو چاروں طرف پھیل گئی تھی کسی پٹرول پارٹی کو صورتحال کی سنگینی کا احساس دلا دیا تھا اور وہ لوگ اب سائرن بجاتے اسی طرف آ رہے تھے۔

منصوبے کے مطابق ہم تینوں کو اب تین مختلف اطراف میں سفر کرنا تھا۔ میں تو سلامتی سے گھر جا پہنچا جب کہ دوسرے ساتھیوں کی ابھی کوئی خبر نہیں ملی تھی اور مجھے ہر لمحے پولیس کی آمد کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہیں ان میں سے کوئی گرفتار ہو جائے اور وہ پولیس کو میرا پتہ دے دے۔

علی الصبح میں نے سب سے پہلے دونوں کی خیریت دریافت کی اور جب ان کے محفوظ ہونے کی اطلاع ملی تو جان میں جان آئی---- اب ایک لمبے عرصے تک نکسن باڑیوں کو دم سادھے رکھنا تھا کہ ان کا یہی طریق کار ہے۔

اس اثناء میں میرے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کلکتہ سے واپسی پر میں نے فلائٹ لیفٹیننٹ راجکمار سے بھی ملاقات کی اور تازہ ترین صورتحال جاننے کے لئے دوسرے

ذرائع بھی بروئے کار لایا۔ پرکاش کی شادی کی وجہ سے میرے "دوستوں" نے مجھے فی الحال لدھیانہ تک ہی محدود کر دیا تھا' کیونکہ اپنے "دھرم ویر" کی شادی میں مجھے باجوی کی غیر موجودگی میں ان کا کردار ادا کرنا تھا۔

سنی دار کو پرکاش کی شادی کی خوب دھوم دھام سے ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق انجام پائی۔ فطری کمزوریاں چھپائے نہیں چھپتیں۔ جب سدرشنا اپنے گھر سے وداع ہوتے وقت مجھ سے لپٹ کر روئی تو بے اختیار میرے سینے میں ایک ہوک اٹھی۔ میری بہن جو پاکستان میں جھولی پھیلائے میری سلامتی کے لئے دست بدعا تھی۔ ساگ کا سرخ جوڑا پہنے میرے سامنے سوال بن کر آن کھڑی ہوئی اور مجھے یوں لگا جیسے میں اسے ہی الوداع کہہ رہا ہوں۔

اس روز میں بھارت میں پہلی مرتبہ بے اختیار رو دیا۔ آنسو تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ اپنا دیس' اپنی مٹی' اپنے لوگ سبھی اکٹھے ہو کر مجھے رلانے آ رہے تھے' لیکن پھر یہ روشن چراغ آہستہ آہستہ بجھتے چلے گئے---- وہ تو دور تھے مجھ سے کتنے ہی دور۔

شادی کے اگلے ہی روز سدرشنا اور پرکاش میرے ساتھ باجوی سے آشیرواد لینے گئے۔ ہم نے خصوصی درخواست پر ملاقات کی سہولت حاصل کی تھی اور سرکار نے بھی حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے اجازت دے دی تھی۔

بوڑھا کامریڈ جو خونی رشتوں سے زیادہ نظریاتی رشتوں کا قائل تھا' پہلے تو پتھر بنا دونوں کو دیکھتا رہا' پھر بلک اٹھا لیکن سیانا تھا جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پا گیا۔

"شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ اس گھر میں جو بھی خوشی آئے وہ تمہارے واسطے سے آئے۔" باجوی نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دیتا۔

ooo

پونم کی ترشنا آنکھیں مجھ سے بار بار یہی سوال کر رہی تھیں کہ میرے جیسے کی خوشیاں کب لاؤ گے پرکاش بابو---- اور میں اس سوال کی شدت ہی سے کٹ جاتا۔ میرے پاس اس کا جواب تھا ہی کیا----؟ میں اس سیاہ چشم دیوداسی کو کیسے کہتا کہ نوبان اور عود سلگا کر ساری زندگی اپنے ساکیہ منی شہزادے کی یاد میں جدائی کے گیت گاتی رہنا---- میں اسے کیونکر بتاتا کہ قدرت نے اپنی ستم ظریفی آزمانے کے لئے تمہیں چن لیا ہے۔ تم نے محبت کی جو آکاس بیل اپنے گرد منڈھ لی ہے وہ تمہیں ساری زندگی اندر سے گھن لگاتی رہے گی۔ تمہارا نصیبا تو اسی روز پھوٹ گیا تھا جس روز تم میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں اتری تھی۔ اب تو ہم دونوں

اس راکٹ کی مانند خلاء میں گردش کرتے رہیں گے جس کا رابطہ دنیا کے سائنس دانوں سے کٹ گیا ہو۔

ہاں ہمارا مقدر دریا کے دو کناروں سے مختلف کب تھا؟

صورت حال اتنی تیزی سے بدل رہی تھی اور وقت کا پنچھی یوں پر لگا کر اڑنے لگا تھا کہ میرے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

بھارتی حکومت نے اعلان جنگ تو نہیں کیا تھا لیکن اس میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ ان کے دستے مشرقی اور مغربی سرحدوں کا تقدس روزانہ پامال کرنے لگے تھے۔

اور اس پر یہ غضب ہوا کہ اگرچہ بھارتی افواج کی وحشیانہ سرگرمیوں کا دنیا بھر کو ثبوت مل گیا تھا' لیکن اقوام عالم کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔۔۔۔ انہوں نے چپ سادھ رکھی تھی اور ادھر ہماری سفارتی کوششیں بھی ناکام ہو چکی تھیں۔ جس بناء پر انہوں نے خود کو تمام اخلاقی اور بین الاقوامی ذمے داریوں سے آزاد کر لیا اور اپنی من مانی کارروائیاں کرنے لگے تھے۔

دشمن کی ان چیرہ دستیوں کے بعد ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی۔۔۔۔ اسے قبول ڈالی جائے۔

مشرقی پاکستان میں طوفانوں کا رخ موڑنے کے لئے مغربی پاکستان میں پوری سنجیدگی سے محاذ کھولنے کی کوششیں ہونے لگیں اور۔۔۔۔ اس کے لئے مجھے بھی ایک اہم مشن سونپا گیا۔

مجھے پیغام موصول ہو چکا تھا اور۔۔۔۔ اس بار میں نے اپنے ان جیالے کمانڈوز کے ساتھ کام کرنا تھا۔ جنہوں نے ۱۹۶۵ء میں بھارتی سورماؤں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا۔ میرے کان ان کی ہر آہٹ پر لگے رہتے اور نظریں بار بار بڑی بے چینی سے گھڑیوں کی سوئیوں کا جائزہ لینے لگتیں۔ کس لمحے میرے جانباز میرے دروازے پر آدستک دیتے ہیں؟

ooo

کمانڈوز کے ساتھ کام کرنے کا یہ پہلا موقع تھا جو میرے لئے کسی سعادت سے کم نہیں تھا۔ ان شیر دل جوانوں کے ساتھ میدان عمل میں کودنے کی لذت سے آشنا ہونے کے لئے میری طبیعت ایک عرصے سے بے تاب تھی۔ لیکن میرے فرائض چونکہ سپیشل سروس گروپ سے مختلف تھے۔ اس لئے اس سعادت سے ابھی تک محروم رہا۔ آج جب خوش قسمتی سے یہ موقعہ نصیب ہوا تو میری جذباتی حالت ناقابل بیان ہو رہی تھی۔

مقررہ وقت پر میں سرحدی علاقے کی ویران مسجد کے اردگرد اگی جھاڑیوں میں آکر بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے پانچ منٹ ہی گزرے تھے جب اچانک میرے دائیں طرف سے ایک مخصوص

جانور کی آواز ابھری اور خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر وہی آواز وقفے وقفے سے سنائی دی۔ یہ میرے دوستوں کی آمد کا سگنل تھا۔ میں نے بھی اپنے منہ سے ویسی ہی آواز نکالی اور وقفے وقفے سے دو مرتبہ یہ عمل دہرایا۔ جس کے جواب میں میرے نزدیک ہی پنسل ٹارچ جل کر بجھ گئی۔ بالکل اسی طرح کی چھوٹی سی ٹارچ میں نے بھی جلا کر بجھا دی اور چند سیکنڈ کے بعد ہی ایک آہٹ میرے قریب سنائی دی۔

یہ "راہبر" تھا جو مجاہدوں کو راہنمائی کرتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا اور مجھے مسجد کے قریب ٹھہرنے کا کہہ کر خود اندھیرے میں واپس رینگ گیا۔ چند منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اس کی واپسی پانچ جیالوں کے ساتھ ہوئی۔ اندھیرے میں باری باری وہ آگے بڑھ کر مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ ان میں سے چار تو جونیئر رینک کے تھے' ان کا کمانڈر ایک پٹھان کیپٹن تھا۔ اتنے عرصے بعد اپنے بہادر فوجیوں کو اپنے وطن کی وردیوں میں ملبوس دیکھ کر مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے "راہبر" کو وہیں سے رخصت کر دیا کیونکہ اس کا کام اب ختم ہو چکا تھا اور میرا کام شروع ہوا تھا۔

"راہبر" نے کچھ عجیب سی نظروں سے ہماری سمت دیکھا۔ شاید وہ بھی اس جذباتی کیفیت کا شکار تھا۔ جس نے مجھے اسیر کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ہم سے یہی التجا کر رہی تھیں کہ "مجھے بھی اس سعادت سے سرفراز ہونے کا موقع دو۔" لیکن نظم و ضبط بھی بہرحال کوئی شے ہے۔ زندگی میں کبھی کچھ جذبات ہی تو نہیں ہوتے۔

"راہبر" کے رخصت ہوتے ہی میں نے کیپٹن کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ایک سمت کو چل دیا۔

وہ لوگ اپنی ٹریننگ کے مطابق بکھر کر میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور میں ان کو لے کر یہاں سے ایک دوسرے ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا' کیونکہ میری پہلی کمین گاہ کا علم "راہبر" کو تھا اور اس کی ممکنہ گرفتاری کی صورت میں اپنے عقیدے کی سچائی کے باوجود بشری کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا قوی امکان تھا کہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنے صیادوں کو اس ٹھکانے سے آگاہ کر دے اور ہم کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لے کر مر جائیں۔

قریباً" دو گھنٹے تک مَیں اپنے ہمراہیوں کو مختلف کھیتوں' کھلیانوں' ندی نالوں سے گزارتا اب اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ جسے مَیں نے ان کے "آپریشن روم" کے لئے چنا تھا۔

یہ بھی ایک گاؤں سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر اجنا کے پجاریوں کی خباثت کا نشانہ بنی ایک شہید مسجد تھی۔ جسے منوجی کے خونخوار بھیڑیوں نے قیام پاکستان کے بعد شہید کر کے اپنی

مذہبی عصبیت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میں چاہتا تھا مسجد کے انہی کھنڈرات میں بیٹھ کر جہاں سے میرے اسلاف کی "حی علی الفلاح" کی آوازیں چاروں طرف گونج کر بت پرستی کے غرور کو خاک میں ملایا کرتی تھیں' میرے جیالے قرون اولیٰ کی تاریخ ایک مرتبہ پھر دہرائیں اور براہمنی سامراج کو خاشاک کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں۔

ایسی مساجد کے صحن میں نجانے کالی کے پجاریوں نے کتنے مسلمانوں کا لہو بہانے کے بعد انہیں شہید کیا تھا' لیکن اب وہ ان کے نزدیک پھٹکنے سے بھی ڈرتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات سما گئی تھی کہ "یہاں مقتولوں کی روحیں قیام پذیر ہیں جو کسی بھی لمحے ان کی جان لے سکتی ہیں۔" شاید اسی وجہ سے اکثر دیہاتی علاقوں میں ان شہید کردہ مساجد کے اردگرد ـــــ قریباً" میل میل کے فاصلے تک آبادی کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا نہ ہی ان کے زیادہ نزدیک کی زمین کو زیر کاشت لایا جاتا ہے۔

ایسے مناظر دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا ایسی بزدل قوم کو جو مسلمان شہیدوں کی روحوں سے خوف کھاتی ہے آخر کونسی طاقت بر سر حکومت رکھے ہوئے ہے؟ ان کے کردار کو گھن لگ چکا' ان کے پاس سوائے بے حیائی اور منافقت کے اور رہ ہی کیا گیا ہے۔ تب مجھے اپنے سوالوں کا ایک ہی جواب سوجھتا کہ اس کا سبب صرف میری قوم کی بے حسی' بر سراقتدار طبقے کی "مصلحت کوشی" اور لیڈروں کی "پریم سبھائی" ذہنیت ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک میری مقدس سرزمین پر ایسے لوگ بزعم خویش لیڈر بنے پھرتے تھے جنہوں نے کبھی صدق دل سے پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا ـــ! اور یہی لوگ آج ہمارے خلاد ملوی ہونے کے بھی دعوے دار ہیں۔

اپنے اسلاف کی عظمتوں کے ان کھنڈرات میں بیٹھ کر میں نے نجانے کیسے کیسے سپنے دیکھے۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ جس روز میری قوم نے ہندو اور ہندو ذہنیت کے حامل پاکستانیوں کی اصلیت جان لی' وہ بھارت ماتا کی موت کا دن ہو گا ـــ ایک مرتبہ میرے کشمیر کے جیالے اگر عزم کر کے انھیں تو ممکن ہی نہیں کہ وہ مہاسبھائیوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکے بغیر پلٹ آئیں۔

کاش میری بھولی قوم ہندو ذہن کی چالبازیوں سے آگاہ ہو سکے! اے کاش.....!"

اپنے مہمانوں کی مہمان نوازی کے لئے میں نے چائے سے بھرا تھرموس اپنے پاس رکھا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ان کی تواضع چائے سے کی۔ پھر کیپٹن کے اشارے پر اس کے چاروں ساتھی اس جگہ کے چاروں طرف بکھر کر پہرہ دینے لگے جب کہ کیپٹن صاحب ایک نقشہ بچھا کر میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے اپنے "ٹارگٹ"

کی نشاندہی کی ـــ یہ ایک فوجی نوعیت کا پل تھا جسے وہ تباہ کرنے آئے تھے۔

ooo

کشمیر میں نظام رسد اور مواصلات کا انحصار ان چھوٹے چھوٹے پلوں پر ہے جو تیز رو پہاڑی ندی نالوں پر بنائے جاتے ہیں۔ ایسے پلوں کی حیثیت بھارتی آرمی کے نزدیک شہ رگ کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ایک دو پل بھی تباہ ہو جائیں تو فوج کا بہت بڑا حصہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ پلوں کی اسی اہم نوعیت کے پیش نظر یہاں ہر وقت فوج تعینات رہتی تھی اور ایسے اہم نوعیت کے پلوں کے دونوں اطراف میں مضبوط مورچہ بندیاں کی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پاکستانی کمانڈوز کے ممکنہ حملے کے پیش نظر یہاں بڑے بڑے پختہ بنکر تعمیر کئے گئے تھے جس کا سلسلہ اندر ہی اندر کافی دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان بکھری ہوئی پوزیشنوں پر مورچہ زن افواج کے لئے جگہ جگہ پٹرول ڈمپ اور گولہ بارود کے ذخیرے بھی رکھے جاتے تھے اور ان ذخائر سے پوزیشنوں تک اسلحہ لانے لے جانے کے لئے یہاں فوجی گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا اور ان کی نقل و حرکت جاری رہتی تھی۔ پاکستانی کمانڈوز اور کشمیری حریت پسند چھپ کر اچانک حملہ کرتے اور زیادہ تر اسلحے کے ڈپوؤں' پٹرول کے مراکز اور فوجی کنوائے کو اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔

ایسے کسی پل کی تباہی سے بھارتی افواج کی سپلائی لائن میں اچھا خاصا شگاف پڑ جاتا تھا جس کو پُر کرنا ان کے لئے فوری طور پر ناممکن ہو جاتا کیونکہ اکثر و بیشتر ایک کے فوراً" بعد انہیں دوسرے ناکامانی حملے کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ سرفروش بھی ایک ایسے ہی اہم نوعیت کے پل کو تباہ کرنے آئے تھے۔ سب سے اہم کام تھا اپنے ٹارگٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کا بھرپور جائزہ لینا تاکہ اُس کی تباہی کے لئے موثر منصوبہ بندی کی جا سکے۔ میں تو اس پل سے دو تین مرتبہ گزر چکا تھا' لیکن کیپٹن صاحب کو اس کا نظارہ کروانا پھر بھی ضروری تھا جس کا بندوبست میں نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔

اردگرد کے مقامی دیہاتوں سے جو لوگ پٹھانکوٹ یا جموں جاتے تھے۔ انہیں اس پل سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ سوا اس کے چارہ نہیں تھا۔ علی الصبح کیپٹن صاحب نے اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دے کر وہیں چھپ کر انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود میرے ساتھ دیہاتیوں کے لباس میں چل دیئے۔ میں نے ان کی سرخ و سپید رنگت کے پیش نظر انہیں مقامی پنڈتوں کے سے انداز میں کپڑے پہنائے تھے۔ بطور احتیاط پھر بھی ہم نے اپنے لباسوں میں پستول چھپا رکھے تھے۔

کپڑے کا ایک تھیلا میرے ہاتھ میں تھا جس میں کچھ کاغذات تھے اور دوسرا ان کے ہاتھ میں جس میں کھانے کی اشیاء رکھی تھیں۔ کیونکہ براہمن زیادہ تر اپنے گھر کے پکے کھانے پر ہی

انحصار کرتے ہیں۔

——اپنی پلاننگ کے مطابق تمام باتیں میں نے جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر ان کو ذہن نشین کروا دیں۔ ہم دونوں اللہ کا نام لے کر چل دیئے۔

میں نے جان بوجھ کر وہ راستہ اپنایا تھا جو اردگرد کے دیہاتوں سے ہٹ کر جاتا تھا۔ یہ پل سے تقریباً" آٹھ نو میل دور تھا۔ سارا راستہ ہم نے پیدل ہی طے کیا اور سورج طلوع ہونے تک پل کے قریب پہنچ گئے جس کے دونوں کناروں پر مسلح سنتری آنے جانے والوں کو ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی وہاں سے گزرنے کی اجازت دیا کرتے تھے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے اس پل تک پہنچے تھے اور سپرداروں کی طرف دیکھے بغیر ہی منہ اٹھائے چلے جا رہے تھے۔

"ہالٹ۔ کون ہو تم کدھر جا رہے ہو؟" اچانک ایک فوجی للکارتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔

جواب میں میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر اسے اپنی شناخت بتلائی اور نزدیک کے ایک گاؤں کا نام بھی لے لیا۔

"تو کون ہے؟" اس نے کیپٹن صاحب سے بڑے درشت لہجے میں پوچھا۔

کیپٹن صاحب ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"گونگا ہے مہاراج جی!" اس کی مصیبت تو بھگتنے جا رہے ہیں کیا کچھ آ گیا ہے۔ رشتہ داروں نے بے چارے کی ساری زمین ہتھیالی۔ ہم عدالت ہی بھگتنے جا رہے ہیں مہاراج۔" میں نے اس کی بات کا بدستور اسی لہجے میں جواب دیا۔

"یہ کیا ہے تھیلے میں؟" اس نے میرے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

"کاغذ ہیں عدالت کے مائی باپ۔" میں نے تھیلے میں رکھے عدالتی کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے جو پہلے ہی میں نے آج کے لئے تیار کروائے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" اس نے قریباً" جھڑکتے ہوئے جواب دیا اور ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔

کیپٹن صاحب کی تجسسانہ نظریں بڑی مہارت سے اپنے ٹارگٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ دشمن بھی ان پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور ان کی کوئی بھی مشتبہ حرکت ہم دونوں کی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ ہم دونوں نے پیدل چل کر پل عبور کیا اور پل کے دوسری طرف کھڑی بس میں سوار ہو کر شہر روانہ ہو گئے۔

ooo

دوپہر کے بعد ہم واپس آئے۔ دوبارہ پل پر سے گزر کر حالات کا جائزہ لیا۔ اب میرے خیال

سے کیپٹن صاحب نے اپنے ذہن میں کوئی پلان ترتیب دے لیا تھا۔ واپسی پر پہرے دار بدلے ہوئے تھے اور ہمیں ایک مرتبہ پھر چیکنگ کے انہی مراحل سے گزرنا پڑا۔ اپنے ساتھیوں کے پاس ہم شام کے وقت پہنچے تھے۔ کیپٹن صاحب نے نقشہ زمین پر پھیلا کر اس پر کچھ لکیریں کھینچیں اور اپنے جانبازوں کو پلان سے آگاہ کیا۔ اپنے مشورے میں انہوں نے مجھے بھی شامل کر لیا اور جیسے ہی آخری راتوں کا چاند ڈوبا' سرفروش کھڑے ہو گئے۔

کیپٹن صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ اگر میں چاہوں تو انہیں مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچا کر واپس جا سکتا ہوں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی ممکنہ مصیبت کی صورت میں میں بھی ان کے ساتھ دشمن کا نشانہ بن جاؤں۔ ایسی مہمات پر زندہ بچنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے ایسی مہموں پر جانے کے لئے انہی اللہ کے شیروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اپنی زندگی کا مقصد صرف ایک باوقار موت سمجھتے ہیں۔

اللہ کے یہی شیر اب پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ سب نے اپنے ہاتھ اٹھا کر مشن کی کامیابی کی دعا مانگی۔ کیپٹن صاحب نے انہیں آخری ہدایات دیں اور ہم سب اک حوصلے' اک عزم کے ساتھ براہمنی تکبر سے ٹکرانے چل دیئے۔

پل تک پہنچنے کے لئے میں نے بہت لمبا راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کی تمنا ہی دل میں لے کر اللہ کے حضور پہنچ جائیں۔ سب سے آگے میں تھا' میرے پیچھے کیپٹن صاحب اور ان کے جانباز قدم بہ قدم اپنی تربیت کے مطابق چل رہے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں معمولی سی آہٹ بھی سنائی دیتی' ہم فوراً" دبک جاتے۔ میں نے معمولی خطرہ بھی مول نہیں لیا تھا اور جہاں کہیں خطرے کا ذرا سا بھی شائبہ گزرتا' میں انہیں بٹھا کر خود آگے بڑھ جاتا۔

——یہ غازی میرے پاس اللہ کی امانت تھے اور امانت کا بار اٹھانے کے لئے قدرت نے مجھے منتخب کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کل جب خدا کے حضور پیش ہوں تو وہاں اس امانت کی مکمل حفاظت کے سلسلے میں ذرا سی کوتاہی کے لئے مجھے جوابدہ ہونا پڑے۔ ان کوہ شکن جیالوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ دشمن کے غرور کو خاک میں ملا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انہیں ہر قسم کے ناسازگار حالات اور اچانک پیش آنے والی صورتحال سے نمٹنے کی خصوصی اہلیت حاصل تھی لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ ان کی پرتقدس جبینوں پر ایک شکن بھی نہ آئے اور وہ اپنا کام کر گزریں۔

جس وقت ہم پل کے نزدیک پہنچے' رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔ کیپٹن صاحب نے یہاں

پہنچ کر تین ٹولیاں ترتیب دیں۔ ایک ٹولی میں وہ خود اور میں شامل تھا۔ دوسری دو ٹولیوں میں دو دو جوان شامل تھے۔ دونوں ٹولیوں کو ان کی مخصوص پوزیشن کا علم تھا۔ دو جوانوں نے تو پل کے ایک کنارے پر پوزیشن سنبھال لی۔ باقی دو کے ذمے ڈائنامیٹ لگانا تھا اور یہی کام سب سے خطرناک تھا۔ دونوں ٹولیوں کو اپنے اپنے ٹارگٹ پر بھیج کر کیپٹن صاحب میرے ساتھ اپنے لئے پہلے سے مخصوص جگہ پر دبک کر بیٹھ گئے۔ ہم نے پل کے ایک کنارے پر بنے ایک بنکر کے پہلو میں بنی چھوٹی سی پہاڑی پر مورچے جمائے تھے۔ جہاں سے وہ بنکر بمشکل پندرہ گز کے فاصلے پر تھا۔ اس بنکر کے اوپر ایک سرچ لائٹ نصب تھی جسے وقتاً فوقتاً گھما کر وہ لوگ پل کی صورت حال کا جائزہ لیتے تھے۔ جب کہ پل کے دونوں اطراف پر بنی پہرے داروں کی پوسٹوں میں مسلح پہرے دار موجود تھے۔ اس کے علاوہ یہاں سے کچھ فاصلے پر فوج ڈیپلائے تھی اور اینٹی ایئر کرافٹ گنز بھی نصب تھیں۔

اتنے زبردست حفاظتی انتظامات کی موجودگی میں پل کو تباہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن میرے ہمراہیوں کی لغت میں ناممکن کا لفظ تو تھا ہی نہیں۔ ہم پل سے قریباً چالیس گز دور ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ میرے کندھے پر لٹکتے تھیلے میں دستی بم موجود تھے اور مجھے کیپٹن صاحب نے ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی وہ سگنل دیں' میں بنکر کے اندر بم پھینکنے شروع کر دوں۔ میں کوئی تربیت یافتہ فوجی نہیں تھا' لیکن اپنے سرفروشوں کی معیت میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں بھی ان کی طرح ایک تربیت یافتہ اور پیشہ ور کمانڈو ہوں۔

ہم دونوں بنکر کو اپنی زد میں لئے ایک پتھر کی اوٹ میں اس پر نظریں جمائے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر لیٹے تھے۔ کیپٹن صاحب نے سٹین گن کا رخ بنکر کی طرف کر رکھا تھا۔ جب کہ میرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہوا ہینڈ گرنیڈ کسی بھی لمحے پھینکنے کے لئے تیار تھا۔ مجھے کیپٹن صاحب کی حالت کا تو علم نہیں' میرے دل کی دھڑکنیں البتہ بے قابو ہوئی جاتی تھیں' لیکن میں خوفزدہ ہرگز نہیں تھا البتہ کچھ نہ کچھ فوراً کر گزرنے کے لئے بے تاب ضرور تھا۔

ooo

پل کے نیچے تیز رفتار ندی کی شوریدہ سر لہروں کی پتھروں سے ٹکرانے کی آواز تھی یا پھر کبھی کبھی پل پر گشت کرتے کسی فوجی کے بوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ' اس کے علاوہ تو فضا پر چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ میں اپنے تصور کی آنکھ سے اپنے دونوں جانبازوں کو پل کے نیچے ڈائنامیٹ لگاتے دیکھ رہا تھا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اس میں قدم جمانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ لیکن عزم و ہمت کی ان چٹانوں کے آگے یہ تیز رفتار لہریں سوائے سر پٹخنے کے اور کر ہی کیا سکتی

تھیں؟ کیپٹن صاحب نے دو تین مرتبہ بے چینی سے اپنے بازو پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا' پھر میں نے ان کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھرتے دیکھے' شاید اب تک ہمارے ساتھیوں کو اپنا کام مکمل کر لینا چاہیئے تھا' لیکن اب تک ہمارے چاروں اطراف وہی ہولناک سناٹا تھا یا پھر ندی کی شوریدہ سر لہریں اور پل پر گشت کرتے پہرے داروں کے پاؤں کی دھمک!

اچانک مجھے اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ سرچ لائٹ روشن ہو چکی تھی اور اس کی تیز شعاعوں نے پل کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گردن موڑی' اب سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ پل کے ایک کونے سے میں نے اپنے ایک ساتھی کو چھلانگ لگا کر جھاڑیوں میں گرتے دیکھا۔ شاید وہ سرچ لائٹ کی رینج میں آنے سے بچ رہا تھا' لیکن اب وہ بھارتی بھیڑیوں کو دکھائی دے چکا تھا۔ پھر تین باتیں یکلخت وقوع پذیر ہوئیں۔ بنکر کے ایک کنارے پر لگی لائٹ مشین گن نے اپنا جبڑا کھولا اور سرخ انگاروں کی ایک لکیر اس مجاہد کے تعاقب میں لپکی۔ کیپٹن صاحب کی سٹین گن نے شعلے اگلے اور سرچ لائٹ بجھ گئی۔ انہوں نے سرچ لائٹ کو ہی نشانہ بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہینڈ گرنیڈ اچھلا اور بنکر میں جا گرا۔ پھر تو جیسے مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں نے شاید ایک ڈیڑھ منٹ ہی میں چار پانچ گرنیڈ یکے بعد دیگرے اس طرف اچھال دیئے۔ اسی اثناء میں پل کے دوسرے کنارے پر مورچہ زن ہمارے ساتھیوں نے راکٹ لانچر سے حفاظتی چوکی پر آگ برسانی شروع کر دی تھی۔

اگلے ہی لمحے کیپٹن صاحب کی مضبوط گرفت نے مجھے گرنے سے بچا لیا کیونکہ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکے کی زوردار آواز گونجی تھی اور پل کے پرخچے اڑ گئے۔ میرے حواس بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ مجھے صرف ایک بات کا احساس رہ گیا تھا کہ کیپٹن صاحب نے میرا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور مختلف ٹیلوں کی اوٹ لیتے ہوئے ہم اپنے مخصوص پوائنٹ کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔

جب حواس بحال ہوئے تو ہم دونوں پل کے نزدیک ہی ایک محفوظ جگہ کھڑے تھے۔ کیپٹن صاحب کی نظریں اپنی گھڑی کی سوئیوں پر جمی تھیں۔ اور پل کی جگہ خس و خاشاک کا ایک ڈھیر ندی میں بہہ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر بنے بھارتی فوج کے مورچوں سے دیوانہ وار فائرنگ کی جا رہی تھی لیکن کس پر۔۔۔۔؟ اس کا علم شاید ہماری طرح انہیں بھی نہیں تھا۔

ابھی ہمیں کھڑے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ دو سائے اپنی سمت رینگتے دکھائی دیئے۔ قریب آنے پر یہ اپنے وہ ساتھی نکلے جو راکٹ لانچر کے ساتھ پل کے دوسرے کنارے پر موجود تھے۔ یہی جگہ "ملاپ" کے لئے طے ہوئی تھی اور ہم نے یہاں ایک طے شدہ وقت تک ایک دوسرے

کا انتظار کرنا تھا۔

مقررہ وقت اب ہوا ہی چاہتا تھا اور میرا دل بیٹھنے لگا تھا ـــــ ابھی تک میرے دو جانباز نہیں پلٹے تھے۔ کیپٹن کے گرد ان کے دونوں ساتھی مستعد کھڑے تھے۔ پھر میں نے کیپٹن کے چہرے پر جلال کی ایک لہر جھلک دیکھی اور انہوں نے گھڑی کی بجائے اپنی نظریں ہم پر گاڑ دیں۔ شاید انتظار کا مقررہ وقت ختم ہو چلا تھا اور اس سے قبل کہ وہ ہمیں روانگی کا حکم دیں۔ ہم نے ایک سائے کو قریباً زمین پر گھسٹتے ہوئے اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ ہم فوراً پوزیشن میں آ گئے' لیکن قریب آنے پر یہ ہمارا وہ ساتھی نکلا جن کے ٹخنے پُل کو اڑانے کا مشن تھا۔

ہمارے قریب پہنچ کر وہ بمشکل اٹھ کر کھڑا ہوا' اُس کی وردی خون میں بھیگ رہی تھی۔ اس نے کیپٹن کو سلیوٹ کیا اور کہا۔

"سر! حوالدار صاحب شہید ہو گئے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے حوالدار کی وردی کے نشانات اور ان کی سٹین گن گلے سے اتار کر کیپٹن صاحب کی طرف بڑھا دی۔ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا اور آنکھیں چھلک پڑیں۔

کیپٹن اور ان کے ساتھیوں نے بڑے تحمل سے اس خبر کو سنا' ان کے منہ سے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون" نکلا۔ سب نے باری باری شہید کی گن کو بوسہ دیا ـــــ ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی' لیکن وہ روئے نہیں' شاید اس لئے کہ سپاہی رویا نہیں کرتے۔ ان کے آہنی سینوں میں ہوک ضرور اٹھی لیکن سب نے اندر ہی اس کا گلہ گھونٹ دیا۔ جب کہ میں فوجی نہیں تھا۔ اسی لئے میرے تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ کیپٹن نے بڑے احترام سے شہید کے نشانات اپنی جیب میں ڈالے اور جھک کر اپنے زخمی ساتھی کی طرف متوجہ ہو گئے جس میں اب اٹھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اس کے سینے پر گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ تینوں غازیوں نے اپنی فیلڈ پٹیاں اس کے سینے پر باندھ دیں۔ یہ ایثار کا عظیم مظاہرہ تھا ورنہ میدان کارزار میں ایک فوجی کے لئے اس کی ایمرجنسی پٹی کی کیا اہمیت ہے ـــــ؟ اس سے باخبر لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔

اس اثناء میں ہمارے ساتھیوں نے ہنگامی سٹریچر ترتیب دے لیا تھا۔ انہوں نے اپنے زخمی ساتھی کو اس پر لٹایا اور ہم اپنی سرحدوں کو چل دیئے۔ مجھے اس علاقے کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی اور ایک ماہر گائیڈ کی طرح میں ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں تینوں مجاہد باری باری سٹریچر پر ڈیوٹی دیتے رہے۔ ہمارے ساتھی پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ جب اُس کی حالت بگڑنے لگتی' کوئی جوان اپنی پانی کی بوتل سے دو گھونٹ اسے پلا دیتا۔ اس

کے علاوہ ہم اور کر ہی کیا سکتے تھے۔

ooo

واپسی کا سفر کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔

ـــــ کمانڈوز اپنا مشن پورا کر کے واپس جا رہے تھے اور یہاں چپے چپے پر پھیلی ہوئی بھارتی افواج کو اس بات کا سگنل مل چکا تھا کہ اس علاقے میں پاکستانی کمانڈوز موجود ہیں اور اب وہ شکاری کتوں کی طرح ان کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔ میرا اختیار کردہ راستہ لمبا اور پیچیدہ ضرور تھا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس اثناء میں دو تین مرتبہ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے زخمی ساتھی کی عیادت کر چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے اسے بڑبڑاہٹ میں کچھ قرآنی آیات تلاوت کرتے دیکھا اور دوسری مرتبہ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک مختلف نوعیت کے خطرناک مراحل سے گزر کر ہم اب "وائٹ لائن" کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ سرحدی لکیر پر پہنچ کر میں رک گیا۔ ساتھی بھی نزدیک آ گئے۔ میں نے بیقراری سے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اپنے زخمی مجاہد کو دیکھنا چاہا۔

"پاکستان آ گیا ـــــ" اس نے مجھے دیکھتے ہی ذرا سی گردن اٹھا کر پوچھا۔

میں نے صرف اپنا سر ہلا کر "ہاں" کہا۔ جواب میں اس کی گردن ڈھلک گئی۔

میں اور کیپٹن صاحب ایک ساتھ ہی بے چینی سے اس پر جھکے تھے۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا۔ کیپٹن صاحب نے اسے آہستہ سے پکارا لیکن شہید تو جیسے اپنی سرزمین ہی کا منتظر تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی دھرتی پر پہنچا' اس نے اپنی جان جان آفرین کو سونپ دی تھی۔ میں نے شدت غم سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ منہ میں لے لیا تاکہ اپنی سسکیوں کو ضبط کر سکوں۔ کیپٹن صاحب نے جھک کر اپنے جیالے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا' شاید وہ اپنی جذباتی کیفیت کا اظہار مجھ پر نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر فوجی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے ـــــ اس اثناء میں دونوں جوان سٹریچر تھامے پتھر کے بت بنے گم سم کھڑے تھے۔

وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کیپٹن صاحب نے مجھے سینے سے لگا کر میری پیٹھ پر تھپکی دی۔

"شکریہ دوست' خدا حافظ!" کہہ کر وہ اپنی سرحدوں کو چل دیئے۔

وہ بچے کھچے ساتھی مادر وطن کی آغوش میں آسودگی حاصل کرنے کے لئے آہستہ آہستہ

چلے جا رہے تھے۔

---ٹیڑھے میڑھے راستے ان کے لئے ہموار ہوتے چلے جا رہے تھے اور درختوں کی اوٹ میں کھڑا میں سسک رہا تھا۔

"اے کاش! میں بھی اس وقت اپنے وطن کی مقدس مٹی کی سوندھی باس کو محسوس کر سکتا۔ میں بھی اپنے پیاروں کے سنگ اپنے وطن میں اپنی جوانی کے یہ خوبصورت لمحات بسر کر سکتا لیکن یہ سوچ صرف چند لمحوں کی تھی جیسے کوئی بلبلا تھوڑی دیر کے لئے پانی پر نمودار ہو اور بس--- تب میرے وجدان نے مجھے آگاہی دی کہ اس تقدس مآب دھرتی کی آبرو تجھ جیسے جوانوں کے دم سے ہے۔ بچے اگر تو بھی یہاں آ گیا تو کون دشمن کے ناپاک ارادوں سے بروقت آگاہی دے گا' کون اپنے سرفروشوں کو اس قابل بنائے گا کہ وہ ڈسنے سے پہلے ہی سانپ کی گردن کچل دیں۔

میں نے آخری بار انہیں موڑ کاٹتے دیکھا--- سینے پر ہاتھ رکھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ بھارت کی طرف مڑ گیا۔

سرحد میں قریباً" ایک فرلانگ آنے کے بعد میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔ ابھی تک میں جذباتیت کے اسی بھنور میں ڈوب ابھر رہا تھا جس سے اپنے ملک کی سرحدوں میں قدم رکھنے کے بعد مجھے گزرنا پڑا تھا۔ واپسی کے لئے بھی میں نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جہاں سے اپنے جانبازوں کو لے کر گزرا تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

ابھی میں نے بمشکل دو ڈھائی فرلانگ کا مزید سفر ہی طے کیا تھا' جب ایک کھیت کے نزدیک سے گزرتے ہوئے "ہالٹ" کی زوردار آواز گونجی۔ اس پکار نے میری نس نس میں بجلیاں دوڑا دیں اور دوسرے ہی لمحے میں اپنی اصلیت کی طرف لوٹ گیا۔ میرے پاؤں کسی برقی عمل کے تابع ہو کر زمین سے اچھلے اور میں ہوا میں تیرتا ہوا کھیت میں جا گرا اور چیتے کی سی پھرتی سے اٹھ کر کھیت کے اندر ہی اندر رینگنے لگا۔

لیکن اچانک میں سناٹے میں آ گیا۔ کھیت میں مختلف اطراف سے ٹارچ کی روشنیاں گھسنے لگی تھیں۔ میں "ناکے" میں پھنس چکا تھا۔ باہر زمین پر گھٹنے ٹکائے میری طرف رائفلیں چھتیائے بھارتی سیکورٹی فورسز کے جوان میرے منتظر تھے۔

ٹوٹی کہاں کمند

میں زمین سے چپکا بے قابو سانسوں اور دھڑکنوں کو شمار کر رہا تھا۔ گرفتاری اور موت سے ڈرنے والے میرا پیشہ نہیں اپنایا کرتے--- لیکن موجودہ صورتحال کے پیش نظر میرے دل سے بے اختیار یہ دعا نکل رہی تھی: "الٰہی! ابھی میرے دل کے ارمان کہاں نکلے ہیں۔ تھوڑا وقت تو اور مل جائے--- کم از کم میرے دل میں کوئی حسرت تو باقی نہ رہے۔"

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس لمحے میں سانس بھی سنبھل کر لے رہا تھا۔ مبادا سینے کا زیر و بم کسی آہٹ کا سبب بن جائے۔ اس بات کا تو مجھے یقین تھا کہ انہوں نے مجھے کھیت میں گھستے دیکھ لیا ہو گا لیکن حیرانگی تو اس بات پر تھی کہ ابھی تک انہوں نے مجھے باہر آنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

میرے نزدیک اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ اصل میں یہ کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا جو آگے جا کر اس علاقے میں قدرتی اگنے والی لمبی لمبی گھاس--- میں مل جاتا تھا۔ یہ کھیت بھی ایک بڑے قطعۂ اراضی کو صاف کر کے کاشت کئے گئے تھے۔ ابھی تک ان لوگوں کو شاید یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ میں کس کھیت میں موجود ہوں یا پھر وہ میرے خود بخود باہر آنے کے منتظر تھے۔ اس بات کا احساس ہم دونوں کو تھا کہ ایک دفعہ بیلے کے وسیع سلسلے میں گھس جانے کے بعد وہ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے--- کیونکہ لمبی لمبی اور گھنی گھاس میں سے کسی کا دن کو نظر آنا بھی ممکن نہیں جب کہ یہ رات کا وقت تھا۔ اگر وہ لوگ روشنی راؤنڈ فائر کرتے تو بھی مجھے کبھی نہ دیکھ پاتے اور بیلے میں غائب ہونے والے کی تلاش کے لئے فوج کی بٹالین بھی تھوڑی تھی۔

میں سانس روکے زمین سے چمٹا کسی آہٹ کا منتظر تھا تاکہ سمت کا اندازہ کرنے کے بعد اگلا قدم اٹھاؤں لیکن باہر بھی اندر کی طرح سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی کسی ٹارچ کی روشنی گھنیری فصلوں میں چمکتی لیکن بے سود کہ میں ان کی پہنچ سے باہر تھا۔ انتظار کی شدت سے اب میرے اعصاب تڑخنے لگے تھے۔ بار بار یہی جی میں آتا کہ اٹھوں اور بھاگنا شروع کر دوں لیکن کوئی طاقت مجھے ہر مرتبہ ایسا کرنے سے روک دیتی۔ یہاں لیٹے رہنا بھی خطرناک تھا کیونکہ سپیدہ سحر

نمودار ہونے کے بعد میرے نظر آنے کے امکانات بھی بڑھ سکتے تھے۔

دوسری سمت سے ہونے والے کسی عمل کا انتظار کروں یا اٹھ کر بھاگ جاؤں؟ ابھی میں اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ قدرت کو مجھ پر رحم آگیا۔

سرحدی اضلاع میں جنگلی جانور مثلاً" سور اور گیدڑ وغیرہ عموماً" بکثرت پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً" رات کے وقت تو وہ ٹولیوں کی شکل میں کھیتوں پر حملہ کرتے اور ہری بھری لہلہاتی فصلوں کو چٹ کر جاتے ہیں۔ میرے قریب ہی شاید کہیں کوئی جنگلی جانور اپنے شغل میں مصروف تھا اور میری طرح ناگہانی آفت دیکھ کر وہیں دبک گیا تھا لیکن چونکہ جانوروں میں قوت برداشت یا قوت فیصلہ انسانوں سے کم ہوتی ہے' اس نے میری طرح انتظار کی زحمت اٹھانا گوارہ نہ کیا اور خود کسی عمل اقدام پر تل گیا۔

میں بھی اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا' جب میرے نزدیک کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی اور پھر تو جیسے طوفان بدتمیزی وہاں گھس آیا—— ایک جنگلی جانور فصلوں کو روندتا باہر کی سمت لپکا' دوسرے ہی لمحے فضا میں "ہاٹ' ہاٹ" اور اس کے بعد "ٹھائیں' ٹھائیں" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں یہ تماشہ دیکھنے کی تاب کہاں لا سکتا تھا۔ اس غیبی امداد پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا کھیتوں کے اندر ہی اندر تیزی سے مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ جب تک انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا' میں جنگلی گھاس کی بھول بھلیوں میں کھو چکا تھا۔

○○○

وہ مخصوص ستارہ جسے دیکھ کر میرے ہم پیشہ لوگ اپنی منزل کا تعین کرتے ہیں' آسمان پر نمودار ہو چکا تھا۔

——اسی کو رہنما جان کر میں نے بھی جنگلی گھاس میں اپنا سفر جاری رکھا۔ میرے جسم پر کئی جگہ نوکیلی گھاس نے اپنے نقش خراشوں کی صورت میں ثبت کر دیئے تھے لیکن اس کی پروا کسے تھی! ایک دفعہ موذیوں کے چنگل سے بچ نکلنے کے بعد طمانیت کا احساس ہوا تھا' اس نے تمام جسمانی تکالیف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں پراعتماد تھا اور بجائے کھلی جگہ دیکھ کر باہر نکلنے کے میں نے بیلے ہی میں اپنا سفر جاری رکھا۔

فائرنگ اور تعاقب کرنے والوں کا شور سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا' اب میں تھا اور رات کا پراسرار سناٹا۔ جس کے تقدس کو کبھی کبھی کسی جنگلی جانور کے بھاگنے یا چلانے کی آواز مجروح کر دیتی تھی۔ سپیدہ سحر کے نمودار ہونے کے بعد میں نے گھاس کے اس عذاب سے چھٹکارہ پانے کی تدبیر کی۔ کیونکہ اب خراشوں سے خون بھی رسنے لگا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کپڑے

دیکھ کر کسی کو یہ گمان گزرے کہ میں کوئی بھگوڑا چور ہوں جو کسی طرح دیہاتیوں سے جان بچا کر نکل آیا ہے یا پھر کوئی مفرور قاتل جو پناہ کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔

گھاس سے باہر نکل کر اپنے حلیے کا جائزہ لیا تو دوبارہ گھس جانے کو جی چاہا۔ ایسے تار تار لباس میں دن کے وقت سفر کرنا مصیبت کو خواہ مخواہ دعوت دینے کے مترادف تھا اور نئے کپڑوں کا حصول ایک الگ مسئلہ۔ بادل نخواستہ وہیں ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر کسی غیبی امداد کا منتظر ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد ہی میری مراد بر آئی۔ ایک نوجوان کندھے پر بیلوں کے گلے میں ڈالنے والا طوق (پنجالی) رکھے اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں اوٹ میں ہو گیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا' میں اچانک نکل کر اس کے سامنے آگیا اور اس سے پہلے کہ اسے صورت حال کا احساس ہو' ایک زوردار جھانپڑ اس کی کنپٹی پر جڑ دیا۔ آدمی کچھ زیادہ ہی جاندار دکھائی دیتا تھا۔ ایک ہی جھانپڑ سے اسے عقل آگئی۔ وہ حیرانگی اور غصے میں تلملاتا ہوا میری جانب پلٹا لیکن پنجالی اس کے ہاتھوں میں لہرا کر رہ گئی۔ میری دونوں ہتھیلیاں اس کی کنپٹیوں سے ٹکرائیں اور وہ کچھ کرنے کی حسرت دل ہی میں لئے لہراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اسے پنجالی سمیت کھینچ کر کھیتوں میں گھسیٹ لیا اور چند سیکنڈ کے بعد صرف ایک زیر جامہ اس کے بدن پر باقی رہ گیا تھا۔

یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لئے افسوس تو ضرور ہوا لیکن یہ وقتی افسوس اس پچھتاوے سے بہتر تھا جس کا سامنا بے ضرر کیڑے کی طرح پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد مجھے کرنا پڑتا۔ اشک شوئی کے لئے میں نے اپنے کپڑے اس کے قریب رکھ دیئے جن کے ساتھ سو روپے کا ایک نوٹ بھی بطور اظہار تشکر موجود تھا۔

پھر تو میں محلور تاً" ہی نہیں حقیقتاً" سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔ راستے میں کئی لوگ مجھ سے ٹکرائے' جھڑک بھی دکھائی دی لیکن میں نے یہاں کسی بس میں سفر کرنے کا خطرہ مول لینے کی بجائے پیدل چلنے کو اہمیت دی۔ دوپہر تک میں ایک سمت میں چلتا رہا۔ بالآخر تھک کر چور ہو گیا۔ اب مجھ میں واقعی زیادہ دیر تک چلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بھوک اور پیاس سے بے حال ہوا جاتا تھا۔

خدا خدا کر کے قریبی سڑک تک پہنچا۔ سڑک کے کنارے ایک معمولی سے ہوٹل سے کھانا زہرمار کیا اور مختلف بسوں میں دھکے کھانے کے بعد رات کو کافی دیر گئے لدھیانہ پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ خیریت گزری کہ ابھی ریڈی میڈ کپڑوں کی کچھ دکانیں کھلی تھیں ورنہ شاید اس حلیے میں کارخانے پہنچ کر خواہ مخواہ سب کو شک میں ڈالنے والی بات ہوتی۔

پرکاش رائے کوٹ گیا ہوا تھا۔ کارخانہ تو بند تھا لیکن کچھ لڑکے ابھی تک کام میں مصروف تھے۔ میں نے ان سے معمول کے مطابق نمسکار کہی سنی اور چپ چاپ اوپر جا کر لیٹ رہا۔ خراشوں کی وجہ سے ہلکے ہلکے بخار کی کیفیت طاری تھی۔ کچھ سکون ہوا تو دل بے اختیار الپسرا کی طرف پلٹا اور وہ میرے ذہن کے کھلے کواڑوں سے سرسراتی میرے من مندر میں کوہ قاف کی پریوں کی طرح اتر گئی---

"یہ مَیں ہوں پرکاش بابو--- ہاں میں! جو خانیت ہوں۔ جو زندگی کے ساز پر گایا جانے والا ابدی گیت ہوں۔ میں محبت کی وہ مونالیزا ہوں جس کی ایک مسکراہٹ پر ایک عالم نثار ہو جائے۔ تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا پاؤ گے۔ اس لئے کہ میں تمہارے لئے امان ہوں' کہاں پناہ ڈھونڈو گے اور--- پاگل لڑکے میری محبت ایک عالم پر محیط ہے۔ میں نے تمہارے شعور کے گرداگرد دیوار چین تان دی ہے۔ میری یادیں تمہاری شریانوں میں کرونیں لے لے کر بیدار ہوتی رہیں گی۔ میں زندہ پیر کی طرح تمہارے اندر سے کبھی نہیں مرپاؤں گی---!!

میری آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں۔ اپنی بزدلی پر غصہ بھی آیا لیکن ضبط کا یارانہ رہا مجھے تڑپتا دیکھ کر اس کی یادوں نے تھپک تھپک کر لوریاں دے کر مجھے نیند کی دیوی کی آغوش میں لا پھینکا۔

صبح کافی دیر گئے میری آنکھ کھلی۔ خراشوں کی وجہ سے ہلکے ہلکے بخار کی کیفیت طاری تھی لیکن نہانے سے طبیعت بشاش ہو گئی۔ ملازموں کو مختلف ہدایات دے کر میں "دوستوں" کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک ضروری پیغام میرا منتظر تھا۔

"فوراً" ہنگامی میٹنگ کے لئے واپس آؤ۔"

معاملہ سنگین نوعیت کا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے راتوں رات سرحد پار کر کے اپنے ملک میں اہم نوعیت کی ہدایات حاصل کرنا اور اس کے بعد واپس آنا تھا۔ اس پیغام کے ساتھ ہی ایک "مقامی دوست" کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ جس کی مدد سے میں نے سرحد پار کرنی تھی۔ اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں رائے کوٹ ہی جا سکوں۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ بمشکل ایک رات ہی تو مجھے اپنے ملک میں بسر کرنا تھا' اس کے بعد واپس بھارت آنا تھا اور میرے اچانک غائب ہونے اور واپس آنے کے وہ لوگ عادی ہو چکے تھے' اس لئے میں نے اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دیا اور کارخانے کے ملازموں سے کہہ دیا کہ پرکاش اگر آئے تو اسے بتا دیں کہ میں کل پرسوں تک واپس آ جاؤں گا۔ ایک "لمبا آرڈر" وصول کرنے دہلی جا رہا ہوں۔

ooo

دوپہر تک میں بٹالہ پہنچ گیا جہاں سے ایک بس مجھے سرحدی علاقے کلانور لے آئی۔ کلانور سرحد کے بالکل قریب واقع ہے' یہاں سے ایک نزدیکی گاؤں تک جانا تھا جہاں ایک مقامی دوست میرا منتظر تھا۔ جس بس کے ذریعے میں یہاں پہنچا تھا' اس میں قریباً" تمام وہی لوگ سوار تھے جن کا تعلق مقامی دیہاتوں سے تھا اور یہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سرحد کے دونوں اطراف فوجیں مورچہ بند تھیں اور آئے روز کسی نہ کسی سرحدی جھڑپ کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ ممکنہ جنگ کے خطرے کے پیش نظر دیہاتی آبادیاں خالی ہو رہی تھیں کیونکہ لوگوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو نہیں بھلایا تھا اور لڑائی لگنے سے پہلے ہی وہ دیہاتوں کو خالی کر کے شہروں میں محفوظ پناہ گاہوں کا رخ کر رہے تھے۔

دیہاتوں میں صرف وہی لوگ رہ گئے تھے جن کا یہاں قیام کرنا ناگزیر تھا کیونکہ کھیتی باڑی پر ہی ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ بچوں' بوڑھوں اور خواتین کو انہوں نے شہروں میں بھیج دیا اور صرف چیدہ چیدہ نوجوان ہی جن میں سے زیادہ کا تعلق "ہوم گارڈز" سے تھا' یہاں رہ گئے۔

"ہوم گارڈز" ایک نیم فوجی قسم کی تنظیم تھی جسے بھارتی حکومت نے پنجاب کے سرحدی اضلاع کی حفاظت کے لئے منظم کیا تھا۔ یہ فوج کے تربیت یافتہ رضاکار تھے۔ جن کو ضروری اسلحہ فراہم کر کے اپنے اپنے گاؤں کی نگرانی پر مامور کر دیا گیا تھا۔ اپنی دانست میں بھارتی حکومت نے کسی پہلو سے غیر ملکی مداخلت کی گنجائش یہاں نہیں چھوڑی تھی۔

سرحدی علاقوں میں سب سے پہلے بی۔ ایس۔ ایف (بارڈر سیکورٹی فورسز) متعین تھے۔ اس کے بعد "ہوم گارڈز" اور سب سے بڑھ کر پولیس جس کی نفری سرحدی تھانہ جات میں دوگنا کر دی گئی تھی۔ پیچھے پیچھے پر فوج مورچہ بند تھی اور ہزاروں کی تعداد میں سویلین اور آرمی کے انٹیلی جنسوں کے سدھائے ہوئے ملازمین اس کے علاوہ تھے۔ ان تمام انتظامات کے علاوہ ایک بہت بڑا خطرہ یہاں کے مقامی مخبر تھے۔ ہر گاؤں سرپنچ کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے مخصوص کردہ آفیسر کو روزانہ گاؤں کے اردگرد ہونے والے واقعات اور وہاں آمدورفت رکھنے والے اجنبیوں سے آگہی بہم پہنچائے۔

دیہاتیوں کے بھیس میں قریباً" تمام سرحدی دیہاتوں میں سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی قیام پذیر تھے۔ جو ان دیہاتوں میں آنے والے ہر اجنبی پر کڑی نظر اور پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ کسی بھی ایسے شخص پر جو ماضی میں بھی کبھی سمگلنگ میں ملوث رہا تھا' خفیہ پولیس عذاب کی طرح مسلط تھی۔ آئے روز انہیں وطن دشمن سرگرمیوں کے الزام میں پکڑ کر "عقوبت خانوں" میں لے جاتے اور ان پر ایسے ایسے مظالم توڑے جاتے کہ خدا کی پناہ! بڑے بڑے سمگلروں کو حکومت نے

مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے سرحد پار کے ساتھیوں کو دھوکے سے بلوائیں اور گرفتار کروا دیں۔

ان حالات میں جب دوستیاں بھی مشکوک ہو گئی تھیں۔ میں نے اس طرف کا رخ کیا تھا۔ بس سے اترنے والے قریباً" تمام مسافر مڑ مڑ کر میری طرف استفسارانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں ان ہی کے رنگ میں رنگا تھا اور کافی غور کے بعد بھی کوئی یہ اندازہ نہ لگا پایا کہ میں یہاں اجنبی ہوں لیکن اب معاملہ دوسرا آن پڑا تھا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

---بس سے ابھی چند قدم ہی چل پایا تھا کہ میرے قریب سے گزرتے ایک سکھ (جس نے اپنی شخصیت چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی) نے مجھ سے دریافت کیا۔

"سرانوالی" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کس کے پاس؟"

"سرون سیماں اپنا رشتہ دار ہے۔" میں نے سکھوں والے مخصوص لہجے میں کہا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"پٹالے سے!"

"پٹالے میں کون سی جگہ؟"

"ہاتھی دروازہ!"

"اچھا اچھا میجسٹک سینما کے پاس؟" اس نے داؤ مارا۔

"مہاراج جی پورے پٹالے میں میجسٹک نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ آپ امرتسر کی بات تو نہیں کر رہے۔" میں نے اس کے پہلے ہی حملے کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ جھینپ سا گیا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

"یار برا نہ منانا' دراصل میرے رشتے دار بھی وہاں رہتے تھے۔ مجھے جگہ کا نام یاد نہیں آ رہا۔" اس نے یہ بالکل فضول سا بہانہ کیا تھا کیونکہ کلانور کا کوئی بھی رہائشی ایسا نہیں تھا جسے روزانہ پٹالے یا گورداسپور نہ جانا پڑتا۔ بہرحال میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک بلا تو ٹلی۔

"سرانوالی" میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا نقشہ میرے ذہن میں محفوظ تھا کیونکہ یہاں کسی سے پوچھنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ میں اندازے کے مطابق سرانوالی کی طرف گامزن تھا جو یہاں سے بمشکل ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر صاف دکھائی دے رہا تھا لیکن اس دوران میں بھی دو مزید افراد مجھ سے پوچھ گچھ کر چکے تھے۔

گاؤں کے باہر قریباً" چاروں اطراف میں مسلح افواج مورچہ بند تھیں اور سرسبز لہلہاتے

کھیتوں میں انہوں نے بارودی سرنگیں دبا کر ان کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ جیسے تیسے کر کے میں سرون سنگھ کے گھر تک پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"جی آیاں نوں۔" کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ مجھ سے کوئی چال چلنے والا ہے کیونکہ میرے نزدیک تو وہ قابل اعتماد دوست تھا لیکن میرے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ سرون سنگھ بھی بھارتی انٹیلی جنس کے ہاتھوں بک چکا تھا اور اب "ڈبل ایجنٹ" کا رول ادا کر رہا تھا۔

"مہاراج جی' حالات بڑے خطرناک ہیں۔ احتیاط کرنی چاہیے۔" اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" مجھے اس کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔

"چاروں طرف سیکورٹی پھیلی ہوئی ہے لیکن میرا نام بھی سرون سنگھ ہے۔" اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر سوئی کے ناکے میں سے نہ گزر جاؤں تو سکھ کا بچہ نہیں۔"

"سرون سیماں ہمارے لئے ایسے حالات کوئی نئی بات نہیں' اپنے پیشے میں تو یہی سب کچھ ہوتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ بیٹھیے مہاراج۔" اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میرے لئے چائے پکا کر لے آیا۔ چائے پیتے ہی اس نے کہا۔

"میں ذرا باہر جا کر حالات کا جائزہ لے آؤں اور ہاں..... ....." اس نے کچھ سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ "آج شاید جرنیل سنگھ کے ساتھی پار جا رہے ہیں' کچھ مال آیا ہوا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں ان کے ساتھ آپ کو بھی بھیج دوں کیونکہ میں آج کل پولیس کی نظروں میں ہوں اور وہ لوگ میری نگرانی کرتے رہتے ہیں' کہیں میرے غائب ہونے پر انہیں شک ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔" کہہ کر اس نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

اس کی بات نے مجھے کچھ الجھن کا شکار کر دیا تھا' لیکن اس کی نیت پر مجھے اب بھی شک نہ ہوا۔ میں نے یہی جانا کہ وہ یہ سب کچھ حفاظتی اقدامات کے تحت کر رہا ہے۔ پھر مجھے تو اپنے کام سے مطلب تھا چاہے وہ کیسے ہی انجام پاتا۔

---یہ علاقہ دراصل میرے "منجمد مقام" کے نزدیک ترین تھا۔ دوسری کسی بھی جگہ سے سرحد عبور کرنے میں خواہ مخواہ دو تین دن لگ جاتے اور [illegible] حالات ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہاں تک پہنچنے کے لئے مجھے جن مراحل سے گزرنا پڑا تھا' اس کے بعد اب یہاں سے واپس جانا بھی میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ غرض "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والی بات

بن کر رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے جیسے تم مناسب سمجھو کیونکہ یہ تمہاری ڈیوٹی ہے۔ میری تو نہیں کہ میں سوچتا رہوں۔" میں نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"چنگا! میں ابھی آیا۔" کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

ooo

میں نے اٹھ کر باہر جانے والے دروازے کی کنڈی لگا لی ـــــ اور دروازے سے ملحق میں ایک چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھ رہا۔ اس وقت سوائے ایک ننھے سے آٹومیٹک پستول کے میرے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ اس کی حیثیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن محض اس لئے کہ کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں' میں اکثر ایسے مواقع پر پستول اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

قریباً" آدھ گھنٹے بعد دروازے پر مخصوص دستک سنائی دی۔ میں نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ سرون سنگھ آگے آگے تھا اور اس کے پیچھے چار افراد تھے۔

وہ اپنے منصوبے پر عمل کر گزرا تھا اور مجھے خطرے کا احساس اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا ـــــ آنے والے گو کہ سویلین لباس پہنے ہوئے تھے لیکن ان کی مخصوص وضع قطع نے مجھے ان کی اصلیت کا احساس دلا دیا۔ سرون سنگھ' جرنیل سنگھ وغیرہ کے بھیس میں ملٹری انٹیلی جنس کے آدمیوں کو لے آیا تھا۔ نووارددوں نے معاملے کی سنگینی کا اندازہ پہلے سے کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے اچھل کر سب سے آگے آنے والے سرون سنگھ کے پیٹ میں زوردار لات ماری لیکن میری توقعات کے برعکس وہ بجائے ان لوگوں پر گرنے کے سامنے دیوار سے جا ٹکرایا اور نووارددوں نے پھرتی سے پیچھے ہٹتے ہوئے پستول نکال لئے۔

"ہینڈز اپ!" تین پستول بیک وقت میری آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ میرے ہاتھ مشینی انداز میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے چلے گئے ـــــ وہ لوگ مجھے ایک لمحے کی مہلت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دو آدمیوں نے میرے بازو پیچھے کی طرف موڑے اور تیسرے نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری دونوں کلائیاں مضبوطی کے ساتھ پہلے سے اپنے پاس موجود رسی کے ذریعے کس کر باندھ دیں۔

انہوں نے مجھے مکمل طور پر بے بس کر دیا تھا اور ان کا چوتھا ساتھی اس اثناء میں میری طرف پستول تانے کھڑا رہا ـــــ سرون سنگھ کے پیٹ میں' میں نے اس قدر زوردار لات ماری

تھی کہ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے زمین پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ بے بس ہوتے ہی انہوں نے میری تلاشی لی۔ پستول اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ وحشیوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔

ان میں سے ایک نے جو کمانڈر معلوم ہوتا تھا' میرے کمر میں زوردار لات رسید کر دی۔ میں اچانک حملے سے آگے کی سمت لڑکھڑایا تو سامنے کھڑے حملہ آوروں نے بھی اپنے کمانڈر کا عمل دہرایا اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔ میں بے بسی سے زمین پر گرا انہیں دیکھتا رہا۔ جب مار مار کر وہ قریباً" تھک گئے اور میرے بھی چہرے سے خون بہنے لگا تو ان میں سے ایک لمبے تڑنگے شخص نے میرے سر کے بال مضبوطی سے پکڑ کر مجھے زمین سے اوپر اٹھایا اور دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔ چند لمحوں بعد ہی صورت حال کی سنگینی کا احساس مجھے ہو گیا ـــــ میں گرفتار ہو چکا تھا اور سرشام ہی ایسے علاقے میں قابو آ گیا تھا جہاں سے کوئی چڑیا بھی پر مار کر باہر جانے کی تاب نہ رکھتی تھی۔ میرے ذہن نے فوراً" مستقبل کی منصوبہ بندی کی اور میں نے سرون سنگھ کو ان کے سامنے گالیاں بکنا شروع کر دیں:

"ذلیل آدمی تو نے صرف پانچ کلو الیون کے لالچ میں پکڑایا ہے لیکن تو بچ کر کہاں جائے گا۔" سیکورٹی کے آدمیوں نے پہلے تو اسے کوئی چال سمجھا اور مجھے دھکے دیتے ہوئے باہر لے آئے لیکن ان میں سے ایک دو نے مشکوک نظروں سے سرون سنگھ کی طرف گھورا ضرور تھا۔

باہر نکل کر دیکھا تو ایک جیپ اور مسلح فوجی بھی یہاں موجود تھے۔ گویا ان لوگوں نے میرے فرار کے تمام ممکنہ امکانات پر غور کرنے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔

میری آنکھوں پر انہوں نے سیاہ رنگ کی پٹی باندھ دی اور دونوں کلائیوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں' پھر مجھے قریباً" گھسیٹتے اور گالیاں دیتے ہوئے جیپ تک لے آئے۔ کسی نے گالیاں دیتے ہوئے میری گردن پر اس زور کا مکہ مارا کہ میرا سر جیپ سے ٹکرایا اور سر کے کس ایسے حصے میں چوٹ لگی کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ صرف اتنا یاد رہا کہ میرے بے ہوش ہونے سے پہلے کسی نے زوردار تھپڑ بھی رسید کئے تھے ـــــ ان کے ذہن میں شاید یہ بات تھی کہ میں ایکٹنگ کر رہا ہوں لیکن جب انہیں حقیقت کا احساس ہو گیا تو انہوں نے مجھے جیپ میں پھینک دیا۔

ooo

ہوش آیا تو میں کسی تنگ سی کوٹھڑی میں چاروں شانے چت پڑا تھا۔ جس کے دروازے میں تین یا چار سلاخیں لگی تھیں جن سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ سزا یافتہ فوجیوں کے لئے مخصوص قسم کا سیل ہے' جس میں مجھے بند کیا گیا ہے۔

پختہ سیمنٹ سے بنے فرش پر سوائے میرے زخموں سے رسنے والے خون کے اور کسی شے کا نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں لیکن جیسے ہی ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی' درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور مجھے تڑپا گئی۔ بے اختیار میں نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

----اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اٹھنے والی کرب کی لہروں کو کسی حد تک روکتے ہوئے کروٹ بدل کر کوٹھڑی کی دیوار کا سہارا لے کر دوبارہ اٹھنا چاہا تھا کہ اچانک باہر قدموں کی چاپ ابھری--- اور میں فوراً" اسی پوزیشن میں چلا گیا کیونکہ سوچنے سمجھنے کے مواقع مجھے ابھی تک میسر نہیں آئے تھے اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر میں ہوش میں آنا نہیں چاہتا تھا۔

رات کا غالباً" دوسرا پہر تھا اور نجانے بے ہوشی کی اس کیفیت میں مجھے کتنے گھنٹے گزر گئے تھے--- میں نے چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ ایک آواز کوٹھڑی کے قریب سے سنائی دی۔

"ابھی تک ہوش میں نہیں آیا----؟"

اس کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینک کر صورت حال کا جائزہ لیا ہو' پھر دوسری آواز ابھری:

"بڑی دیر ہو گئی کہیں مر نہ جائے۔"

"کیا خیال ہے؟" پہلی آواز دوبارہ آئی۔

"میرا خیال ہے سر کو رپورٹ کر دیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس کے ساتھ ہی واپس جاتے قدموں کی آوازیں گونجیں--- ان کے دفع ہوتے ہی میں جیسے تیسے اٹھ گیا اور کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا ایک ہاتھ بے اختیار سر کی طرف اٹھا جہاں ایک اور گھٹنے سے سر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ چوٹ لگنے سے سر پھٹ گیا اور زخم کے گرد بال خون سے چپک گئے تھے۔ جسم کے جس حصے پر بھی میرا ہاتھ لگتا' وہیں سے درد کی ایک تیز لہر اٹھتی۔ میرا سارا وجود دکھتے ہوئے پھوڑے میں بدل چکا تھا---!!

ذرا مہلت نصیب ہوئی تو پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے یاد آ گئے----! "تو بالآخر پھنس ہی گئے نا برخوردار؟" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اب دو ہی صورتیں ہیں: یا تو میں بزدلوں کی طرح ہتھیار پھینک کر سب کچھ اگل دوں یا--- جوانمردی سے حالات کا مقابلہ کروں اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر موقعے کا منتظر رہوں' پھر جیسے ہی مناسب موقع ہاتھ لگے بھاگ جاؤں۔

پہلی صورت اس لئے تو ممکن نہیں تھی کہ اب میں قابو میں آ چکا تھا اور بزدلی کے مظاہرے

پر دشمن مجھے معافی دینے سے تو رہا البتہ یہ ضرور تھا کہ جب میں اس چور کی طرح جو پہلی ہی چوری پر پکڑا جائے اور پولیس کی ترغیب اور دھمکیوں میں آ کر تمام واقعات بلاکم و کاست اگل دے۔ پولیس والی روایتی تفتیش کا شکار ہو جاؤں اور مجھے وہی روایتی جملے سننے کو مل جائیں کہ "ہمیں کا تو ہمیں علم تھا صاحبزادے' وہ والی بات بتاؤ جو تم چھپا رہے ہو۔" اور پھر "وہ والی بات" پوچھنے کا سلسلہ لمبا ہی ہوتا چلا جاتا۔ علاوہ ازیں مجھے اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ ایک مرتبہ اس بات کا اقرار کر لینے کے بعد کہ میں یہاں جاسوسی کرنے آیا تھا---! مرنے سے پہلے بھارتی جیلوں سے چھٹکارے کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

میں نے بزدلوں کی طرح زندہ درگور ہونے کی بجائے بہادروں کی طرح حالات کا سامنا کرنے کی ٹھانی اور مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

اسے انسانی فطرت کا تقاضہ جانئے یا میری بزدلی کہ اپنی گرفتاری کا احساس ہوتے ہی ایک ایک کر کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے چہرے میرے سامنے آنے لگے۔ جس جگہ سے مجھے گرفتار کیا گیا وہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر سرحدی لکیر واقع تھی جس کے بعد میرے وطن کی آزاد فضائیں شروع ہو جاتی تھیں۔ لیکن حسب روایت کمند وہیں جا ٹوٹی جہاں لب بام دو چار ہاتھ دور ہی رہ گیا تھا۔ گھر یاد آیا تو یہاں بھی اپنے محسنوں کی فکر دامن گیر ہوئی۔

"کیا سوچیں گے وہ لوگ---؟ کہیں کڑی سے کڑی ملاتے تفتیش کنندگان رائے کوٹ تک جا پہنچے تو کیا بنے گا---؟ میں کیسے ان سب کا سامنا کر پاؤں گا؟ انسانی رشتوں کا یہ المیہ وہ لوگ کیسے برداشت کر پائیں گے---؟"

پر کاش--- پونم--- سدرشنا--- تکون کے تینوں زاویوں نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا لیکن قریب آتے قدموں کی چاپ پھر سے مجھے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی جہاں ایک کیپٹن کے ساتھ تین مسلح فوجی میری کوٹھڑی کے باہر کھڑے نجانے کتنی دیر سے مجھے گھور رہے تھے۔

ooo

ان لوگوں کا تعلق کسی جاٹ رجمنٹ سے تھا۔ ٹارچ کی روشنی براہ راست آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" کیپٹن نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

لیکن میں بدستور اسی پوزیشن میں رہا۔ کیپٹن مجھے گالیاں بکنے لگا۔ مجھے ان لوگوں کے سامنے ایک جی دار سمگلر کا کردار ادا کرنا تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ میں اپنے اندر جی داری پیدا

کروں اور اپنے کسی عمل سے بزدلی کا مظاہرہ نہ کروں۔ کیپٹن کے بعد اس کے ماتحتوں نے بھی وہی عمل دہرایا لیکن میں نے سر جھکا لیا اور ان کی طرف دیکھنے سے انکار کر دیا۔

"تالا کھولو" بھارتی کیپٹن نے اپنے ساتھیوں کو غصے سے کھولتے ہوئے حکم دیا۔

ایک سپاہی نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھول دیا اور وہ سب اندر گھس آئے۔ سب سے پہلے کیپٹن نے میری پسلیوں میں ٹھوکریں مارنا شروع کیں۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی اس کی تقلید شروع کر دی۔ پھر اس نے پیچھے ہٹ کر دو سپاہیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے رائفلوں کے بٹ میرے پیٹ اور سینے میں مارے۔ اس دوران میں' میں نے اپنی چیخوں اور کراہوں کو روکنے کے لئے اپنا نچلا ہونٹ اتنی شدت سے دانتوں میں دبایا کہ میرے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ ساتھ ہی کسی موذی کی رائفل کا بٹ ایسی جگہ لگا جس سے میرا ذہن تاریک ہو گیا اور مجھے کچھ دیر کے لئے ظالموں سے نجات مل گئی۔

دوبارہ مجھے دن چڑھے ہوش آیا۔ اس مرتبہ ہلنے کی ضرورت میں نے محسوس ہی نہیں کی اور چپکا لیٹا رہا۔ میرے بدن کا رواں رواں فریادی ہو رہا تھا لیکن جذبہ ایمانی نے مجھے اتنی تقویت بہم پہنچا دی کہ مجھ میں اذیت برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔

——— میری کوٹھڑی کے سامنے ایک سنتری ٹہل رہا تھا جو مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر شاید کسی کو رپورٹ کرنے چلا گیا کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد ہی میں نے ایک سکھ کرنل کو اس طرف آتے دیکھا جس کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی موجود تھے۔ میری کوٹھڑی کے سامنے آکر وہ رک گیا۔

"ہیلو' ہاؤ آر یو؟ (کیسے ہو)" اس نے انگریزی میں چہکتے ہوئے کہا۔

اس طرح وہ اصل میں میری شخصیت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کا فقرہ سنا ہی نہیں۔ چند سیکنڈ تک میری طرف غور سے دیکھنے کے بعد اس نے یہی بات پنجابی میں دہرائی۔ جواب میں' میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"پرویز؟" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"سیالکوٹ"

"ولہ یار تو تو اپنا گرائیں ہے۔ اسے میرے پاس لے کر آؤ۔" اپنے ماتحتوں کو حکم دے کر وہ چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور تین سپاہی اندر گھس آئے۔ "اٹھو" ان میں

سے ایک حوالدار نے حکم دیا۔

"مجھ سے اٹھا نہیں جاتا" میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دو تین گالیاں دینے کے بعد اس نے میرے گھٹنے پر اس زور سے رائفل کا بٹ مارا کہ بے اختیار میری "ہائے" نکل گئی' یوں لگا جیسے گھٹنا ٹوٹ گیا ہو۔ میں شدت درد سے دوہرا ہو گیا۔

باقی دونوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے' جہاں ایک طرف کمروں کی قطار کے باہر وہی سکھ کرنل کھڑا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور غصے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اس نے مجھے لانے والوں کو بے تحاشا گالیاں دینی شروع کر دیں۔

سپاہی سہم کر ایک طرف ہٹ گئے' میں بدستور گھٹنا پکڑے زمین پر بیٹھا رہا۔

"اٹھو جوان۔" اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور سہارے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں اس کی چال سمجھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس پر ہنس بھی رہا تھا کہ اپنی دانست میں اس نے بڑی چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس کو ہاتھ پکڑا کر کھڑا ہوا اور قریباً لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ ایک کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پہنچ کر کرنل نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود سامنے رکھے میز پر بیٹھ گیا۔

"انہوں نے تو تمہیں بھوجن بھی نہیں کروایا ہو گا۔" اس نے یہاں موجود سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"قیدی آئے ہوئے ہیں' سردار جی جو سلوک جی چاہے کریں۔" میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"یار یہ لالے سالے ہوتے ہی ایسے ہیں۔" اس نے ہندوؤں کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میز کے کنارے لگے پش بٹن پر انگلی رکھ دی۔ فوراً ایک اردلی اندر آیا۔

"اسے بھوکا پیاسا مارنا ہے کیا؟" اس نے سپاہی کو غضب ناک آنکھوں سے دیکھا اور اس کے جواب دینے سے قبل ہی اسے میس سے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔

"دیکھو میاں! میں جٹ ہوں اور مجھے بھی ہندو سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں۔ اب بدقسمتی سے ہمیں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے تو کیا کریں؟ میں بھی ضلع سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔ بٹوارہ ہو گیا تو کیا ہوا' آخر ہم ہیں تو ایک ہی! صدیوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں اور پھر تم بھی ہماری طرح دلیر لوگ ہو اور بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔" یہ اور اسی قسم کی دوسری

چکنی چپڑی باتیں وہ مجھ سے کرتا رہا۔ اس دوران میں ایک سپاہی میس سے چائے اور پوڑیاں لے آیا۔

میرے ساتھ ہی اس نے بھی ایک کپ میں چائے انڈیل لی اور مجھے مجبور کر کے پوڑیاں بھی کھلاتا رہا۔

بیشتہ کرنے کے بعد میں کسی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ اس دوران میں اس بیوقوف سکھ کرنل کو بھی جیسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کا جادو چل گیا ہے۔

"کیا نام بتایا تھا اپنا؟" اس نے اچانک سوال داغا۔ اپنی دانست میں بڑا نفسیاتی حربہ آزمایا تھا اس نے۔

"جی پرویز!" میں نے اسی پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"پی۔ اے تو ہو گے؟" اچانک اس نے پینترا بدلا۔

"وہ کیا ہوتا ہے سردار جی؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو میاں تم پرویز ہو یا جاوید۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے علم ہوا تھا کہ جاسوس پکڑا ہوا ہے اور مسلمانوں سے اپنی خصوصی محبت کی وجہ سے تمہیں دیکھنے آ گیا ہوں۔ میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ اس طرح میں تمہارے لئے رحم کی گنجائش نکال سکوں گا یا پھر زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مہینے جیل کاٹنے کے بعد ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔ اگر تم یہ سمجھو کہ یہاں جھوٹ سے کام چل جائے گا تو یہ وہم اپنے دل سے نکال لینا۔ تم خاصے صحت مند اور خوبصورت نوجوان ہو' لیکن ایک بازو یا ٹانگ سے اپاہج ہونے کے بعد تمہاری کیا حالت ہو گی' اس کا اندازہ شاید تم ابھی نہیں لگا سکتے۔ میاں! جان ہے تو جہان ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو تمہیں یہاں سے بھگا دیتا لیکن میں بھی نوکری کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ ہاں البتہ تمہاری اتنی مدد ضرور کر سکتا ہوں کہ اگر تم سچ سچ بتا دو تو میں اس افسر سے جو تمہاری تفتیش کرے گا کہہ کر معاملہ ختم کروا سکتا ہوں۔ یہاں ایسے ایسے اذیت ناک طریقے سے سزائیں دی جاتی ہیں کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور پھر بھی کوئی زبان نہ کھولے تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟

میں نے صرف سوالیہ نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھا دیں۔

"ہارڈر ایریا میں لے جا کر یہ لوگ کتے کی موت مار ڈالتے ہیں اور لاش کو جنگلی جانور کھا جاتے ہیں۔" اس نے آگے کی سمت جھکتے ہوئے بڑے ڈراؤنے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس نے خاموش ہو کر مجھ پر نظریں جما دیں' شاید وہ اپنے کہے ہوئے فقروں کا

ردعمل میرے چہرے پر تلاش کر رہا تھا۔

"سردار جی جو قسم دل چاہے لے لیں۔ میں بدمعاشوں کی اولاد ہوں اور تفتیش سے نہیں ڈرتا۔ نہ یہ میرے لئے کوئی نئی چیز ہے جو کچھ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں' میں وہ ہرگز ہرگز نہیں----" میں نے بڑی عاجزی لہجے میں اس سے کہا۔

"تو پھر تم کیا ہو؟" اس نے بڑے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

"بات صرف اتنی ہے سردار جی کہ میں کل رات کی "اٹ" لگانے بطور نمونہ صرف پانچ کلو ایٹیون لے کر اس طرف آیا ہوں' سرون سنگھ بے ایمان ہو گیا اور میرے خیال میں اس نے اپنے نمبر بنانے کے لئے آپ لوگوں کو میرے متعلق غلط اطلاعات دے کر مجھے گرفتار کروا دیا ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو اس کے گھر کی تلاشی لے لیں۔" میں نے وہی لہجہ برقرار رکھا۔

میرے جواب پر سکھ کرنل مسکرانے لگا۔

"جانے دو میاں پھر مجھے گالیاں دو گے کہ سکھ ہو کر بھی مسلمان سے ہمدردی نہ کی۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر اس طرح جھوٹ بولنے سے کام چل سکتا تو میں تمہیں آگے جانے ہی نہ دیتا لیکن سختی بہت زیادہ ہے اور تمہارے ساتھی بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔" اس نے آخری فقرہ کہہ کر ہوا میں تیر چلایا اور مطمئن ہو کر میری طرف دیکھا۔

"میرے ساتھی کبھی سرحد عبور نہیں کرتے سردار جی۔ میں بھی پہلی مرتبہ آیا اور پھنس گیا۔ ہم لوگ سرحد پر ہی مال کا لین دین کر لیتے ہیں۔" میرے جواب پر اس نے کھسیانے ہو کر میرے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

پھر اچانک وہ میری طرف پلٹا۔

"میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کیونکہ خواہ مخواہ دلچسپی لے کر میں اپنے متعلق ان لوگوں کو شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔" وہ اب بھی پرامید نظر آتا تھا۔

"فی الحال تو واپس اس کوٹھڑی میں جا رہے ہو۔ کاغذ پنسل وہاں موجود ہے۔ اگر میری بات مانو تو اس پر سب کچھ لکھ دو ورنہ تو یہاں تفتیش کا آغاز ٹانگ یا بازو توڑنے کے بعد کیا جاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ دوبارہ وہی سنتری اندر آیا۔ کرنل نے اسے مجھے لے جانے کا اشارہ کیا اور مجھے اپنے ہمراہ لئے وہ اسی کوٹھڑی میں آ گیا۔ کمرے کے باہر پندرہ بیس مسلح فوجی کھڑے تھے لیکن ان کے کھڑے ہونے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ عام معمول کے مطابق کھڑے ہوں۔ خصوصاً" میرے لئے نہیں---- میں خاموشی سے سر جھکائے سپاہی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے کوٹھڑی میں دھکیل کر وہاں موجود پہرے دار نے باہر سے تالا لگا دیا۔ کرنل کے کہنے کے

مطابق وہاں کاغذ اور قلم موجود تھا۔

میں چپ چاپ بیٹھا آنے والے حالات سے متعلق منصوبہ بندی کرتا رہا۔ یہاں سے فرار کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے متعلق تو میں نے سوچنا بھی فضول جانا۔

---رات کو پھر وہی کرنل آیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ ٹھیک ہے خود ہی دیکھ لو گے۔ میرا تو جو فرض تھا میں نے پورا کر دیا۔" کہہ کر وہ چلا گیا۔

ooo

کرنل کے جاتے ہی کچھ فوجی وہاں آ گئے اور دروازہ کھلتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ مجھے بید روی سے زدوکوب کرتے رہے پھر قریباً نیم بے ہوش کرنے کے بعد گھسیٹتے ہوئے ایک میجر کے پاس لے گئے' جس کے اشارے پر مجھے پانی پلایا گیا تاکہ میرے اوسان بحال ہو جائیں۔ مجھے نارمل حالت میں دیکھ کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے خونخوار لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟"

میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے مجھے اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آ سکی۔

"بکو" اس نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"مہاراج جی میں تو....." اور میں نے وہی سردن سنگھ والی کہانی دھرا دی۔

اس کا غصہ آسمان پر جا پہنچا اور اس نے مجھے اپنے ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی سے جانوروں کی طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کار خیر میں باقی لوگ بھلا کس طرح پیچھے رہ سکتے تھے---- وہ بھی حسب توفیق اپنے میجر کا ساتھ دے رہے تھے۔ قریباً دو گھنٹے تک میں عذاب جھیلتا رہا۔ بالآخر انہوں نے مجھے دوبارہ اسی کوٹھڑی میں لا پھینکا۔

شام کے وقت مجھے ایک اور کرنل کے سامنے پیش کیا گیا' شاید وہ لوگ باری باری اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتے تھے۔ یہ ہندو کرنل سب کا استاد نکلا۔

"مسٹر پرویز مجھے افسوس ہے کہ ہائی کمان نے تمہارے بارے میں حکم دیا ہے کہ اگر تم سچ نہ بتاؤ تو تمہیں گولی مار دی جائے۔ میں تمہیں آدھا گھنٹہ سوچنے کا موقعہ دیتا ہوں اس کے بعد ہمیں معذور سمجھنا۔" اتنا کہہ کر اس نے مجھے واپس لے جانے حکم دیا۔

واپسی پر میرے ساتھ ان کا سلوک خاصا خوشگوار تھا۔ سب سے پہلے میرے لئے چائے آ گئی اور آدھ گھنٹے میں تین میجر باری باری میری برین واشنگ کرتے رہے کہ مجھے سب کچھ سچ بتا دینا

چاہیے۔ آدمی زندہ ہو تو رہائی بھی کبھی نصیب ہو ہی جاتی ہے۔

جب آدھ گھنٹے تک میں ٹس سے مس نہ ہوا تو وہی کرنل آ گیا۔ "ٹھیک ہے اگر تم نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس طرح تمہیں کوئی بڑا اعزاز مل جائے اور پھر تم لوگ شہید بھی تو ہو جاتے ہو۔" اس نے یہ ساری باتیں طنزیہ لہجے میں کی تھیں۔

پھر حکم ملا کہ میں اگر چاہوں تو مرنے سے پہلے عبادت بھی کر سکتا ہوں۔ انہوں نے مجھے باقاعدہ غسل کے لئے پانی مہیا کیا پھر نماز پڑھنے کی مہلت بھی دی۔ اس اثناء میں مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ جیسے ہی اندھیرا پھیلنا شروع ہوا' انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے پہلے سے تیار ایک ٹرک میں بٹھا دیا۔ جب میں ٹرک میں سوار ہوا تو کسی نے آواز لگائی:

"باقی دونوں کو بھی لے آؤ۔" یہ فقرہ دانستہ مجھے سنانے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ اپنی طرف سے دشمن نے چالاکی دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور بڑا شاندار ڈرامہ ترتیب دیا تھا۔

قدموں کی آہٹ گونجی' جیسے میرے بعد کوئی اور بھی سوار ہوا ہو اور ٹرک چل پڑا۔ سپاہی جو میرے ساتھ جا رہے تھے مجھ سے بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو' اب بھی مان جاؤ لیکن میں تن بہ تقدیر بیٹھا ان کی چالاکی پر دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد ٹرک ایک جگہ ٹھہر گیا اور کسی نے آواز لگائی۔

"بندوبست ہو گیا۔"

"آل رائٹ سر" جواب ملا۔

پھر کسی نے میرے قریب آ کر کہا۔

"مسٹر پرویز تمہیں آخری چانس دیا جا رہا ہے یا تو اپنے جاسوس ہونے کا اقرار کر لو یا پھر-----" یہ لدھورا جان بوجھ کر انگریزی میں کہا گیا تھا۔

میں خاموش رہا' نیچے سے کسی کی آواز آئی۔

"نمبر ون کو لاؤ" ٹرک سے کسی کے اٹھنے کی آواز آئی اور چند منٹ کے بعد ہی فائرنگ سنائی دی۔ پھر وہی آواز گونجی۔

"نمبر ٹو کو لاؤ۔" وہی عمل دہرایا گیا اور دوبارہ آواز گونجی۔

"نمبر تھری کو لاؤ۔" اس کے ساتھ ہی دو جوانوں نے میرے بازوؤں دونوں طرف سے تھام لئے۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ سب ڈرامہ بازی ہے لیکن پھر بھی خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ

کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ حلق خشک ہوتا جا رہا تھا اور حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ ٹھہر گئے اور مجھے کسی نے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

"نمبر تمہیں آخری موقعہ دیا جا رہا ہے۔" تب میں نے سوچا اگر وہ حقیقت میں جو اس سے پہلے ہو چکا ہے تو مجھ سے پہلے شہادت پانے والوں کو بھی آخری موقعہ ملا ہو گا اور فائرنگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے عزم پر ڈٹے رہے۔ "پھر میں کیوں نہ ان کا راستہ ہی اختیار کروں اور اللہ کے حضور سرخروئی کے ساتھ پیش ہوں۔" اس خیال نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں نے انہیں بجائے جواب دینے کے دل ہی دل میں کلمہ شہادت کا ورد شروع کر دیا۔

"تیار جوان" وہی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ رائفلوں کے لوڈ کرنے کا شور ہوا' اچانک کسی نے چلا کر کہا۔

"سٹاپ" کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

"اسے ابھی آئی۔جی کے روبرو پیش کرنا ہے' اوپر سے حکم آیا ہے۔" آنے والے نے کہا۔

"بڑے خوش قسمت ہو کچھ دن اور زندہ رہنے کو مل گئے۔" وہی آواز سنائی دی۔

مجھے رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے وہ لوگ گھسیٹتے ہوئے ایک جیپ تک لے آئے اور جب میری آنکھوں کی پٹی کھلی تو میں ایک پولیس سٹیشن میں موجود تھا۔

ooo

یہاں ساری رات پولیس والے مجھ پر تشدد کرتے رہے۔ وہ پولیس کے روایتی حربے تھرڈ ڈگری اپنا رہے تھے لیکن میری طرف سے انہیں وہی کہانی سننے کو مل رہی تھی جو میں پہلے بیان کر چکا تھا۔ قریباً" چار گھنٹے تک مغز ماری کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے مجھے لوہ مواکر کے حوالات میں پھینک دیا۔ میرا پولیس ریمانڈ انہوں نے حاصل کر لیا تھا۔

صبح پولیس کے چار سپاہی مجھے لے کر عازم امرتسر ہوئے جہاں پنجاب کے بدنام ترین امرتسر انٹروگیشن سنٹر میں میری تفتیش ہونا قرار پائی۔

پولیس نے کمال مہربانی سے میری آنکھوں پر پٹی نہ باندھی۔ میری چادر بھی ابھی تک اتفاق سے میرے پاس موجود تھی۔ کسی کی نظر اس طرف نہیں گئی تھی ورنہ انہوں نے تو مجھے میری جوتیوں تک سے محروم کر کے ایک ٹوٹی پھوٹی چپل پہنا دی تھی۔ میرے ساتھ دو رائفل بردار سپاہی تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی بندوقیں لوڈ نہیں رہتیں۔

سرحد یہاں سے قریباً" ایک ڈیڑھ میل دور تھی۔ میں نے جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا اور فرار کا منصوبہ بنا لیا۔ انہوں نے ہتھکڑی میرے ایک ہاتھ میں پہنا دی۔ تھانے سے کچھ فاصلے پر کھیتوں

کا سلسلہ تھا جس کے بعد دیہاتی آبادی اور پھر سرحد۔۔۔۔!

ہم لوگ تھانے کے نزدیک اس میدان کی طرف جا رہے تھے جہاں سے ہمیں امرتسر جانے کے لئے لاری حاصل کرنا تھی۔ یہاں صرف گنتی کے چند لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایک سپاہی نے میری ہتھکڑی کا کنڈا لاپرواہی سے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جیسے ہی موقعہ ملا میں نے پورے زور سے جھٹکا مارا اور ہتھکڑی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ چند سیکنڈ کے لئے تو وہ سب ہکے بکے رہ گئے' میں دیوانہ وار کھیتوں کی طرف بھاگ نکلا "بھاگو' پکڑو" کا شور مچاتے ہوئے پولیس والے میرے تعاقب میں تھے۔

بدقسمتی سے کھیتوں کے نزدیک کچھ نہنگ سکھ کھڑے تھے' وہ چوکنے ہو گئے اور اپنے روایتی برچھے نکال' میری طرف لپکے۔ وہ میرے اتنے قریب آ چکے تھے کہ جھکائی دے کر نکلنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ میں نے اپنی دانست میں بڑی اونچی چھلانگ لگائی لیکن ایک نہنگ کے برچھے کی انی میرے ٹخنے میں پیوست ہو گئی اور میں منہ کے بل نیچے آ رہا۔

وہاں موجود تقریباً" تمام لوگ پولیس سمیت مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اتنا مارا کہ دوبارہ مجھے ہوش تھانے میں آ کر ہی آیا۔ دو دن تک وہ لوگ زخمی ہونے کے باوجود اپنا غصہ مجھ پر نکالتے رہے۔ تیسرے روز میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر الٹی ہتھکڑی انہوں نے مجھے لگائی اور ایک جیپ میں بٹھا کر امرتسر کو چل دیئے۔

ooo

انٹروگیشن سنٹر کے باہر جیپ ٹھہر گئی۔ میری آنکھوں پر بدستور پٹی بندھی رہی۔

۔۔۔۔مجھے گھسیٹتے ہوئے وہ لوگ ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرہ اصل میں باہر بنا ہوا تھا جہاں ملزموں کا اندراج کیا جاتا تھا۔ میرا چارج ان لوگوں نے وہاں موجود گارد کو دے دیا اور چند منٹ کے بعد ہی میں نئے قصائیوں کی معیت میں مذبح خانے کی طرف جا رہا تھا۔

مسلسل آنکھوں پر پٹی بندھی رہنے کی وجہ سے میری کنپٹیاں دکھنے لگی تھیں لیکن کسی بھی مرحلے پر میں نے ان سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ وہ اس کی گرفت ڈھیلی کر دیں۔ چلنے سے میری ٹانگ کا درد بھی جاگ اٹھتا تھا لیکن یہ ایسی باتوں پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔

میری آنکھوں پر پٹی ایک بڑے ہال کمرے میں لے جا کر کھولی گئی۔ پہلے پہل تو یوں لگا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں لیکن جلد ہی بینائی بحال ہو گئی۔ میرے سامنے ایک ایس پی' دو انسپکٹر اور تین چار سپاہی کھڑے تھے۔ وہ سب مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"کی نیں اے تیرا؟" سکھ ایس پی نے پوچھا۔

"سردار جی پرویز۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"بولتے کس طرح ہو لوئے؟" ایک انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

ایس پی مجھے گالیاں بکنے لگا' شاید یہ کوئی سگنل تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے میری ٹانگ کھینچ کر مجھے منہ کے بل زمین پر گرا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک کمبل مجھ پر آن پڑا۔ یہ کمبل خاصا بھاری تھا۔ کمبل کے نیچے دبتے ہی مجھ پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس سزا کا نام "کمبل پریڈ" ہے اور ہر نووارد کو سب سے پہلے اسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پہلے تو اچانک کمبل اوپر آ پڑنے سے دم گھٹنے لگتا ہے' پھر اس پر ان درندوں کا بے تحاشہ لاٹھیاں برساتا' چیخنے چلانے کی آواز بھی باہر نہیں نکل پاتی---- قریباً" تین چار منٹ تک ان کی مشق ستم جاری رہی اور جب میں مار کھاتے کھاتے ادھ موا ہو گیا تو وہ مجھے ڈنڈا ڈولی کرتے ایک اور دروازے سے گزار کر دوسرے احاطے میں لے گئے جہاں ایک قطار میں بہت سی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

مجھے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ایک کوٹھڑی کے سامنے وہ آ کر ٹھہر گئے۔ ان میں سے ایک نے کوٹھڑی کا تالا کھولا اور میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے مجھے اندر دھکیل دیا۔

"اب بھاگ کر دکھانا۔" اس نے تالا لگاتے اور مجھے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

ان کے دفع ہونے کے قریباً" دس پندرہ منٹ بعد دو اور قصائی نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ میں بڑا سا ڈول پکڑ رکھا تھا جب کہ دوسرے نے اپنے سر پر ایک بڑی سی چنگیر میں روٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

"لوئے مسلے---- روٹی لے لے۔" یہاں کی شاید یہ روایت تھی کہ وہ لوگ پرماتما کا ذکر بھی گالی کے بغیر نہیں کرتے تھے۔

میں نے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک تو یہاں آتے ہی اڑ گئی تھی لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ زہر مار کرنے کا فیصلہ کر کے آگے بڑھا۔

چنگیر والے نے دو پھلکے سلاخوں میں سے پھیلے ہاتھوں پر پھینک دیئے اور آگے بڑھ گیا۔ ڈول والے نے ایک لمبی سی لکڑی (جس کے آگے ٹین کی ایک پیالہ نما کپی بن ہوئی تھی) ڈول میں ڈالی اور پھلکوں پر دال نما کوئی شے ڈال دی۔ ابھی میں وہیں بیٹھا تھا کہ اچانک اس نے سلاخوں کے اندر ہی سے وہ ڈنڈا میرے سر پر دے مارا۔

"سالا نخرے کرداں۔" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

اس اچانک حملے سے روٹی میرے ہاتھ سے نیچے جا گری۔ میرا خون کھول اٹھا' جی چاہا کہ کسی

طرح باہر نکلوں اور اس کا ٹینٹوا دبا دوں لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا کہ یہاں سوائے صبر و تحمل کے اور چارہ ہی نہیں تھا۔

کوٹھڑی کے ایک کونے میں بچھے ہوئے ایک میلے کچیلے کمبل پر جا بیٹھا۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ حیرانی تو مجھے اس بات پر تھی کہ میری ہڈیاں کیسے سلامت رہ گئی ہیں!

——ابھی وہاں بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے جب اچانک جیسے میں لرز اٹھا۔ ایسی دردناک چیخ تھی وہ——

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی پے در پے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"ہائے' لوئی' نہ مارو' نہ مارو۔" اور اسی نوعیت کے دوسرے فقرے جو چیخوں اور کراہوں میں ڈھلتے اور سننے والوں کی ریڑھ کی ہڈی میں پیہم خوف کی ایک سرد لہر دوڑا رہے تھے۔

اس کا مطلب واضح تھا۔ میری نفسیاتی اذیت کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ ایسی آوازیں جان بوجھ کر نئے آنے والوں تک پہنچائی جاتی ہیں تاکہ وہ مسلسل ذہنی کرب میں مبتلا رہیں۔

تھوڑی دیر گزری تو ایک اور شخص پلاسٹک کے ایک جگ میں پانی لے کر آ گیا۔ اس نے سلاخوں کے اندر سے پانی ایک دھار کی شکل میں پھینکا اور میں نے جانوروں کی طرح "لوک" میں پانی پیا۔ ابھی اسے گئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک حوالدار اس طرف آ نکلا۔

"لوئے تو نے روٹی کیوں نہیں کھائی؟" اس نے بھی گالیوں کا ورد شروع کر دیا۔

مجھے بعد میں علم ہوا کہ روٹی نہ کھانے والے کو جیل اور تھانے میں زبردستی روٹی کھلائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ دوران تفتیش "جگ راتا" ہی سزا سے بچنے کے لئے لوگ روٹی کھانا چھوڑ دیتے تھے اور جیل میں ہڑتال کرنے کے لئے یہ "نسخہ" آزمایا جاتا تھا۔

گالیاں بکتا ہوا وہ تو دفع ہو گیا لیکن یاجوج ماجوج میرے سر پر آ مسلط ہوئے۔ روٹی فرش پر دیکھ کر وہ سب باجماعت ہو کر گالیاں بکنے لگے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم پر قیامت ٹوٹنے لگی۔ وہ وحشیوں کی طرح دیوانہ وار مجھے مارنے لگے۔ پھر حکم ملا کہ زمین سے روٹی اٹھا کر کھاؤں اور زمین پر گری دال کو زبان سے چاٹوں۔ وہ لوگ انسانیت کی پست ترین سطح پر اتر آئے تھے۔ میں نے اس سے انکار کر دیا۔ جس کے ساتھ ہی مجھ پر تشدد ہونے لگا اور بے ہوش کرنے کے بعد انہوں نے مجھے کوٹھڑی میں پھینک کر تالا لگا دیا۔

تمام قیامتیں مجھ پر باقاعدہ تفتیش سے پہلے ٹوٹ رہی تھیں اور باقاعدہ تفتیش کا مرحلہ ابھی باقی تھا—— شام تک میں بے ہوش رہا' شام کے بعد ایک ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔

"ابھی نہیں مرتا" کہہ کر اس نے زوردار ٹھوکر مجھے رسید کی اور چلا گیا۔

وہ قیامت کی رات تھی۔ مسلسل مار کھاتے میرا انگ انگ ٹوٹنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے جسم کی تمام ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دی ہیں۔ رات کو اوپر اوڑھنے کے لئے کمبل دے دیا گیا' جسے میں نے فوراً" ہی اتار کر ایک طرف پھینک دیا: اس میں سے عجیب و غریب کیڑے برآمد ہو کر میرے جسم میں سوئیاں سی چبھونے لگے تھے۔

وہ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی کیونکہ رات کو عام طور سے تفتیش کی جاتی تھی اور سامنے بنی بارک کے اوپر خاص طور سے "تفتیشی سیل" بنائے گئے تھے۔ ساری رات مار کھا کر فریاد کرنے والوں کی آہیں اور کراہیں میرے ذہن پر ہتھوڑے برساتی رہیں اور طلوع فجر کے قریب ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے پر لگنے والی ضربات نے مجھے جگا دیا۔

○○○

تمام ملزموں کو ان کی کوٹھڑیوں کے سامنے جمع کیا جا رہا تھا۔ معلوم ہوا ناشتہ ملنے والا ہے۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ ناشتہ کیا ہو گا؟ کہ ناشتہ دینے والے بھی نظر آ گئے جنہیں دیکھتے ہی تمام ملزمان سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔ مجھے بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی پوزیشن اختیار کرنا پڑی۔

اس کے ساتھ ہی "ہائے ہائے" کی آوازیں بلند ہونے لگیں کیونکہ تمام ملزموں کو جو یہاں زیر تفتیش تھے صبح ہوتے ہی پانچ پانچ "لتر" مارے جاتے تھے۔ یہ لتر کوئی معمولی قسم کے نہیں ہوتے تھے بلکہ یوں سمجھئے کہ چمڑے کی دو تہوں کے اندر لوہے کی ایک پتری رکھی ہوتی تھی جسے لتر کا نام دیا جاتا تھا۔

"ناشتے" سے فارغ ہو کر ہمیں رفع حاجت کے لئے لے جایا گیا۔ جس کا طریقہ اتنا بے ہودہ تھا کہ قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ واپسی پر ہمیں ایک جوہڑ کے کنارے پہنچا دیا گیا جس کے کنارے پر ایک بڑا سا درخت تھا جس پر بیٹھے پرندوں کی گندگی درخت کے پتے اور مٹی وغیرہ سب کچھ اس میں گرا ہوا تھا اور جوہڑ نما تالاب کا پانی گدلا ہو رہا تھا۔ یہاں جانوروں کی طرح اوندھے منہ جھک کر صرف کلی کرنے اور ہاتھ دھونے کی اجازت تھی۔ تالاب کے پانی پر جھکے ہوئے جب میں نے وہاں نظر آنے والی شکلیں دیکھیں تو وحشت سی ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں انسانوں میں نہیں بلکہ کسی چڑیا گھر کی مخلوق کے ساتھ موجود ہوں۔ مسلسل اذیتیں برداشت کرتے کرتے وہ لوگ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے تھے۔

خوف کے مارے ان کے رنگ پیلے ہو رہے تھے۔ ہر کسی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے' میلے کچیلے جسم پر خون آلود اور پھٹے ہوئے چیتھڑوں کے ساتھ وہ لوگ جانوروں کی بھی کوئی بدترین نسل دکھائی دیتے تھے۔ اگر کسی عام ملزم کو صرف ایک مرتبہ "ناشتہ" اور "اشنان" مل جائے تو اس کی مجال نہیں کہ وہ کوئی بات یہاں سے چھپا کر لے جائے۔

امرتسر انٹروگیشن سنٹر سارے بھارت میں اپنی سفاکی اور درندگی کے لئے مشہور ہے۔ کسی زیر تفتیش ملزم کا مرجانا یہاں معمول کی کارروائی سمجھی جاتی ہے۔ اخبارات میں اس سنٹر سے متعلق ایسی ایسی اندوہناک تفصیلات شائع ہوتیں کہ انسانیت خون کے آنسو روتی تھی۔ تمام اضلاع کے پکڑے ہوئے بدنام اور سفاک قسم کے تفتیشی افسران یہاں لائے جاتے اور وہ انسان نما درندے اذیت دینے کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کرتے کہ جن کے ذکر ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جن سپاہیوں کی ڈیوٹی گرفتار شدگان کو "اذیت" دینے کی ہوتی انہیں "سپیشل ڈائٹ" دی جاتی تھی اور خصوصی حکم کے ذریعے کھانے کے ساتھ شراب بھی پلائی جاتی تھی' مبادا ان کے دل میں مار کھانے والوں کی آہ زاری رحم کا شائبہ پیدا کر دے۔

مجھے معلومات تو یہاں کے متعلق پہلے ہی سے حاصل تھیں لیکن اس مخصوص جگہ کو دیکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا تھا اور اسے سنید سے کچھ زیادہ ہی بدتر پایا۔

○○○

ہمیں واپس کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا اور ایک مرتبہ پھر پہلے کی طرح کھانا دیا گیا۔ ابھی میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ گارد آن پہنچی۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر وہ لوگ مجھے ایک "عقوبت خانے" میں لے آئے جہاں پتھر کی ایک کرسی پڑی تھی۔ جس پر دونوں ہاتھوں کو جکڑنے کے لئے شکنجے موجود تھے۔

اس طرح ایک لمبی پتھر کی میز پر ایذا رسانی کے مختلف آلات رکھے تھے۔ ایک کونے میں ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کرسی پر ایک سکھ انسپکٹر بیٹھا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں لاٹھی بردار سپاہی کھڑے تھے جن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ پہلی نظر میں یہ کمرہ اس طرح کا نظر آیا جیسا میں نے اکثر فلموں میں گستاپو کے تفتیشی مراکز میں دیکھا تھا۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور مجھے اندر دھکیل کر گارد والوں نے دروازہ بند کر دیا۔ میں دھکا لگنے سے گرا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں موجود تمام درندے اس اثناء میں مجھے گھورتے رہے۔

"کیا نام ہے تمہارا۔" سکھ انسپکٹر نے بڑی درشتگی سے پوچھا۔

"پرویز!" میں نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا کیونکہ مجھے اپنے ذہن میں تیار شدہ پلان کے مطابق کام کرنا تھا۔

"تجھے افسروں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔" کہتے ہوئے ایک سپاہی نے میری پنڈلیوں پر لاٹھی ماری۔ اس کے ساتھ ہی چاروں درندے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ جب انہوں نے جی بھر کے اپنے ارمان نکال لئے تو وہ سکھ انسپکٹر جو اس اثنا میں اس سارے تماشے سے بظاہر لاتعلق بیٹھا رہا تھا اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور زوردار گھونسہ میرے پیٹ میں مارا۔ میں سامنے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ میں زمین پر گروں اس نے دوبارہ مجھے بالوں سے پکڑا اور جوڈو کے ماہروں کی طرح اس قدر زوردار لات میرے پیٹ میں رسید کی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔ اذیت کی ایک لہر میری آنتوں میں دوڑ گئی' میں نے چیخنا چاہا لیکن چیخ نہ سکا۔ اسی سکھ انسپکٹر نے مجھے دھکا دے کر پتھر کی اس کرسی پر گرا دیا اور بجلی کی طرح دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ کرسی کے پایوں سے منسلک شکنجوں میں کس دیئے۔ یہی عمل انہوں نے میری ٹانگوں کے ساتھ دہرایا۔ میرے منہ سے بمشکل کراہیں نکل رہی تھیں۔ درد کی ٹیسیں اٹھتیں تو کلیجہ کٹنے لگتا۔

سپاہی پرے ہٹ گئے اور سکھ انسپکٹر نے کرسی میرے سامنے رکھ لی——!

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" اس نے اپنا خونخوار جبڑا کھولا۔

"سیالکوٹ کا۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کیا کرنے آیا تھا؟"

"اٹ لگانے آیا تھا سردن نے....."

میرا جواب نامکمل ہی تھا کہ وہ وحشیوں کی طرح اٹھ کر میرے گالوں پر طمانچے مارنے لگا۔ میرا سارا منہ خون سے بھر گیا اور قے ہونے لگی۔ طمانچے مارتے مارتے جب وہ ہانپنے لگا تو میرے سامنے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سچ سچ بتا کیا کرنے آیا تھا؟" اس نے دوبارہ وہی سوال دہرایا اور اس مرتبہ اس کے جواب میں' میں نے جو کچھ کیا وہ ان لوگوں کے لئے تو بالکل غیر متوقع تھا ہی' میرے لئے بھی حیران کن تھا—— میرے اندر پکنے والا نفرت اور غصے کا لاوا جسے میں نے کسی نہ کسی طرح دبائے رکھا تھا' پھٹ پڑا اور میں نے پورا زور لگا کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

میری اس حرکت نے ان پر جنون طاری کر دیا۔ سکھ انسپکٹر تو پھٹی پھٹی خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جب کہ دوسرے سپاہی پاگل کتوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔ وہ میرے سینے

اور منہ پر مکے مارنے لگے۔ میں بھی دیوانہ وار ان پر تھوکنے لگا۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد ہی میری گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ooo

اس مرتبہ ہوش میں آیا تو میں کسی دوسرے کمرے میں اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی کے ساتھ پشت پر بندھے تھے۔ ایک سپرے دار باہر موجود تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ چلا گیا' غالباً" کسی کو رپورٹ کرنے گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مکروہ شکل کا ڈاکٹر گارڈ کے ساتھ کمرے میں آدھمکا۔ اس نے مجھے ٹھونک بجا کر معائنہ کیا اور ایک انجکشن میرے بازو میں لگا کر رفع ہو گیا۔

کمرے کی سلاخوں سے باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میرے ہونٹ جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور کپڑوں پر جابجا خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ پپوٹوں پر اتنی سوجن آ چکی تھی کہ مجھے آنکھیں کھولے رکھنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی کچھ اور لوگ اندر گھس آئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیئے اور ان میں سے ایک نے مجھے پانی کا گلاس بھی پینے کو دیا۔ میرے پیٹ میں درد کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ پانی پینے کو دل تو چاہتا تھا لیکن بمشکل گھونٹ گھونٹ کر کے میں نے آدھا گلاس اندر انڈیلا۔ ابھی تک انہوں نے مجھے مارنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں میری حالت پر رحم آ رہا تھا بلکہ ان کی دانست میں میرے مرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اگر میں مر جاتا تو وہ تختۂ مشق کسے بناتے؟

اس مرتبہ ایک پلیٹ میں انہوں نے مجھے سبزی اور پھلکے کھانے کو لا دیئے۔ کھانا ان کے میس کا بنا ہوا لگتا تھا لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود آدھے پھلکے سے زیادہ پھلکا نہ کھا پایا۔ وہ سب مجھ پر نظریں جمائے کھڑے اس بات کا جائزہ لے رہے تھے کہ کہیں میں ایکٹنگ تو نہیں کر رہا؟

بچی کچی روٹی وہ واپس اٹھا کر لے گئے اور قریباً" دو گھنٹے تک کسی نے مجھے کچھ نہ کہا۔ اس دوران میں اپنے جسم سے اٹھنے والی اذیت ناک درد کی لہروں سے پیچھا چھڑانے کے لئے تصور ہی تصور میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا—— میرے سامنے مختلف چہرے سوال بن کر آتے اور کوئی جواب نہ پا کر واپس لوٹ جاتے۔ ماں' باپ' بہن' اپنا وطن' وہاں کے لوگ' اپنے سکول کالج کا زمانہ اور پونم!!

میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور جب دروازہ کھلنے کی آواز مجھے حقیقت کی دنیا میں واپس لائی تو اپنے گالوں پر نمی کا احساس ہوا۔ بے اختیار میرے ہاتھ گالوں کا جائزہ لینے لگے جہاں

جلتی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے قطرے نکل کر بہہ رہے تھے۔ مجھے اپنی بزدلی پر غصہ تو آیا لیکن یہ معاملہ دل کا تھا دل کی کا نہیں۔۔۔!!

آنے والے بزدل ہی سمجھے تھے کہ میں تکلیف کی شدت سے رو رہا ہوں۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور مجھے دھکے دیتے ہوئے پھر اسی ممنوع خانے میں لے گئے۔ اس مرتبہ یہاں پہلے والے لوگ نہیں تھے۔۔۔ سول وردی میں ملبوس ایک اعلیٰ افسر موجود تھا اور چاروں کونوں میں چار درندے مجھ پر نظریں گاڑے اشارے کے منتظر تھے۔

"بیٹھ جا۔" میرے اندر گھستے ہی اس نے پتھر کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم یہاں اٹ لگانے آئے تھے؟" میرے بیٹھتے ہی اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔

"اور وہ جو پکڑے گئے ہیں تمہارے رشتے دار؟" اس نے بھی کرنل کی طرح ہوا میں تیر چلایا۔

"میرے رشتے دار کبھی سرحد عبور نہیں کرتے۔ میں ہی پہلی بار آیا اور پکڑا گیا۔" میرے لہجے میں وہی سکون چھپا تھا جس نے ایک مرتبہ اس آفیسر کے پیر بھی ڈگمگا دیئے۔

"تم شاید نہیں جانتے' ہمیں سچ اگلوانا آتا ہے۔" اس نے دھمکی دیتے ہوئے بظاہر سنبھلا لیا۔

"آپ مجھے جان سے بھی مار ڈالیں' اس کے علاوہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

"تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو۔" وہ غصے میں دھاڑا۔

میں خاموش رہا۔۔۔!

وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے حکم دیا کہ تمام واقعات سچ سچ بتاؤں۔ میرے ذہن میں ایک ہی بیان کی محفوظ شدہ ٹیپ چل پڑی۔ یہ بیان ٹیپ میں ریکارڈ ہونے لگا۔

بیان کے خاتمے پر اس نے ٹیپ کا سوئچ آف کر دیا۔

"اس طرح یہ سچ نہیں بولے گا۔" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

انہوں نے فوراً میرے ہاتھ پاؤں اسی طرح باندھ دیئے۔ میز پر لوہے کی پتلی پتلی پنسل نما

سلاخیں رکھی تھیں۔ آفیسر نے ایک درندے کو اشارہ کیا' اس نے وہ سلاخیں اٹھا کر میرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسائیں اور انہیں زور زور سے دبانے لگا۔ مار کھاتے کھاتے میرا جسم بے حس ہو چکا تھا لیکن یہ اس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ سزا تھی کہ میرے جسم کا رواں رواں تکلیف سے چیخ چیخ اٹھنے لگا۔ چلاتے چلاتے میرا گلا بیٹھ گیا۔

"چلاتے رہو۔ جب تک سچ نہیں بولو گے۔۔۔ جان نہیں چھوٹے گی۔" اس کی قہر آلود آواز میرے تاریک ہوتے ذہن سے ٹکرائی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

اس مرتبہ مجھے تین دن کی چھٹی مل گئی۔ ان تین دنوں میں مجھے "ناشتہ" باقاعدگی سے ملتا رہا۔ دن میں دو مرتبہ وہ قصائی ڈاکٹر آتا اور الٹے سیدھے انجکشن لگا کر چلا جاتا۔

یہ سزائیں اتنی اذیت ناک تھیں کہ اچھے بھلے بہادروں کا پتہ پانی کر کے رکھ دیتیں۔ یہاں بڑے بڑے سورما آتے اور اپنے جرائم کا اقرار کر کے چلے جاتے۔ میں کوئی بہت طاقت ور انسان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر بے پایاں اعتقاد' اپنے مشن کی صداقت پر یقین اور میرا عزم صمیم! یہ تھی وہ قوتیں جنہوں نے میرے ناتواں جسم کو فولاد جیسی مضبوطی عطا کر دی تھی۔

تین روز کے بعد پھر میرا بیان وہی تھا۔ پولیس نے میرے دو ریمانڈ لئے اور ایک مہینہ تک انہوں نے جب اپنے سارے ستم مجھ پر آزما لئے تو جیسے انہیں میرے بیان پر یقین آ گیا۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے سورن سنگھ نے صرف نمبر بنانے کے لئے ہی مجھے "جاسوس" کہہ کر گرفتار کروایا ہو اور میں حقیقت میں وہی ہوں جو کہہ رہا ہوں۔

ooo

تفتیش کے خاتمے کے بعد مجھے واپس اسی تھانے میں لایا گیا اور ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے جوڈیشل ریمانڈ پر مجھے جیل بھیج دیا۔

میرے "رفقاء" نے سورن سنگھ کو یونہی نہیں چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے دوسری ہی رات میرا انتقام لے لیا۔ مجھے اسی تھانے میں اس کی عبرت ناک موت کا واقعہ سننے کو ملا تھا۔ اسے میرے کسی "پراسرار" ساتھی نے راتوں رات سرحد عبور کر کے اس کے گھر سمیت ہینڈ گرنیڈ سے اڑا دیا تھا۔

۔۔۔اور سوائے میرے اور کسی کو علم نہیں تھا کہ پراسرار شخص جسونت تھا۔۔۔!

۔۔۔میرا عظیم ساتھی جسونت جس نے اگلے ہی روز سورن سنگھ سے میرا حساب چکا دیا تھا۔ سورن کی موت نے جیسے میرے سینے پر رکھی پتھر کی سل ہٹا دی تھی۔ میرا حوصلہ دوچند ہو گیا۔

جب میں کمرہ عدالت سے باہر نکلا تو ایک ہجوم میرا نظارہ کرنے کے لئے وہاں موجود تھا

کیونکہ بھارتی پولیس ان دنوں کسی پاگل شخص کو بھی گرفتار کر لیتی تو اسے بھی پاکستانی جاسوس ہی مشہور کیا جاتا جب کہ میرے متعلق تو اخبارات نے نہ جانے کیا کیا افسانے تراشے تھے۔

نظارا کرنے والے اسی ہجوم میں ہمارے کارخانے کا ایک ملازم بھی شامل تھا۔ شاید اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظریں مجھ سے ملیں' مجھ پر گویا بجلی سی گر گئی۔ میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی کے ساتھ خود کو نارمل رکھا اور اسے یہ شک نہ ہونے دیا کہ میں "پرکاش بابو" ہوں۔

ہوا تو یوں ہی لیکن اس نے اگلے روز جب وہ کام پر گیا تو---- پرکاش سے میرا تذکرہ کر دیا۔

میں چونکہ اتنا لمبا کبھی غائب نہیں ہوا تھا۔ پرکاش نے جب پاکستانی جاسوس کا نام سنا ہو گا تو یقیناً بے چارے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو گی لیکن اس نے لڑکے کو ذرا شک نہ ہونے دیا اور یہی ظاہر کیا کہ میں کہیں باہر گیا ہوں اور خود انکوائری کرنے گورداسپور آ گیا جہاں کڑی سے کڑی ملاتا بالآخر وہ مجھ تک پہنچ گیا۔

گورداسپور جیل تک مجھے تھانے والے ہی چھوڑ آئے تھے۔ انہوں نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی Pak Spy کا نعرہ لگایا۔ ایک دفعہ تو میرا خون کھول اٹھا' وہ کمبخت ابھی تک مجھے جاسوس بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نعرے کے ساتھ ہی وہاں موجود قریباً" سبھی لوگوں نے گردن گھما گھما کر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور ایک ڈپٹی جیلر نے اپنی زیر نگرانی میری تلاشی لے کر مجھے اندر "سیاست خانے" میں دھکیل دیا---- یہ جیل کا وہ احاطہ تھا جہاں عموماً" غیر ملکی قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اور کچھ پاکستانی یہاں پہلے سے موجود تھے۔

جیل کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ یہاں کم از کم مجھے اس نفرت کا سامنا نہ کرنا پڑا جو تھانے اور تفتیشی مراکز میں میرے لئے پالی جاتی تھی۔ میں نے یہاں بھی اپنا تعارف بطور سمگلر کروایا اور "سمگلر" کو یہ لوگ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب کہ جاسوس ان کے لئے گالی کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیل کے "چکر" میں لے جا کر جو ایک طرح سے ہر جیل کا آپریشن ہیڈکوارٹر ہوتا ہے' میرے پاؤں میں لوہے کی بیڑی پہنا دی گئی۔ یہ پہلا تحفہ تھا جو ہر نئے آنے والے پاکستانی کو پیش کیا جاتا اور اس وقت تک یہ پاؤں سے نہ اترتی جب تک اسے رہائی نصیب نہ ہوتی یا پھر وہ مر نہ جاتا۔

مجھے جیل میں بند سکھ ملزموں نے پہننے کے لئے کپڑے دیئے اور چائے سے میری تواضع کر

ے میرا حوصلہ بڑھایا۔

قریباً" پندرہ بیس دن تک تو مجھے یہ علم ہی نہ ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ ہر وقت ذہن پر سوچیں سوار تھیں۔ میرے بیرونی زخم تو بھرنے لگے تھے۔ ہاتھ پر پٹی ہونے لگی تھی لیکن اندر کا گھاؤ گہرا

○○○

ہوتا جا رہا تھا۔ جب کبھی پونم کی یاد آتی' میں کٹ کر رہ جاتا----!

پھر آہستہ آہستہ میں نے تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا۔ پونم کی جدائی ایسا حادثہ تو نہیں تھا لیکن لاشعوری طور پر شاید میں شروع ہی سے خود کو اس وقت کے لئے تیار کرتا آیا تھا۔ اسی لئے یہ المیہ میں نے کسی حد تک برداشت کر لیا۔

پندرہ بیس روز بعد جب میں پولیس گارد کے ساتھ تاریخ پر جا رہا تھا تو میری حیثیت کسی خاص ملزم کی نہیں تھی۔ میں پاکستانی ضرور تھا لیکن مجھ سے بھی گارد والوں نے وہی رویہ اپنایا جو انہوں نے باقی حوالاتیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے میں نے اپنی جی داری کے ایسے ایسے افسانے گھڑ لئے تھے کہ وہ عش عش کر اٹھے۔

ہمیں احاطہ کچہری میں بٹھا دیا گیا۔ جہاں حوالاتیوں کے گروہ ان کے ملنے والوں کا جمگھٹا لگ گیا تھا۔ اسی ہجوم میں مجھے پرکاش کا کھویا کھویا چہرہ نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے وہ سن ہو کر رہ گیا۔ میں نے بھی گردن جھکا لی۔ اس کے علاوہ میں کر ہی کیا سکتا تھا۔

پرکاش آہستہ آہستہ میرے قریب آ گیا۔ اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ جس ذہنی اذیت سے وہ اس وقت دوچار تھا' اس کے آثار اس کے چہرے سے ہویدا تھے۔ میرے قریب آ کر اس نے بمشکل "بھیا" کہا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

"خدا کے لئے ضبط کرو پرکاش ورنہ....." میں بمشکل اس سے یہی کہہ پایا۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان سے آنسو ٹپک پڑنے کو بیقرار تھے۔ خود میری حالت بھی بیان سے باہر تھی لیکن میں جانتا تھا اگر ہمارے کسی عمل سے آپس کی آشنائی ثابت ہو گئی تو دنیا کی کوئی طاقت کم از کم پرکاش اور اس کے گھرانے کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے نہیں بچا سکے گی۔

گارد کے تمام ملازمین حوالاتیوں کے وارثوں سے مال پانی اینٹھنے میں الجھے ہوئے تھے اور حوالاتی اپنے وارثوں میں! ہماری طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ میں نے چند لفظوں میں پرکاش کو بتا دیا کہ میں واقعی پاکستانی سمگلر ہوں۔ ہمارا انٹرنیشنل گروہ ہے اور میں بھارت میں ان کی آڑ میں کام کر رہا تھا لیکن میرے کسی عمل سے کبھی ان پر آنچ نہیں آئے گی۔ آخر میں' میں نے اس

سے التجا کی کہ وہ گھر میں کسی کو میری اصلیت نہ بتائے۔ یہ مجھ پر اس کا بہت بڑا احسان ہو گا۔

وہ دیوانوں کی طرح ٹکر ٹکر میرے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میری بات سن کر چپ چاپ اٹھا۔ شاید آنسو بہانے گیا تھا' بے چارے نے وہاں موجود کنٹین سے میرے لئے چائے اور سموسے بھجوائے۔ یہ وہاں معمول کی کارروائی تھی۔ اس لئے کسی کے اس طرف دھیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

چائے ختم ہوتے ہی مجھے تاریخ کے لئے آواز پڑی۔ جب میں کمرہ عدالت میں داخل ہو رہا تھا تو پرکاش نے بڑی پھرتی سے میری مٹھی میں سو سو کے دو نوٹ تھما دیئے۔ اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ میں نے انہیں چھپانے میں کیا—— عدالتی کارروائی سے فارغ ہو کر جب پولیس گارد مجھے واپس لئے جا رہی تھی تو پرکاش مجھے ایک کونے میں کھڑا نظر آیا' وہ بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

آنے جانے والے حیرانگی سے اس پاگل لڑکے کو دیکھ رہے تھے: "شاید اس کے کسی عزیز کو لمبی سزا کا حکم ملا ہے۔" انہوں نے یہی سوچا ہو گا—— خود میری کیا حالت تھی؟ شاید دنیا کی کسی لغت میں اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہ ڈھونڈ سکوں۔

جیل پہنچ کر جب میں شام کو نماز پڑھنے لگا تو دعا مانگتے ہوئے بے اختیار رو دیا—— دل کا سارا لہو آنکھوں کے راستے میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور بہا کر یہی التجا کی کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھے اور میرے کسی عمل سے ان پر کوئی حرف نہ آنے دے۔

جیل میں ان پیسوں کی مدد سے میں نے نئے کپڑے اور یہاں استعمال کی مختلف چیزیں حاصل کیں۔ قریباً" ایک ہفتے کے بعد ایک روز جب ہم لوگ جیل کے ہسپتال میں دوائیوں کے بہانے جا رہے تھے تو میں نے ایک حوالاتی کو اپنے لئے کوشاں پایا۔ یہ لدھیانے کا ایک بدمعاش تھا جس نے میرا نام جاننے کے بعد گڑ دینے کے بہانے کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی مجھے تھما دیا۔ یہ خط پرکاش کی طرف سے تھا۔ وہ تمام خطرے مول لے کر بھی اپنے "رشتے" کی صداقت آزمانے پر تل گیا۔

"بھیا!

میں تمہاری بات پوری نہیں کر پایا مجھے شما کر دینا۔ اگر میں پونم کو نہ بتاتا تو وہ مر جاتی۔ وہ اب بھی مر جائے گی۔ مجھ سے گھر والوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ باقی تو سب کچھ برداشت ہو جائے گا لیکن پونم---- نہیں بھیا! میں انسان ہوں تمہاری طرح سنگدل نہیں۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے لیکن اس وچن کے ساتھ کہ وہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہیں

مارے گی۔ وہ بہت بہادر لڑکی ہے بھیا! ہماری طرح بزدل نہیں۔ اس نے بڑے حوصلے سے ساری بات سنی اور ایک آنسو تک نہیں بہایا۔ اسے سکتہ بھی نہیں ہوا۔ اب اس نے مجھ سے صرف ایک التجا کی ہے کہ میں ایک مرتبہ اسے آپ کی شکل دکھا دوں۔ یہ پاگل لڑکی ہے ایک دم پاگل!

بھیا میں اپنی تمام توانائیاں تمہاری رہائی کے لئے وقف کر دوں گا' جو کچھ ممکن ہوا کر گزروں گا۔ اور ہاں! اس تاریخ پر تمہاری ایک جھلک دیکھنے پونم بھی میرے ساتھ آئے گی۔ یہ ہے تو ظلم لیکن ہمیں رلایا ہے تو کچھ حق ہمیں بھی دو۔ بھیا! ہم اگلے جنم میں تم سے ضرور ملیں گے' تب تم پونم کا سامنا کیسے کر پاؤ گے؟ میں جانتا ہوں تم قاتل بھی بن سکتے ہو' لیکن تم میں موجود انسانیت کبھی نہیں مر سکتی۔

اب بھی تمہارا

پرکاش

پرکاش کا خط پڑھ کر میں رویا نہیں۔ میں پاگل بھی نہیں ہوا' میں مسکرا دیا۔ اب تک شاید میں روحانی مدہوشی کے عالم میں زیست و فرار کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ پرکاش کے دکھ کو محسوس کر کے میری روح اس سے موجود میرے آسمانی تعلق کی بنا پر گدگدا اٹھی۔ پرکاش کے دکھ نے اسے بالیدگی عطا کی تھی۔ میں تو اب تک لاشعوری طور پر اپنی کھوئی ہوئی محبت اور ہمت کو یکجا کرنے ہی میں مصروف تھا۔ وقت کتنے ہی دکھ کسی کی جھولی میں ڈال دے۔ زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے اگر پرکاش ایسے لوگ موڑ پر مل جائیں تو یہ زندگی کبھی گراں نہیں گزرتی۔

ooo

میں نے وہ خط فوراً" ضائع کر دیا اور اپنے سیل میں اس طرح آکر اپنے بستر پر گرا جیسے کوئی ہزاروں میل کا لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہانپ ہانپ کر بے بس ہو چکا ہو لیکن یہ کیفیت وقتی تھی' پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

—— پونم کی محبت نے مجھے جینے کی نئی امنگ دی تھی۔ میرے ڈانوں ڈول ذہن کو عمل کی راہ پر گامزن کیا تھا۔

میں خود کو اس لمحے کے لئے تیار کرنے لگا جب مجھے محبت کی اس دین کا سامنا کرنا تھا۔

----اس روز جب مجھے عدالت میں پیش ہونے کے لئے جیل نمبردار لینے آیا تو جیسے زمین نے

میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میرے قدم من من کے بوجھل ہو رہے تھے۔ بار بار ایک ہی سوچ مجھے پریشان کئے دے رہی تھی۔ میں پونم سے سامنا کیسے کر پاؤں گا؟

اور آخر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا۔

——— پرکاش نے جان بوجھ کر ایسا موقعہ منتخب کیا تھا۔ ہم تاریخ بھگت کر واپس جا رہے تھے۔ میں بس کے کونے والی سیٹ پر سر باہر نکالے بیٹھا تھا۔ جب لوگوں کے ہجوم میں میری نظر اس وفا کی دیوی پر پڑی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس وہ پرکاش کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ مجھ پر نظریں پڑتے ہی اس کی آنکھوں نے پتلیوں نے حرکت کرنا بند کر دی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

"یہی تھا ہجرت کر جانے کا لمحہ ——— تب میری توانائیاں' تربیت' چالاکی' ہشیاری سب ہی تو مجھے اس کے حضور اکیلا چھوڑ گئیں۔ سارے سبق مجھے یاد تھے لیکن فرار کی راہ نصیب نہیں تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیئے۔ مبادا اس اپسرا کی تصویر دھندلی پڑ جائے۔ میں اسے ذہن کے کسی ایسے گوشے میں محفوظ کر لینا چاہتا تھا جہاں سے لاکھ کھرچنے کے بعد بھی اسے مٹا نہ پاؤں۔ ان لمحوں کو میں اپنی شریانوں میں محفوظ کر لینا چاہتا تھا تاکہ خون کی گردشیں اس سراپا ایثار و وفا کو میرے اندر ہمیشہ زندہ رکھیں۔

ڈرائیور نے ایکسلیٹر پر پاؤں رکھا تو محبت کی پارتی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ مجھے الوداع کہہ رہی تھی ——— اگلے جنم تک کے لئے! اسے اب بھی وشواش تھا کہ ہم اگلے جنم میں ضرور ملیں گے۔ میری آنکھیں یوں چھلکیں جیسے ساون کی برکھا اچانک برسا کرتی ہے۔ آنسوؤں کے یہ تیز دھارے جانے کتنی آہن پوش چٹانوں کا سینہ چیر کر باہر آئے تھے۔ یہ میری بزدلی نہیں تھی' مجھ میں برداشت کا بڑا حوصلہ تھا۔ بے حوصلہ ہوتا تو وہیں مر جاتا ——— میں ان آنسوؤں کے لئے خود سے کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ یہ تو نذرانہ عقیدت تھا جو میری آنکھیں اس شہید وفا کے حضور پیش کر رہی تھیں۔ یہ آنسو تو محبت کی معراج تھے۔ سات سمندر ان کے آگے ہیچ ہیں!!

جب تک بس نے اگلا موڑ نہ کاٹ لیا' میں گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ میں بھی رونا چاہتا تھا ——— بچوں کی طرح بلک بلک کر دھاڑیں مار مار کر اپنی محبت کا مرثیہ لالا پنا چاہتا تھا لیکن میں کس کے گلے لگتا ——— ! کون مجھے مخلص تسلیاں دیتے۔ میں کتنا اکیلا تھا' کتنا تنہا تھا میں!

"اپنا دیس یاد آ گیا ہو گا میاں جی!" میرا ساتھی جو میرے ساتھ ہی ہتھکڑی سے لیس تھا' میری طرف ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ "برے کام کئے تو یہ دن دیکھنا پڑا۔ اب روتے کیوں ہو' حوصلہ کرو' کوئی بات نہیں ہمارے بھی اس طرف گرفتار ہیں۔ سب کو آخر اپنے گھروں کو لوٹنا ہے۔" ہماری

گارد کے ایک گیانی قسم کے سپاہی نے مجھے کہا۔

میں خاموشی سے سر جھکائے وہاں موجود دوسرے حوالاتیوں کے ریمارکس سنتا رہا۔ کوئی مجھ پر ترس کھا رہا تھا' کسی کو مجھ پر غصہ آ رہا تھا' کوئی مجھے تسلیاں دے رہا تھا اور کوئی جنگ کو گالیاں!

جیل واپس پہنچنے تک میں پونم کی بکھری یادیں سمیٹتا رہا۔

فرار کے امکانات کو میں نے ہمیشہ مدنظر رکھا تھا لیکن یہاں موجود اپنے ہم وطنوں سے اس کی توقع فضول تھی۔ اذیتیں برداشت کرتے کرتے یہ لوگ بے بسی کا شکار ہو چکے تھے اور انہوں نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے جب کہ ان کے خیالات جاننے کے لئے میں نے ایک دو مرتبہ بالواسطہ گفتگو چھیڑی تو مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر میرے ذہن نے ایک دوسری لائن پر کام کرنا شروع کیا۔ یہاں ایک قتل کا ملزم دلیپ سنگھ بھی ہمارے ساتھ ہی بند تھا اور میرے ساتھ اس کی خاصی دوستی بھی تھی۔ وہ پنجاب کے ایک سرحدی دیہات کا رہنے والا تھا اور سمگلنگ کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔

میں نے یہاں اپنا تعلق سمگلروں کے جس گروپ سے ظاہر کیا تھا وہ اتنا بااثر گروپ تھا کہ شاید ہی سرحدی دیہات کا کوئی شخص اس سے ناواقف ہو۔ دلیپ سنگھ کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا رابطہ بھی اس گروپ سے قائم ہو جائے۔ میں نے اس کی اس نیک خواہش پر کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

دلیپ سنگھ کو چند روز قبل ہی ۲۰ سال قید کی سزا ہوئی تھی اور چند دنوں ہی میں اس کا چالان دوسری جیل میں جانے والا تھا۔ میں نے دو دن میں ہی اس کا ایمان خراب کر دیا۔ ہمارا منصوبہ کچھ اس طرح طے پایا کہ میں کل ہی عدالت میں سرحد پار کرنے کا اقبال جرم کر کے سزا پالوں گا اور سزا پاتے ہی پاکستانیوں کو ایک خاص جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ دلیپ سنگھ بھی اپنا چالان اسی جیل میں ڈلوائے گا۔ ہم دونوں کو اکٹھے ہی گارد لے کر جائے گی۔ راستے میں اس کے ساتھیوں کی مدد سے ہم فرار ہو جائیں گے۔ اکٹھے پاکستان پہنچیں گے جہاں سے اس کو ہم کسی دوسرے ملک بھجوا دیں گے اور تین چار سال بعد جب وہ کروڑ پتی بن جائے گا تو بھارت پر لعنت بھیج کر اپنے باقی گھر والوں کو بھی اسی ملک میں بلا کر آباد ہو جائے گا۔

یہ منصوبہ میں نے کچھ اس چالاکی سے اس کے ذہن میں ڈالا اور اس کے سامنے مستقبل کا ایسا سہانا نقشہ کھینچا کہ دلیپ سنگھ پاگل ہو گیا۔

"ٹھیک ہے ——— جوانا!" اس نے بالآخر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"دیکھنا کہیں موقعے پر پیٹھ نہ دکھا جانا۔" میں نے اسے غیرت دلائی۔

"میں سکھ کا بچہ ہوں میاں' کسی لالے کی اولاد نہیں۔" دلیپ سنگھ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔

اگلے روز میری تاریخ تھی' میں نے اقبال جرم کر لیا اور عدالت نے مجھے ڈیڑھ سال قید کی سزا سنائی۔ دلیپ سنگھ نے اپنی ملاقات پر اپنے ساتھیوں کو اعتماد میں لے کر مدد پر آمادہ کر لیا اور قریباً" تین چار روز کے بعد ہمارا چالان نابھہ جیل کے لئے ڈال دیا گیا۔ اس اثناء میں دلیپ سنگھ نے جیل کے ڈاکٹر سے ساز باز کر کے اس کی مٹھی گرم کی اور انسانی ہمدردی کا واسطہ دے کر اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ میرے لئے یہ سفارش کر دے کہ میں "جلی بیماری" کی وجہ سے (جس کا شکار میں سزا کے فوراً" بعد ہو گیا تھا) لوہے کی سلاخوں والی ہیڑی کے ساتھ سفر نہیں کر سکوں گا۔ مجھے سنگل والی ہیڑی پہنا دی جائے۔ ہم نے اس بات کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ میرے ہیڑی بدل جائے گی۔ ڈاکٹر کو صرف یہی علم تھا کہ دلیپ سنگھ نے یہ کام میری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کیا ہے کیونکہ جلد یا بدیر ہم دونوں رہا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم مل کر سمگلنگ کیا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے جب اس نے کسی کی بگڑی بنانی ہو تو غیب سے اس کے لئے ایسا سامان پیدا کر دیتا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس روز صرف ہم دو قیدیوں کا چالان جا رہا تھا اور ہمیں لے جانے والے تھے ایک بوڑھا حوالدار اور دو سپاہی۔ جیل سے باہر نکلتے ہی وہ ہمارے "یار" بن گئے۔ ایک تو وہیں سے غائب ہو گیا کیونکہ اس نے اس کام کے لئے پہلے ہی سے اپنا ٹی۔ اے۔ ڈی۔ اے اپنے ساتھیوں کو دے دیا تھا۔ اب ایک حوالدار اور ایک سپاہی ہمارے ساتھ رہ گئے۔

○○○

میں نے جیل میں داڑھی اور مونچھیں اس قدر بڑھا لی تھیں کہ پگڑی باندھنے پر کوئی بھی مجھے شناخت نہ کر پاتا' چونکہ سفر کے آغاز ہی میں پچاس روپے ان کو چائے پانی کے لئے دلیپ سنگھ نے دے دیئے تھے اس لئے وہ ہم پر مٹے جا رہے تھے اور خاصے مہربان نظر آتے تھے۔ میں نے دانستہ پرکاش کو اس تبادلے سے بے خبر رکھا تھا۔ البتہ اس کی طرف سے دلیپ سنگھ کو ملنے والے پیسے جو اب قریباً" چار سو روپے ہو چکے تھے میرے پاس محفوظ تھے۔ ہم دونوں نے دھاریوال کی نئی بڑی بڑی چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور میں نے بھی دلیپ سنگھ کی طرح سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی' جب تک خود میں کسی سے تعارف نہ کرواتا مجھے بھی بھارتی قیدی ہی سمجھا جاتا۔

سکھوں کی روایتی کمزوری شراب کی بوتل کی شکل میں پولیس والوں کے پاس دلیپ سنگھ کے رشتہ داروں نے پہنچا دی تھی جو ہمیں جیل کے باہر ملنے آئے تھے۔ گورداسپور سے ہم ایک ٹرین کے ذریعے امرتسر پہنچے' جہاں سے رات کو ہم ایک پسنجر میں سوار ہو گئے۔ جس کے ڈبوں میں سواریاں نہ ہونے کے برابر تھیں' کھڑکی کے نزدیک ہی ہم نے دو برتھوں پر قبضہ کر لیا۔ سٹیشن سے دلیپ سنگھ نے مچھلی خریدی تھی اور ٹرین چلتے ہی دونوں پولیس والے اور دلیپ بوتل پر ٹوٹ پڑے۔ دلیپ سنگھ نے خود بمشکل ایک یا دو پیگ پئے تھے۔ مجھے انہوں نے رسماً" دعوت دی لیکن میرے صرف ایک بار "نہ" کہنے کو ہی کافی سمجھ کر چپکے ہو رہے۔

لدھیانہ کے قریب ٹرین پہنچی تو حوالدار سونے کے لئے اوپر برتھ پر چلا گیا۔ ہم دونوں ایک ہی ہتھکڑی میں بندھے ہوئے تھے۔ دوسرے سپاہی کو بھی بار بار لونگ آنے لگی تھی۔ کچھ شراب کا نشہ اور کچھ شدید سردی' نیند سے لڑنے کی کوشش میں اس کی آنکھیں کبھی بند ہوتیں اور کبھی کھلتیں تھیں۔ جیسے ہی ہم لدھیانے سے چلے' میں نے دلیپ سنگھ کو تیار کیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رضامندی ظاہر کر دی۔

سپاہی نے ہماری ہتھکڑی کا کڑا اپنی پیٹی سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ "مہاراج جی ذرا پیشاب کریں گے!" دلیپ سنگھ نے لونگتے ہوئے سپاہی سے کہا۔

اس نے لال لال آنکھوں سے ہماری سمت دیکھا اور شراب کے نشے میں لڑکھڑاتی زبان سے اجازت دے دی۔ ہماری برتھ کی پشت ڈبے میں بنی لیٹرین سے ملی ہوئی تھی۔ خود بخود گدھا دیں بیٹھا رہا۔ ہم دونوں ہتھکڑی سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ یہاں گاڑی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ اٹھنے سے پہلے میں ہتھکڑی سے اپنا ہاتھ نکالنا نہیں بھولا تھا۔ لیٹرین کی طرف جاتے ہوئے ہم نے مڑ کر ایک مرتبہ پھر لونگتے ہوئے سپاہی اور خیند میں خراٹے لیتے ہوئے حوالدار پر نظر ڈالی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

لیٹرین کے نزدیک میں نے ہاتھ ہتھکڑی سے باہر نکال لیا۔ دلیپ سنگھ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہش کے گرو جی!" اس نے مجھے بے اختیار دلو دی۔

ہم نے دروازہ کھولا اور پائدان پر پاؤں رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے اندھیرے میں چھلانگیں لگا دیں۔ ٹرین کی رفتار کم تھی اور خیریت گزری' مجھے تو کوئی چوٹ نہ آئی' میں نے پہلے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے بعد دلیپ سنگھ کود۔ جب تک ٹرین گزر نہیں گئی میں زمین سے چپکا لیٹا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں بجلی کی سی پھرتی سے اٹھا۔ نجانے میرے جسم میں اتنی طاقت کہاں

سے عود کر آئی تھی۔ ریلوے لائن کے قریب دو پتھر میں نے اٹھائے اور ایک دوسرے کے اوپر بیڑی کے کڑے بار بار رکھ کر ضربیں لگائیں۔ "ریٹ" ٹوٹی اور میں آزاد ہو گیا۔ اس عمل میں بمشکل ایک منٹ صرف ہوا تھا۔ میری نظریں ابھی تک دور جاتی گاڑی کی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی دلیپ سنگھ ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔

جب بھاگ کر اس کے نزدیک گیا تو میرا دل ڈوب گیا۔ میرے محسن سے اندازے کی غلطی ہو گئی تھی اور وہ بجائے دور گرنے کے پتھروں کے اوپر ڈھیر ہو گیا تھا۔۔۔۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور وہ بے ہوش پڑا تھا۔ "دلیپ سیماں' دلیپ سیماں۔"

میں نے اسے قریباً" جھنجھوڑ ڈالا لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔ میری نظریں ابھی تک گاڑی کی بتیوں پر جمی تھیں۔ جھک کر اس کی دھڑکنیں سنیں' وہ زندہ تھا لیکن چوٹ خاصی زیادہ لگی تھی اور ابھی میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کیا کروں' کیا نہ کروں کہ مجھے گاڑی کی روشنیاں ٹھہرتی نظر آئیں۔

شاید ہمارے فرار کی اطلاع ہو گئی تھی اور پولیس والوں نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لی تھی۔ اب سوائے بھاگنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے الوداعی نظر اپنے محسن پر ڈالی' اسے بڑے دکھی دل سے خدا حافظ کہا اور دیوانہ وار ایک سمت میں بھاگنے لگا۔

۔۔۔ بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگتا تو رک کر سانس لے لیا۔ مسلسل مشقت سے نجانے کون سے زخم ہرے ہو گئے تھے کہ وجود پھر دکھتا ہوا پھوڑا بن گیا۔ ٹانگ کی تکلیف دوبارہ عود کر آئی لیکن ان جانوں کی پرواہ کسے تھی۔۔۔۔ آزادی کے خوبصورت تصور کے سامنے یہ سختیاں' یہ دکھ سب ہیچ تھیں۔

مجھ پر بھاگنے کا جنون سوار تھا۔۔۔۔

صبح تک میں بھاگتا اور چلتا رہا۔ اس دوران گرفتاری کا خوف برابر مجھ پر مسلط رہا۔ مجھے علم تھا کہ پولیس بوکھلائے ہوئے کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہو گی لیکن میں نے بھی اب دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی زندہ ان وحشیوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔

صبح کے قریب جس جگہ میں پہنچا' یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں میں پہلے بھی آ چکا ہوں۔۔۔۔ میں نے راتوں رات بیس میل سے زیادہ سفر طے کر لیا تھا اور قریباً" شام ڈھلے میں دنیا نگر پہنچ چکا تھا۔

○○○

دنیا نگر کا لاری اڈہ معمولی سا ہے۔ پنجاب سے کشمیر کو آنے جانے والی بسیں یہاں چند منٹ

کے لئے صرف سواریاں اتارنے ٹھہرتی ہیں۔۔۔۔

ویسے تو پنجاب' راجستھان اور کشمیر کے تمام سٹیشن' ہوٹل' لاری اڈے' بس سٹینڈز' آشرم اور سرائیں انڈین سیکورٹی سے بھری رہتی تھیں لیکن خاص طور سے جموں سے گورداسپور' ڈیرہ

○○○

بابا نانک اور سرحد کے ساتھ ساتھ امرتسر کے علاقے پر ان کی خاص نظر تھی۔

بسوں کی آمدورفت جاری تھی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا بازار کے آخری سرے پر پہنچ گیا' جہاں سے بسیں مڑ کر بڑی سڑک پر پہنچتی ہیں اور اب وہیں ایک طرف درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا تاکہ پنجاب کی طرف جانے والی کسی بھی لاری میں سوار ہو سکوں۔

ایک بس مدھم روشنی کے ساتھ نمودار ہوئی اور میں خدا کو یاد کر کے اس میں سوار ہو گیا۔ اندر بیٹھ کر سب سے پہلے میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ خدا کا شکر کہ تمام کپڑے صحیح سلامت تھے ورنہ یہاں پھر کوئی چنا آن کھڑی ہوتی۔ یہ بس امرتسر کو جا رہی تھی۔ امرتسر بارڈر سے میں صرف نقشے کی حد تک واقف تھا۔ خود پار کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ چپ چاپ امرتسر کا ٹکٹ خرید لوں۔ اگرچہ راستے میں اور شہر بھی آتے تھے جہاں چیکنگ کا خطرہ تھا لیکن میں نے اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کا سفر تھا' میں سارے راستے اونگھنے کی ایکٹنگ کرتا گیا۔ لاری بھی پنجاب روڈ ویز کی ایکسپریس ٹائپ کوئی چیز تھی۔ کیا مجال جو کسی شہر میں پانچ منٹ سے زیادہ ٹھہری ہو۔ سارے راستے غالباً" وہ تین یا چار جگہ رکی ہو گی' جہاں لاری رکتی میں اونگھتا اونگھتا اگلی سیٹ پر بازو جما کر اس پر اپنا سر رکھ کر سو جانے کی ایکٹنگ شروع کر دیتا۔ اس اثناء میں اپنے ساتھ والی سواری کی چھٹی کروانے کے لئے میں اس سے پانچ چھ مرتبہ ٹکرا بھی چکا تھا۔ وہ بھی بڑی ڈھیٹ ہڈی کا معلوم ہوتا تھا' وہیں جما بیٹھا رہا۔

رات گئے ہم لوگ امرتسر پہنچ گئے۔

میں جلد از جلد شہر کی حدود سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

۔۔۔۔ وہ رات میں نے امرتسر کے ایک نواحی کھیت میں چھپے چھپے کاٹ دی۔ اس سے پہلے میں دو راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے بار بار جسم کو حرکت دینی پڑتی تھی۔ نیند بار بار مجھ پر حملہ کرتی رہی لیکن مجھے علم تھا "اگر آج سو گیا تو شاید پھر کبھی جاگ نہ سکوں گا۔"

اب مجھے فوراً" فیصلہ کرنا تھا کہ بارڈر کس جگہ سے پار کیا جائے؟ امرتسر' ڈیرہ بابا نانک' کلانور یہ تین نام میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ بالآخر ذہن نے فیصلہ ڈیرہ بابا نانک کے حق میں دیا۔

دوپہر ہونے پر ایک قریبی دشتوڑھابے پر دو تین چھلکے زہرمار کئے اور چائے کا ایک کپ اسپرین کے ساتھ پی کر میں چار بجے کے قریب ڈیرہ بابا نانک جانے والی لاری پر سوار ہو گیا۔ اس علاقے سے میں کچھ کچھ واقف تھا۔

قریباً پانچ بجے میں شاہ پور کے نزدیک اتر گیا اور ایک گاؤں کی طرف چل دیا جہاں سے مجھے بارڈر پار کرنا تھا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ آرمی نے مورچے کھود رکھے تھے۔ کھیتوں میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور فصلیں جو کٹائی کی منتظر تھیں' تباہ ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ اور بھی اردگرد کے دیہاتوں کے لوگ آ رہے تھے اور ہم سب کو فوجیوں کی مسلسل گھورتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔۔۔۔ راستے میں پڑنے والے دیہاتوں میں اکا دکا آدمی ہی دکھائی دیتا۔

میرے پیچھے پیچھے آنے والے دیہاتی اب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے تھے اور۔۔۔۔ اب مجھے اکیلے کو گھورتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"فھسو!" ایک مورچے کے قریب سے گزرتے ہوئے آواز سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر رک گیا۔

"کدھر جانا ہے؟" ایک لمبے تڑنگے سکھ صوبے دار نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"پکھیوں مہاراج!" میں نے قریبی گاؤں کا نام لے دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"امرجیت' مہاراج جی!"

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"مہاراج جی! گمٹالے سے۔"

"کس سے ملنا ہے؟"

"سرپنچ سے مہاراج!"

"کیا نام ہے سرپنچ کا؟"

"پرم جیت سنگھ مہاراج۔"

اردگرد کے دس گاؤں کے سرپنچوں کے نام تو مجھے حفظ تھے۔

"ٹھیک ہے جلدی جلدی نکل جاؤ یہاں سے۔" اس نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور میں اس کو ست سری اکال کہہ کر اپنی منزل کی طرف چل دیا جہاں ابھی اور مصیبتیں میری منتظر تھیں۔

"پکھیوں" سے میں "روئے" پہنچ گیا جہاں سے میں پگڈنڈی کے ساتھ واقع بھارتی پکٹ کے ساتھ ساتھ سرحد عبور کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ سامنے دائیں طرف دریا کے ساتھ پاکستانی پکٹ اور بائیں طرف صرف "بیلے" کا علاقہ تھا۔ یہاں سے بارڈر کم از کم میل بھر کی مسافت پر واقع تھا اور ایریا بھی ایسا جس کے چپے چپے پر انڈین آرمی یا تو خود ڈیلائے تھی یا اس نے زمین دوز سرنگیں (مائنز) دبا رکھی تھیں۔

اس جگہ سے بارڈر پار کرنا کتنا خطرناک تھا؟ اس کا مجھے بخوبی علم تھا لیکن اپنے ملک پہنچنے کی تمنا اور اپنے بقا کی جنگ جو میں لڑ رہا تھا اس کے سامنے اس خطرے کی ذرہ بھر بھی اہمیت نہ تھی۔ میں کملو کے ایک کھیت میں چھپا اندھیرا پھیلنے کا منتظر تھا تاکہ قسمت آزمائی کر سکوں۔

۔۔۔۔اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ کھیت کے باہر سرکنڈوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ تھا اور اس کے آگے کھدے ہوئے فوجیوں کے مورچے جن کے درمیان سے گزر کر مجھے بھارتی پکٹ کے قریب پہنچنا تھا تاکہ میں وہاں سے سرکنڈوں کی آڑ میں چلتا ہوا خشکی کے راستے پاکستان میں داخل ہو سکوں۔۔۔۔ یہاں ہماری پوسٹیں تھیں کیونکہ دریا کے آگے تقریباً پانچ چھ میل کا ایریا پاکستانی علاقے ہی میں ہے اور اس کے بعد بارڈر لائن شروع ہوتی ہے۔

ابھی میں نے کملو کے کھیتوں سے سر باہر نکالا ہی تھا کہ میرے قریب ہی قریباً پچیس یا تیس فٹ دور زوردار دھماکا ہوا۔ غالباً کوئی بارودی سرنگ پھٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں کی تڑتڑ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بھارتی فوجیوں کے پاس نجانے اتنا اسلحہ کہاں سے آ گیا تھا کہ وہ بغیر دیکھے بھالے خواہ مخواہ فائرنگ شروع کر دیتے۔ میرے قریب سے روشنی راؤنڈ فائر ہوا اور پھر وہ رک گئے' میں وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔

۔۔۔۔روشنی میں "ہوم گارڈز" کے جوان خاکی وردیاں پہنے ہاتھوں میں رائفلیں تھامے ادھر سے ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ خدا نے ایک اور کرم کیا کہ مجھے اپنے قریب والے مورچے کا بھی علم ہو گیا' ورنہ ابھی تک میں اس سے بے خبر تھا۔ غالباً کسی "ہوم گارڈ" کا پاؤں غلطی سے بارودی سرنگ پر آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ پھٹ گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ان کی بھاگ دوڑ ختم ہو گئی اور ماحول پر ایک مرتبہ پھر پہلے جیسا سناٹا طاری ہو گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے بوڑھا اور سرد آسمان اپنے دامن میں ہزاروں ستاروں کے ساتھ ٹھٹھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سامنے شکرگڑھ پر بھی یہی آسمان ننھے منے جگنوؤں کے ساتھ سایہ فگن ہے اور وہاں سے کچھ دور اک شہر بے مثال میں میرے ماں باپ' بہن بھائی آرام سے رضائیاں اور لحاف اوڑھے اطمینان کی نیند سو رہے ہیں۔۔۔۔ اس بات سے قطعی بے

خبر کہ ان سے کچھ فاصلے پر میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہوں۔

----میں نے چادر کو لنگوٹی کی طرح باندھ رکھا تھا۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور میں پنڈلیوں تک شبنم سے بھرا ہوا تھا لیکن مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے اور مجھے اپنے وجود میں خون کی جگہ انگارے دوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ رات اپنے سینے میں ہزاروں وحشتیں سمیٹے رینگ رینگ کر سورج دیوتا کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اپنے اوسان بحال کرنے کے لئے دل ہی دل میں ایک مرتبہ پھر میں نے آیت الکرسی پڑھی اور بڑی احتیاط سے چلتا ہوا کھیتوں سے باہر نکل آیا۔ اب ایک خالی قطعہ زمین جو غالباً" پندرہ بیس گز لمبا تھا' مجھے رینگ کر طے کرنا تھا۔ اس کے بعد سرکنڈوں کا وہ سلسلہ تھا جس سے گزر کر مجھے آگے پیٹ کی طرف بڑھنا تھا۔ تمام ایریا آرمی نے مکمل کیموفلاج کر رکھا تھا---- کسی بھی وقت' کسی بھی لمحے میرا پاؤں یا جسم کا کوئی اور حصہ کسی بھی بارودی سرنگ کو چھو سکتا تھا۔ پھر ایک دھماکہ اور جسم کے پرخچے اڑ جاتے۔

----میں رینگتے ہوا سرکنڈوں کی طرف جا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیامت ڈھا دینے والا تھا اور اب میں اس مقام پر آگیا تھا' جہاں سے واپس لوٹنا بھی موت تھا اور اس سے آگے بڑھنا بھی موت۔ میرے چاروں طرف موت اپنی تمام تر دہشتوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی لیکن میں زندگی کے لئے اس سے چوکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے انشاء اللہ اپنے مقدس وطن کی زمین پر پہنچ جاؤں گا یا پھر مرجاؤں گا۔ کیونکہ زندہ ان بھیڑیوں کے ہاتھ آنا سسک سسک کر مرنے والی بات ہوتی۔

دل کی تیز تیز دھڑکنوں کے ساتھ اب میں مورچوں کے عین نیچے پہنچ چکا تھا۔ نیم دائرے میں بنے ہوئے یہ مورچے مجھ سے دس بارہ فٹ کی اونچائی پر واقع تھے جن کے نیچے سرکنڈوں کی ایک قطار سی پھیلتی چلی گئی تھی۔ میں اب مورچوں سے گزر کر بیلے میں داخل ہو گیا جہاں مجھے امید تھی کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔

اچانک میرے پیچھے دھماکہ ہوا اور سارا ماحول ننگا ہو گیا---- قریب ہی چھپے ہوئے کسی فوجی نے جو وہاں پوزیشن لئے بیٹھا تھا' مجھے دیکھ لیا تھا اور اس نے روشنی راؤنڈ فائر کر دیا تھا۔

"ہالٹ!" کسی کی زوردار آواز گونجی اور میں نے بڑی پھرتی سے سامنے بنی بڑی لمبی جنگلی گھاس (بیلے) میں چھلانگ لگا دی۔ پھر میں کمر کے بل جھک کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ گولیوں کی سرخ لکیریں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میرے کانوں کے دونوں اطراف شائیں شائیں کی

آوازیں گونج رہی تھیں لیکن میں جنونیوں کی طرح اسی پوزیشن میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ میری پنڈلیوں سے خون رسنا شروع ہو گیا اور دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے سینہ پھاڑ کر باہر آن گرے گا۔ سردی گرمی کا احساس مر چکا تھا۔ بس ذہن میں ایک ہی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ "دوڑو' دوڑو---- تیز اور تیز۔"

----ان تمام باتوں کے باوجود میرا ذہن مکمل طور پر بیدار تھا۔ مجھے علم تھا اگر مجھ سے ذرا بھی سمت کا غلط اندازہ ہو گیا تو وہ مجھے گھیر کر مار ڈالیں گے۔ اب میں برچھیوں پر پہنچ چکا تھا جو ہارڈر کی حد ہوتی ہے---- چھلانگ لگائی اور پاکستانی دھرتی میں سما گیا۔

میرے پیچھے فائرنگ ابھی تک جاری تھی۔

اچانک "ہالٹ" کی آواز گونجی اور میں رک گیا جیسے یہ سب کچھ بجلی کا کوئی عمل ہو۔

"ہینڈز اپ۔" دوبارہ للکار گونجی۔ میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ میرے سامنے میرے رینجرز کھڑے تھے۔

میری سرحدوں کے نگہبان----!

انہوں نے یوں تو میرے اطوار سے ہی مجھے جان لیا تھا بہرحال وہ میرے اپنے تھے لیکن ضابطے کی کارروائی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

"کون ہے؟" ایک جوان نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

جواب میں میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور یہی میری پہچان تھی۔ ان کے رائفل بردار ہاتھ نیچے دبک گئے۔

سازِ شکستہ کی آواز

ہم لوگ پوسٹ پر چلے آئے۔ ان سب کی نظروں میں ایک ہی سوال کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ میری جسمانی حالت نے انہیں اس بات کا یقین تو دلا دیا تھا کہ میں نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے تھے۔ اپنی جگہ ہر کوئی سچا بھی تھا۔۔۔۔ اور جھوٹا بھی۔ جس طرح میرے ذہن میں سوالات کا لاوا کھول رہا تھا اسی طرح ان کی نظریں بھی میری طرف اسی امید میں اٹھی تھیں کہ شاید میں انہیں بتا سکوں۔

"جب ہم سب نے اپنے تئیں کوئی کوتاہی نہیں کی تو آخر ہم لٹ کیسے گئے۔ ہمیں درمیان سے توڑ کر کس نے مفلوج کر دیا۔۔۔۔؟ کس کی نظر ہماری محبتوں کو کھا گئی۔۔۔۔؟" لیکن میں انہیں کیا بتاتا۔ میرے پاس کہنے کو تھا ہی کیا۔ میں تو خود ان سے سننا چاہتا تھا' جاننا چاہتا تھا کہ ہماری ریاضتوں کا ثمر کیا یہی تھا؟ کیا اسی روز بد کو دیکھنے کے لئے ہم نے اپنے آپ کو تیاگا تھا؟

ہم سب کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خاموشی سے' بے بسی سے۔۔۔۔ مجرموں کی طرح جیسے ہمیں نے گھات لگا کر اپنا شکار کھیلا ہو۔

ایک جوان جلدی سے میرے لئے چائے بنا کر لے آیا۔ کسی نے سگریٹ کی ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔ نجانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اپنے وطن کے کڑوے کسیلے دھوئیں کا بھی اپنا ایک سرور ہوتا ہے۔ میں سگریٹ نوش نہیں تھا لیکن اس روز میں نے ایک عجیب سا کیف محسوس کیا۔

دھوئیں کے مرغولے بن بن کر ٹوٹے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بنے۔ میری نظروں کے سامنے پھیلتی دھوئیں کی لکیریں مجھے اپنے سنگ لئے میرے گھر کے آنگن میں جا پہنچیں جہاں میری ماں تھی' باپ تھا' بہن بھائی تھے اور بہت سے محبت کرنے والے۔۔۔۔ وہ سب آنکھوں میں امید کی جوت جگائے ہونٹوں پر لرزتی دعائیں لئے جانے کب سے میری "آبرومندانہ واپسی" کے منتظر تھے لیکن میں ان کا سامنا کر بھی پاؤں گا؟ کیا بتاؤں گا میں انہیں؟ میرے پاس سنانے کو تھا ہی کیا۔ بس پونم کی کہانی لیکن اس کے سننے کا وقت کس کے پاس ہو گا اور سنانے کا یارا کہ میں ہو گا۔

پھر منظر بدلا اور پونم آہنی چٹان بن کر میرے سامنے تن گئی: "دغا باز ـــــ تم میں ہمت ہے تو میری یادوں سے فرار پا کر دکھاؤ۔ مجھے زندگی کے نرک میں جھونکا ہے تو کیا ضمیر کے جہنم سے بچ نکلو گے ـــــ نہیں ہرگز نہیں۔" اس کی پرچھائیاں نجانے مجھ سے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں سر نہوڑے اس کی یادوں کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا رہا۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا اگر میرے گالوں سے پھسلتے آنسو قمیص کے دامن پر نہ آگرتے۔

"حوصلہ کر شیرا' کشٹ تو کٹ گیا۔ یہ تو شیرا اپنا ملک ہے۔ بچہ خوشیاں منا۔ تو نے نیا جنم پایا ہے' نیا جنم!" ایک بوڑھے حوالدار نے جس کی چڑھی مونچھیں اس کے جوان ارادوں کی غماز تھیں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے حوصلہ دیا۔

"چاچا یہ خوشی کے آنسو ہیں۔" میں اسے چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکا کہ یہ بچھتاوا تو مجھے عمر بھر رلائے گا۔

ooo

گھر والوں کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ دروازے پر میرا بوڑھا باپ چہرے پر جھریوں کا جال سجائے میرا منتظر تھا۔ باپ سے گلے مل کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک لمحے کو سارے دکھ اس کی آغوش میں کھو گئے ہوں۔ گھر کی دہلیز سے لگی برگد کی ٹھنڈی چھایا میں میری ماں ایک کونے میں محلے کی دوسری عورتوں کے درمیان فخر سے سر بلند کئے بیٹھی تھی۔

ماں سے لپٹ کر میں نوزائیدہ بچوں کی طرح بلک اٹھا۔ میری ساری توانائیاں کھو گئیں۔ ضبط کے بندھن کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے۔

"بیٹا! رونا کس بات کا۔ تو نے ہمارا مان بڑھایا ہے۔ تو نے میری دھاروں کی شرم رکھی ہے بیٹا! تو میرا نور بن کر لوٹا ہے۔" میں ماں کے فراخ سینے سے لپٹا روتا رہا۔ وہ میری پیٹھ پر دست شفقت رکھے مجھے تشفیاں دیتی رہی۔

وہاں باری باری سب نے مجھے گلے لگایا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کسی نے میری ماں کی طرح آنسوؤں کا گلہ گھونٹ دیا تھا۔ کسی کی سسکیاں میری طرح اندر ہی اندر دم توڑ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا' شاید میرے دکھ کو سمجھ رہے تھے۔ میرے اپنے تھے نا!

پھر سب کو میرے جسم کی فکر دامن گیر ہوئی۔ دیسی نسخوں اور ولایتی دوائیوں کے انبار لگ گئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ڈاکٹر' ایک سے ایک بڑھ کر حکیم میرا علاج کرنے لگے۔ میرے اندر کا کرب باہر کے روگ سے کہیں زیادہ تھا لیکن وہ لینز جو میرے اندرونی درد کا ایکسرے دکھا سکے کسی کی آنکھوں میں کہاں؟ ایک ماں تھی جس کے دودھ نے میرے روگ کو کسی حد تک جانا۔

"بیٹا تو جب یہاں نہیں تھا تو ہم تیری یادوں کے سہارے جیتے تھے۔ جب کبھی تیری یاد تڑپاتی تو ان ہزاروں ماؤں کے لال یاد آجاتے جو تیری طرح وہاں اسیر تھے اور دل سے دعا نکلتی: مولا! سب کی ماؤں کے کلیجے ٹھنڈے کر دے۔ اب تو آگیا ہے تو اپنا جسم لے کر۔ بیٹا! اپنی روح کو واپس بلا لے ورنہ وہ سارے لوگ جو ہم نے اندر ہی اندر مار لئے تھے کسی روز زندہ پیر کی طرح بیدار ہو جائیں گے تب پھر شاید ـــــ" میں نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور زندہ لوگوں کی طرح جینے کا عہد کر کے اس کے سامنے سے اٹھ آیا۔

اپنے لوگ اپنی دھرتی اپنی فضائیں جب اپنے اندر رچیں تو جانے کیوں کسی نے چپکے سے میرے کانوں میں کہا تم تو بھارت سے ناکام واپس آئے ہو لیکن جو بھارتی ایجنٹ یہاں کام کر رہے تھے وہ ضرور سرخرو ہو گئے ہیں۔ دیکھ لو! ہم نے خود کو ہندو کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ ہماری سوچوں پر ان کا میٹھا زہر (جو ٹی وی اور وی سی آر کی شکل میں وہ آہستہ آہستہ پھیلا رہے ہیں) غالب آتا جا رہا ہے۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا ہے کہ ہم پنجابی' پٹھان' بلوچی اور سندھی ہیں۔ ہمیں لیڈر بتانے لگے ہیں کہ کس نے کس کا حق کھایا؟ لیکن ہم نے کسی لیڈر سے یہ نہیں پوچھا کہ کس نے کس کا حق نمک ادا کیا؟

تب دل سے ایک ہی دعا نکلتی:

"الٰہی! اس خطے کو اپنی امان میں رکھنا۔ کہیں تاریخ خود کو نہ دہرا دے کہ ہم نے اس سے ابھی تک کوئی سبق نہیں سیکھا۔"

ooo

رائے کوٹ' پونم' پرکاش' ماتا' موہی' سدرشنا' باوجی' سالگ رام اور وہ سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب میں ہوں' انکی جلتی بجھتی یادیں اس دنیا میں جو ناممکن ہو وہ ممکن ہو جاتا ہے اور جو بالکل ممکن ہو وہ کبھی نہیں ہو پاتا۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ المیہ یہ ہے کہ دنیا اتنی خوبصورت نہیں جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ سوچتے سے چاہنے سے اور بسا اوقات کوشش کرنے سے بھی وہ کچھ نہیں مل پاتا جس کی ہم تمنا کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قدرت کی گھڑیاں قرنوں پر محیط ہیں اور ہم فوری ڈلیوری کے متمنی۔ دعائیں بے اثر تو کبھی نہیں ہوتیں البتہ صبر کی سپر کے بغیر کوئی کیس اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش نہیں ہوتا اور اتنے لمبے انتظار کی تاب ہم میں نہیں۔ ہم تو ہر ایکشن کا فوری ری ایکشن چاہتے ہیں جب کہ کائنات قدرت یہ نہیں' یہاں تو لینے کے لئے بھی صابر بننا پڑتا ہے۔ پونم کو کھو کر میں مرا تو نہیں لیکن ـــــ من کا برہما یونی تو شانت نہیں ہو جاتا۔ پونم کی محبت آکاس بیل کی طرح میری زندگی کے

درخت سے چمٹی ہوئی ہے۔ میں خود کو تج کر اس کا خراج لوا کر رہا ہوں۔ یہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ اس درد لادوا کا توڑ کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کا ہرا بھرا درخت اندر ہی اندر کھوکھلا بھی ہوتا رہتا ہے اور اس کی شاخوں کی ہریالی بھی قائم رہتی ہے۔ اس روگ کا علاج جب کوئی مہارشی نہیں کر پایا تو میں کیسے کر پاؤں گا۔ محبت کا وہ زہر جو میں نے پونم کی شریانوں میں گھولا تھا' اس کی تلخی و ترشی کا ذائقہ میں بھی اسی طور سے چکھ رہا ہوں۔

ایک مرتبہ پونم نے اپنے ساتھ میرا ہاتھ بھی زبردستی جوتشی کو دکھایا تھا جس نے کہا تھا: "تمہیں آنند مل گیا' مکتی بھی مل جائے گی۔"

لیکن۔۔۔۔ مکتی دلانے والا نجات دہندہ کبھی نہ آیا۔ پونم کی محبت تو دلدلیوں میں گونجنے والی سندریوں کی بازگشت بن کر ٹکراتی اور پھر واپس لوٹ آتی ہے۔ عشق کی وہ شبنم جو کسی پتی پر بوجھ نہیں بنتی' میرے سینے پر پتھر کی بھاری سل کی طرح آن پڑی ہے۔ میں کئی مرتبہ اس کیفیت سے فرار کا ارادہ کرتا ہوں لیکن محبت کی یہ پنجالی میری گردن میں اس طرح کسی ہوئی ہے کہ اپنی گردن موڑنے کے لئے بھی مجھے کاتب تقدیر کے اشارے پر لبیک کہنا پڑتی ہے۔

خود کو جاننے کے لئے انسان کو بڑی لمبی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ بڑے چلے کاٹنے ہوتے ہیں لیکن پونم کی محبت نے مجھے بہت جلد عرفان ذات کا شعور دے دیا۔ اس کا یہ احسان بڑا دردناک ہے۔ جب میں خود سے غافل رہا' کوئی دکھ میرے قریب نہ پھٹکا اور جب اپنا گیان پا لیا تو اندر سے کٹنے لگا۔ کرب کی گھڑیاں بتانے کے لئے انسان جھوٹے ڈھکوسلے بھی تراش لیتا ہے۔ میں جانتا ہوں پونم اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق اگلے جنم تک میرا انتظار کرے گی۔ شاید اسی جھوٹی امید پر وہ اپنا یہ جنم بتا دے۔

لیکن میں۔۔۔۔ میں تو بالکل تہی دامن ہوں۔ مجھے جھوٹی امید باندھنے کے لئے کوئی منطق بھی تو نہیں ملتی۔ کوئی جھوٹا سہارا' کوئی سنہری ڈھکوسلا! زندگی کے صحرائے اعظم کی جھلستی ریت پر میں آبلہ پا بھاگتا چلا جا رہا ہوں کیونکہ اس صحرا کو مجھے بہرحال پاٹنا ہے لیکن یہ زخمی زخمی پاؤں' یہ لہو لہو امیدیں مجھے کب تک بھگائیں گی! کہاں تک میرے تن ناتواں کا ساتھ دیں گی۔۔۔۔ کیا "نجات" کا لمحہ کبھی نہیں آئے گا۔۔۔۔ لیکن نہیں!!

تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ زندگی کے دکھ اتنے گھمبیر نہیں ہوتے کہ وہ بھلائے ہی نہ جا سکیں بلکہ اس کی خوشیاں ایسی پراسرار ہوتی ہیں کہ وہ ڈھونڈنے سے ہاتھ نہ آئیں پھر جینا کوئی ایسا مختصر سا عمل بھی نہیں کہ آدمی اپنی ذات کے طلسم کا اسیر ہو کر ہی رہ جائے۔ صرف محبت ہی تو سب کچھ نہیں' زندگی کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں اور ان کڑوی کسیلی سچائیوں کو اس لئے بھی

نگلنا پڑتا ہے کہ زہر بھی کبھی کبھی کار تریاقی کرتا ہے۔

عملی زندگی کا سچ کتابوں کے سچ سے ذرا مختلف ہوتا ہے اور میں نے اس حقیقت کو بھی جان لیا ہے کہ زندگی عذاب نہیں فرض ہے۔ میں اپنے طور سے کوشش کرتا ہوں کہ احسن طریق پر اس فرض سے عہدہ برا ہوتا رہوں۔

کبھی کبھی جب پچھلی راتوں کا چاند دریاؤں کے سینے میں اترتا ہے تو دکھ کے دیپک راگ خود بخود اندر سے پھوٹتے ہیں لیکن میں جلتا نہیں' یوں کہ پونم کی محبت کی ملہار چاندنی بن کر میرے من آنگن میں اترتی ہے اور میں اس کرب میں بھی لذت کا ایک پہلو تلاش کر لیتا ہوں۔ محبت کا یہ احسان ہی کیا کم ہے کہ اس نے مجھے مر مر کے جینے کا شعور بخشا۔